خودنوشت
میں زندہ آدمی ہوں
خالد حسین

Main Zinda Admi Hoon

خودنوشت

میں زندہ آدمی ہوں

خالد حسین

ذراسا آدمی ہوں

بلا کا آدمی ہوں

نہایت کم ہوں انساں

زیادہ آدمی ہوں

خدا والے تو تم ہو

میں سیدھا آدمی ہوں

کبھی مل کر تو دیکھو

میں اچھا آدمی ہوں

مگر باہوش مِلنا

میں زندہ آدمی ہوں

پنڈت ودیا رتن عاصیؔ

خودنوشت

میں زندہ آدمی ہوں

خالد حسین

ناشر

قاسمی کتب خانہ

MAIN ZINDA AADMI HOON
Khalid Hussain

Year of Edition 2021
ISBN: 978-93-83034-70-3

کتاب کا نام : میں زندہ آدمی ہوں
مصنّف : خالد حسین
تعداد : پانچ سو
سرورق : منندر سنگھ کپور/مومن کاظمی ایڈووکیٹ
طبع ثانی : ۲۰۲۲ء
کمپوزنگ : فوزیہ کمپیوٹر سنٹر جموں، 9906063200
تزئین : انتساب طاہر، مکّہ پرنٹرز، مالیر کوٹلہ
مطبوعہ : ایچ۔ایس آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی
قیمت : -/495

ملنے کا پتہ

۱. قاسمی کتب خانہ، جموں 78899 03800
۲. چیتنا پرکاشن، پنجابی بھون لدھیانہ 9815298459
۳. یاسر عمران، ۲/۱۹، گرین ہل کالونی، بٹھنڈی، جموں
7006898585 | 9858000099

اِی میل :hussain.khalid47@gmail.com

Published by
QASMI KUTUB KHANA
E-92, Abul Fazal Enclave, Okhla New Delhi-110025
Talab Khatikan, Jama Masjid, Jammu Tawi 180001
Ph. +91-9797352280 | +91-1913593736
G-Mail:- qasmikutubkhana0729@gmail.com
Email:- info@qasmikutubkhana.store
website:- qasmikutubkhana.store

اسی قلم سے

1۔ جہلم وگدا رہیا — پنجابی افسانے
2۔ گوری فصل دے سوداگر — //
3۔ ڈونگے پانیاں دادُکھ — //
4۔ بلدی برف دا سیک — //
5۔ سُولاں دا سالن — //
6۔ عِشق ملنگی — //
7۔ ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں — اُردو افسانے
8۔ اشتہاروں والی حویلی — //
9۔ ستی سر کا سُورج — //
10۔ جنت گرہن — //
11۔ گواچی جھانجر دی چھنک — مکمل ناولٹ کا پنجابی ترجمہ
12 گھر میں ہے بیراگ — پنجابی افسانوں کا ہندی انتخاب
13۔ نوری رِشماں — غیر مسلم بچوں کیلئے حضرت محمد کی سوانح حیات
14۔ میرے رنگ دے اکھر — مضامین (پنجابی میں)
15۔ خالد حسین دا کتھا ساگر — پنجابی افسانوں سے متعلق تنقیدی مضامین (پنجابی میں)
16۔ ماٹی کدُم کریندی یار — آپ بیتی (پنجابی میں)
17۔ لفظ قلندر — پروین کمار اشک کی پنجابی شاعری کا انتخاب
18۔ دشتِ طلب — پنڈت وِدیا رتن عاصیؔ کی اُردو غزلوں کا انتخاب
19۔ زندگی کے مارے لوگ — پنڈت وِدیا رتن عاصیؔ کا اُردو کلام دیوناگری رسم الخط میں

اِنتساب

اپنے ہمزاد خالد حسین کے نام
کہ جس کی خوبیاں اور خامیاں
میرے ضمیر کے بھنور میں
ڈوبتی اور اُبھرتی رہتی ہیں

میزانِ قلم

عشق سمندر

خالد حسین اپنی ذات کے قلم کو زندگی اور زمانہ کی سچائیوں میں ڈبو کر ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی لئے افسانہ ہو یا خاکہ، مضمون ہو یا خودنوشت، اختصار یا تفصیل کے ساتھ ان کی ذات کا حوالہ لازمی طور پر آتا ہے لیکن ہر حوالے سے ان کی جھیلی اور برتی ہوئی زندگی اور زمانہ کے صد رنگ تجربات و مشاہدات، اور ان کے پیدا کردہ جذبات و کیفیات ہی لفظ لفظ سے ٹپکتے' ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زبان (الفاظ، محاورات، ضرب الامثال) کا نادر و نایاب تخلیقی برتاؤ ''خالدیات'' کا سب سے روشن چراغ ہے۔ لیکن خالص لب و لہجے میں استعمال ہونے والے اردو اور پنجابی، کے الفاظ اور محاورات، ان کی عبارتوں میں صرف اور محض لغت کے معانی کا نہیں، صورت اور اصوات کا بھی اخراج کرتے ہیں۔ خالد کی کسی بھی تحریر کی قرات کے تفاعُل کے نتیجے میں، ان کے الفاظ صرف جہان معانی کے در ہی نہیں کھولتے، واقعات کی تصویروں کو متحرک کرتے ہیں اور ان کے اندر سے کرداروں کے انفراد و امتیاز، رنج و کرب اور لُطف و انبساط کی کیفیتوں کو بھی مجسم کر دیتے ہیں۔ میر کی طرح خالد حسین کی ذات مجسم عشق ہے اور ان کی تخلیقات 'عشق کا سمندر' خالد حسین کو عالمِ غیاب میں رکھ کر حاضر راوی اعلان کرتا ہے کہ،

''پیار سمندر اس کے اندر ٹھاٹھیں مارتا تھا، وہ آپ عشق تھا،
عاشق تھا اور معشوق بھی۔ وہ قدرت کی بنائی ہوئی کائنات میں رچ

بس گیا تھا۔، وہ سچ اور حق کے مذہب کو ماننے والا تھا۔ وہ انتہا پسند مولویوں اور جنونی تِلک دھاریوں سے دُکھی تھا۔ وہ دنیاوی دولت کو بُوٹ کی نوک برابر سمجھتا تھا۔ اسی لئے شاہ خرچ تھا اس نے ساری زندگی 'گیان' کی دولت حاصل کرنے میں گزار دی۔ وہ اپنے دوستوں کو پیار کی سوغاتیں بانٹتا رہتا۔ اس نے کبھی رشتے نہیں گنوائے، بلکہ رشتوں کو پالا، سنوارا اور نبھایا''۔ص-۹۔

خالد حسین کے اب تک پنجابی کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ا۔''تے جہلم وگدا رہیا'' (۱۹۷۶ء)، ۲۔''گوری فصل دے سوداگر'' (۱۹۸۱ء)، ۳۔''ڈونگھے پانیاں دا دُکھ (۱۹۸۸ء)، ۴۔''بلدی برف دا سیک'' (۲۰۰۵ء)، ۵۔''سولاں دا سالن'' (۲۰۱۵ء)، ۶۔''عشق ملنگی'' (۲۰۱۹ء)۔ان کے علاوہ خالد حسین کی پنجابی میں اپنی سوانح عمری ''ماٹی کُدم کریندی یار'' (۲۰۱۳ء)، غیر مسلم بچوں کے لئے آں حضرت ﷺ کی بائیوگرافی ''نوری رشماں (۲۰۰۴ء)، مضامین کا مجموعہ ''میرے رنگ دے اکھر'' (۲۰۱۳ء) اور ایک ناولٹ ''گواچی جھانجر دی چیک'' (۲۰۱۰ء) وغیرہ بھی خالد حسین کے ادبی اعمال نامے میں شامل ہیں۔ان کے علاوہ اردو میں اب تک چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ا۔''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' (۱۹۸۱ء)، ۲۔''اشتہاروں والی حویلی'' (۱۹۹۱ء)، ۳۔''ستی سر کا سورج'' (۲۰۱۱ء)، اور ۴۔''جنت گرہن'' (۲۰۲۱ء) اس کے علاوہ بہت سارے افسانے ابھی رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

خالد حسین کے کئی افسانوں کا ترجمہ ہندی، بنگلہ، ملیالم، ڈوگری، کشمیری اور انگریزی میں ہو چکا ہے۔خالد حسین کی منتخب کہانیوں کا ایک مجموعہ ہندی میں ''گھر میں ہے بیراگ''

کے نام سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۴۱ کہانیوں کے مترجم دیپک آرسی ہیں۔ خشونت سنگھ، ڈاکٹر للت گپتا، آدرش اجیت، مشتاق برق اور شفیع احمد کے علاوہ کئی اور لوگوں نے خالد حسین کے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ خالد حسین کی ایک کہانی ''لکیر'' پر پہلی پوٹھوہاری فیچر فلم بنائی گئی جس نے سلور جوبلی منائی۔ افسانہ ''عشق ملنگی'' کو تھیٹر ڈائریکٹر مشتاق کاک نے ہندوستان کے ۱۲ بڑے شہروں میں اسٹیج پر پیش کیا۔ خالد حسین کی شخصیت اور فن پر ہندوستان اور پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم۔فل۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ خالد حسین کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہندو پاک کے معتبر ناقدین نے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ پنجابی میں تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''خالد حسین دا کتھا جگت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خالد حسین کی، ان کی ادبی خدمات کے لئے ہندو پاک کے کئی اداروں کی جانب سے عزت افزائی کی جا چکی ہے۔ حکومت پنجاب نے انہیں ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' (شرومنی پنجابی ساہتیہ کار پُرسکار) سے نوازا ہے، جس میں خلعتِ فاخرہ کے علاوہ پانچ لاکھ روپئے نقد بھی شامل تھے۔ خالد حسین جموں کشمیر کے پہلے ادیب ہیں جنہیں ''بھارت رتن'' کے اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ان کے ساتھ ہی انہیں اور بھی ایسے متعدد انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا جا چکا ہے جن کا شمار مشکل ہے۔ خالد حسین کی افسانہ نگاری سے متعلق ہندو پاک کے جن درجنوں معتبر ناقدین نے مضامین لکھے ہیں ان میں ڈاکٹر ستیندر سنگھ نورؔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر لِلت منگوترا، وید راہی، نور شاہ، ڈاکٹر اگنی شیکھر، قدوس جاوید، تقی عابدی اور پنجابی کے نقاد اور فکشن نگار ڈاکٹر منموہن وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ خالد حسین کی اس مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ ناقدین کے مطابق، خالد حسین اپنے افسانوں کا مواد زمین کی کُھردری سطح اور اردگرد کے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ برِ صغیر ہندو پاک کی

مشترکہ تہذیب، آپسی بھائی چارہ، ملک کی تقسیم، قبائلی حملہ اور الحاق کی حقیقت، جموں کشمیر کی سیاست، ہوس اقتدار کے ماروں کی سازش اور غداری، ۱۹۹۰ء۔ کے بعد ریاستی عوام کے مسائل، بے بسی اور بے کسی، فسادیوں اور جہادیوں کی سرکاری پُشت پناہی۔ پسماندہ قبائل کی ان دیکھی، اور ریاستی خواتین کے مسائل کو پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ان سب سے آگے ان کی یہ 'خودنوشت' جو اردو میں شائع ہورہی ہے اس سے کشمیر اور کشمیر کے عوام کی غربت و افلاس اور سیاست دانوں کی منافقت اور مصلحت پسندی کے حوالے سے خالد حسین کی شخصیت، ادبی کارناموں اور سماجی وثقافتی خدمات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل خالد حسین کی حیات اور ادبی کائنات سے گزریئے تو اندازہ ہوگا کہ دین و مذہب اور مقام و مرتبہ سے ماورا صوفی منش خالد حسین کو مختلف زاویوں اور حوالوں سے جاننے پہچاننے کے باوجود، ہر شخص کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خالد حسین کی ذات میں ابھی اور بہت کچھ ہے جسے جاننا ضروری ہے۔

'کشپ رشی' تو محض ایک افسانوی کردار تھا جو 'ستی سر' کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کے اوراق میں کہیں گُم ہو گیا ہے لیکن انسان دوستی کے حوالے سے 'ستی سر کا سورج' (شیخ العالم) ایک ایسا زندہ اور متحرک استعارہ ہے، جس کی روحانی قیادت آج بھی بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتی ہے۔ خالد حسین کی تخلیقی ذات زندگی کے مرکز میں ستی سر کے اس سورج کے اجالے بھرے پڑے ہیں جو خالد کے قلم سے 'سانجھی تہذیب، انسانی مذہبی اور جمہوری قدروں کے احترام اور ادب وصحافت میں حق گوئی کی مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔ خالد حسین کا فکروفن ریاست جموں وکشمیر کی سرزمین اس گرہن سے نجات اور سورج کے ایک بار پھر سے طلوع ہونے کے انتظار میں ہے حالانکہ 'اٹوٹ انگ' اور 'شہ رگ' کے حوالے سے 'جموں کے 'فسادیوں' اور کشمیر کے 'جہادیوں' نے ریاست کے امن وامان میں

''گرہن'' کی جو کیفیت پیدا کی ہے اس کے سارے اندھیارے، ذہن اور ضمیر کو تاریک کر رہے ہیں۔ خالد حسین کی یہ 'خودنوشت'........ ہر حساس انسان کے اندر اس احساس کو جھنجھوڑتی ہے۔

خالد حسین نے اپنی اس تصنیف کو 'خودنوشت' کے نام سے پیش کیا ہے لیکن اسے محض 'ادبی رسم' کی ادائیگی جانیے، کیونکہ اس تصنیف کی ساخت (Structure) میں، 'خود نوشت' کے عام صنفی مزاج کے برعکس 'خود' سے زیادہ 'خُدائی' کا بیان ہے۔ یہ تصنیف مروجہ صنفی حدود ٹھوس کے بجائے 'سیال ہوکر، (جموں و کشمیر کے حوالے سے) تاریخ، تذکرہ، ناول اور افسانہ کو مَس کرتے نظر آتے ہیں، اور یہ عہد حاضر کے ہمہ جہت بحران کا ایک فطری رویہ ہے دراصل تکثیریت (Pluralism) انسانی زندگی اور ادب سمیت تمام فنون لطیفہ کا خاصہ بن چکی ہے۔ اسے عیب جانئے یا ہُنر لیکن حقیقت یہی ہے کہ عہد حاضر کے مباحث اور مسائل نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان، ادب، سماج اور ثقافت کا بھی، کسی بھی طرح کی آئیڈیالوجی (نظریہ، مفروضہ) سے رشتہ بدل گیا ہے اور مستقل بدلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جن 'آئیڈیالوجیز' اور نظامات (Systems) کے تحت انسان زندگی جیتا رہا ہے وہ سارے کے سارے بے فیض اور کھوکھلے ثابت ہو رہے ہیں۔ ادب چونکہ، مثبت یا منفی، تعمیری یا تخریبی آئیڈیالوجی اور نظام سے متاثر بھی ہوتا ہے اور ان کو متاثر بھی کرتا ہے اس لئے جینوین ادیب وہی ہوتا ہے جو اپنے عہد کی نبض پر ہاتھ رکھ کر معمولہ اور متعئین ہئیتی و تکنیکی ضابطوں کو ایک طرف سرکا کر آزادانہ اپنے 'بیانیہ' کو سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آکر کسی بھی ادبی تحریر کے صنفی لبادے میں کئی دوسری اصناف کی بھی چمک دمک صاف نظر آتی ہے۔ صنفی حدود کی خلاف ورزی یا سیالیت (Liquidity) کی عمدہ مثال بہت پہلے گیبریل گارشیا مارکیز کے ناول One

Hundred Years Of Solitude میں سامنے آئی تھی اردو میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں (مثلاً آگ کا دریا) مشرف عالم ذوقی کے افسانوں (مثلاً اصل واقعے کی زیراکس کاپی) وغیرہ میں صنفی حدبندیاں، ٹھوس کے بجائے سیال نظر آتی ہیں۔اسی مناسبت سے خالد حسین کی خودنوشت ایک روزنامچہ بھی ہے، اوراس میں جموں وکشمیر کی تاریخ بھی ہے، (جدید) تذکرہ بھی ہے اور گذشتہ ساٹھ، ستر برسوں میں جموں وکشمیر کی سماجی پسماندگی، معاشی بدحالی، ثقافتی لیل ونہار اور سیاسی کھیل تماشوں کی، سیدھے سچے کرداروں اور واقعات کے حوالے سے تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔اس کی مثالیں اس خودنوشت میں بھری پڑی ہیں۔لیکن ان تفصیلات تک جانے سے پہلے عام قارئین کو یہ پتہ تو چلنا ہی چاہئے کہ خود نوشت نگار خالد حسین نام کے انسان اور قلم کار کون ہیں اوران کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کن ناقابل یقین، حوصلہ شکن اور عبرتناک مرحلوں سے گزر کر ہوئی ہے۔اس کی تفصیل باب ''آگ کی ندی میں تیراک''میں درج ہے۔

۱۹ سال کی عمر میں، جناب سعید اللہ ملک کی دُختر محترمہ نسیم فردوس سے خالد حسین کی شادی کردی گئی۔تقریباً تین سال کے بعد پہلی بچی سمیہ تبسُم کی پیدائش کے بعد، بقول راوی (نصیر احمد میر) خالد حسین کی ساری 'خرمستیوں' پر روک لگ گئی۔گھر گرہستی کو مزید خوشگوار بنانے کے لئے خالد حسین نے ملازمت کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور 'کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء۔میں بی۔اے اور ۱۹۷۲ء۔ میں صحافت میں ڈپلومہ بھی کیا۔جموں میں خالد حسین نے ''سندیش، وقت، اور ''عمارت'' جیسے روزناموں کی ادارت کی اور سری نگر کشمیر میں بھی ''زمیندار، روشنی اور ''پولیٹیکل ٹائمز'' وغیرہ کئی مشہور اور معتبر روزناموں کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔جوانی کے ان دنوں میں شرارتیں بھی ہوتیں اور دوست یاروں کی محفلیں بھی سجتیں۔خالد حسین، نصیر احمد میر، تاج

محی الدین، شمی احمد، شجاع سلطان، اور رام لال ان محفلوں کی ''جند جان'' ہوا کرتے تھے۔ کبھی کافی ہائس تو کبھی قاضی نصیر کے تکیئے پر جمنے والی ان محفلوں میں کشمیر اور ہندوستان پاکستان کی سیاست سے لے کر جموں کشمیر کے مسائل، کلچر اور ادب کے موضوعات پر سرد و گرم بحثیں اور گپ بازیاں ہوتیں۔ مئی ۱۹۷۰ء۔ میں دوسری بیٹی ھُما تبسم کی اور ۲۵۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بڑے بیٹے ذاکر حسین کی پیدائش ہوئی۔

خالد حسین کے ہم دفتر گہرے دوست اور پانچویں راوی محمد یاسین ہمدانی کے مطابق خالد حسین خوش طبع اور ہنس مکھ نوجوان تھے اکثر بزم نشاط سجائے رکھتے۔ زندہ دل تو تھے ہی رحم دل بھی تھے اور بے شمار لوگوں کی مدد کی۔ لوگوں کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے طریقے اس نے اپنی سابقہ پریشاں حال زندگی کے تجربوں سے کشید کئے تھے۔ شروع سے ہی خالد حسین کو ادبی اور تاریخی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اسے اردو اور پنجابی کے سینکڑوں اشعار یاد تھے شیخ سعدی کی ''گُلستاں، بوستاں اور خاص کر روسی ادیب رسول حمزہ توف کی کتاب ''میرا داغستان'' اس کی پسندیدہ کتابیں تھیں پنجابی ادب کا تو وہ دلدادہ تھا پنجاب کے گیت اور صوفیوں کا کلام اسے ازبر تھا۔ جس محفل میں بیٹھتا لطیفوں، چُٹکلوں اور برمحل اشعار سنا کر محفل کو گُلزار بنا دیتا۔ خالد حسین کی یہ زندہ دلی عمر بھر اس کے ساتھ رہی۔

خالد حسین نے جموں کشمیر کے مفاد میں ہمیشہ ایک خاموش سپاہی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں اس خودنوشت سے درجنوں واقعات دُہرائے جا سکتے ہیں۔ خالد حسین کو انگریزی، اردو، ہندی، پنجابی، ڈوگری اور کشمیری وغیرہ کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۷۵ء۔ میں ''اندرا ایکارڈ'' کے بعد جب شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلی بنے تو ان کے دست راست، نائب وزیر اعلی مرزا محمد افضل بیگ کو اپنے پرسنل اسسٹنٹ کے لئے ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص کی تلاش ہوئی جو انگریزی اردو کے علاوہ مقامی زبانوں اور

تہذیبی رنگا رنگیوں سے بھی واقف ہو۔ ایسا نادر روزگار شخص خالد حسین کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ محمد یوسف ٹینگ کی نشاندہی پر خود بیگ صاحب نے تحریری اور زبانی انٹرویو کے بعد خالد حسین کو منتخب کرلیا۔ مرحوم بیگ صاحب ایک منجھے ہوئے سیاست داں اور وکیل تو تھے ہی انگریزی، اردو اور فارسی زبان و ادب کی بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ خالد حسین کو ان سے سیاست کے اسرار و رموز کے علاوہ، ادب میں اظہار و بیان کی باریکیوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملی۔ لیکن تقریباً پونے چار سال بیگ صاحب کے ساتھ کام کرنے کے بعد جب شیخ صاحب کے داماد اور کابینہ کے وزیر غلام محمد شاہ (گُل شاہ) کی حاسدانہ سازشوں کے سبب بیگ صاحب کو استعفی دینا پڑا تو خالد حسین بھی اپنے اصل محکمے میں لوٹ آئے اور ماہنامہ ''دیہات سدھار'' کے 'مدیر' کا عہدہ سنبھالا۔ ان دنوں خالد حسین کا دفتر Kashmir Administrative Service کے نئے افسران کی سیاسی اور ادبی غور وفکر اور بحث و مباحثہ کا بھی مرکز بن گیا تھا۔ ان نئے افسران میں مشہور اردو شاعر پرتپال سنگھ بیتاب، مُنہ بولی بہن تنویر جہاں، نسیم لنکر، دلیپ سنگھ، سید فضل اللہ، اوتار کرشن رینہ، سُنیتا گُپتا اور مسعود سامون وغیرہ شامل تھے۔ ان کے بارے میں راوی نے دعوی کیا ہے کہ انہوں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ سرکاری مراعات کا کبھی ناجائز استعمال نہیں کیا۔ یہ سبھی افسران۔ I.A.S. کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان میں محترمہ تنویر جہاں واقعی خالد حسین کو بھائی مانتی تھیں۔ J.N.U. سے انگریزی میں ایم۔ اے، اور۔ K.A.S کا امتحان پاس کرکے 'سِول سروس'' میں آنے والی تنویر جہاں بڑے گھر کی، بڑے دل والی خاتون تھیں۔ گھر سے عمدہ پکوان بنوا کر لاتیں اور خالد حسین، نور شاہ اور سوامی راج بھگت جیسے غریب غربا نما ساتھیوں کو چاؤ سے کھلاتیں اور اکثر جب موڈ ہوتا، کینٹین سے کباب، کانتی اور چائے سے بھی خاطر تواضع کرتیں۔ ایک دن پتہ نہیں کیا معاملہ ہوا کہ

تنویر جہاں صاحبہ نے خالد حسین سے کہا کہ ''چائے منگواؤ''، خالد صاحب نے عُذر پیش کیا کہ ''پیسے نہیں ہیں''۔ تنویر جہاں صاحبہ نے دو چار صلواتیں سنانے کے بعد اسی دفتر میں کام کرنے والے (مشہور افسانہ نگار) نور شاہ سے کہا کہ وہ خالد حسین کی مسکینی (غُربت) دور کرنے کے لئے اسے بلاک ڈیولپمینٹ افسر بنائیں، نور شاہ نے کہا ''یہ نا ممکن ہے'' تنویر صاحبہ بھی اڑ گئیں، فائل بنوائی اور ذاتی کدو کاوش اور دلچسپی سے کمشنر سکریٹری جناب محمود الرحمٰن (جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے) سے لے کر متعلقہ وزیر پنچایت جناب محمد اشرف خان سے بہ نفس نفیس مِل کر خالد حسین کو ''بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کے عہدے پر فائز کروایا۔ بحیثیت بی۔ڈی۔او. خالد حسین کی پہلی پوسٹنگ ''ارناس'' میں ہوئی۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک وہ ارناس کے بی۔ڈی۔او۔رہے۔ ۱۹۸۳ء۔ میں فاروق عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس نے اندرا گاندھی کی مرضی کے خلاف، تن تنہا الیکشن لڑ کر بھاری اکثریت حاصل کی اور حکومت بنائی۔ اندرا گاندھی سخت ناراض ہوئیں اور ان کی شہ پر ملک اور خصوصاً جالندھر پنجاب سے ''ہندسماچار، ملاپ، پرتاپ، پنجاب کیسری، اجیت، جگ بانی، نواں زمانہ، وغیرہ اور انگریزی اخبارات ''ٹریبیونِ، انڈین ایکسپریس، ٹائمز آف انڈیا، اور ہندوستان ٹائمز'' وغیرہ چنڈی گڑھ سے شائع ہوتے تھے۔ یہ سبھی اخبارات ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو 'غدار' اور 'دیش دروہی' ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے۔ پنجابی کے ادیب اور صحافی ہونے کی حیثیت سے، پنجاب کے ادیبوں اور صحافیوں سے خالد حسین کے گہرے مراسم تھے۔ اس صورت حال کو بدلنے، منفی پراپگنڈے کو روکنے اور جموں وکشمیر کی صورت حال اور فاروق عبداللہ کی وطن دوستی کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے اس وقت کے وزیر جناب شفیع اوڑی نے خالد حسین کو ''عوامی رابطہ افسر'' بنا کر جالندھر کے 'انفارمیشن سینٹر' میں

تعینات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے 'کمشنر اطلاعات' پنڈت اونکار ناتھ دھر نے اس کی شدید مخالفت کی لیکن شفیع اوڑی بھی اپنے فیصلے پر اڑے رہے اور وزیر اعلی فاروق عبداللہ کی منظوری لے کر خالد حسین کو جالندھر اطلاعاتی مرکز کا ''پبلک ریلیشنز افسر'' تعینات کر دیا۔ جالندھر میں دو روز تک اخبارات نے جموں کشمیر کی خبروں کا بائیکاٹ کیا۔ خالد حسین نے خود ہندی اور گورمکھی کی خبروں کی تصحیح کر کے اخبارات میں بھجوائیں۔ خالد حسین نے اپنے دوستوں ''ہند سماچار'' کے نائب مدیر پریم پرکاش کھنوی اور مالک رمیش چوپڑہ کی مدد سے جموں کشمیر سے متعلق افواہوں کی مدلل تردید کی۔ اور اصل حقائق جاننے کے لئے انہیں ریاستی سرکار کی طرف سے شائع کردہ کتابچے بھی دئے۔

گر دیکھا جائے تو پندرہ سال کی عمر سے جدو جہد بھری زندگی کی شروعات کرنے والے خالد حسین ایک Self Made شخص اور افسانہ نگار اور صحافی ہیں، جنہوں نے تمام تر حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرتے ہوئے مثالی انداز میں نہائت آن بان اور شان کے ساتھ ملازمت بھی کی، اپنی ریاست اور عوام کی بے بہا خدمت بھی کی اور اس دوران اپنے اندر کے کہانی کار کو بھی زندہ رکھا اور پنجابی اور اردو کے افسانوی ادب میں یادگار اضافے بھی کرتے رہے۔ خالد حسین کی اس خودنوشت میں صرف ان کی 'ذات' نہیں، زمین بھی ہے اور زمانہ بھی اسی لئے اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ گذشتہ ستر بہتر برسوں میں جموں کشمیر پر کب کیا گذری، اور فساد اور جہاد سے لے کر الحاق اور آزادی تک کے نام پر مرکز سے لے کر ریاست کے ایوانوں تک، سیاسی سازش، ضمیر فروشی اور غداری کے کیسے کیسے کھیل تماشے ہوئے، تو پھر خالد حسین کی اس خودنوشت سے زیادہ سچی باتیں کہیں کسی اور تصنیف میں مشکل سے ملیں گی۔

خالد حسین نے اپنی یہ خودنوشت اردو کی پہلی جدید داستان، میر امن کی ''باغ و بہار/

چہار درویش کی طرز، تکنیک اور محاورے میں بیان کی ہے۔ زبان بھی میر امن کی طرح ایسی ہے کہ ''لڑکے بالے سبھی کی سمجھ میں آجائے۔ لیکن خالد کے ادبی مشرب میں کسی کی بھی تقلید حرام ہے۔ ان کے یہاں موضوع، تکنیک، اسلوب اور بیانیہ میں ایجادی اور اختراعی رویہ کی وجہ سے ان کا فن اپنی ایک الگ ہی پہچان قائم کرتا ہے جو انہیں سے مخصوص ہے۔ اس خودنوشت کی ابتدائی سطریں خالد حسین کے ہمزاد نے انہیں 'عالمِ برزخ' میں رکھ کر ان کی ذات اور صفات سے قارئین کو متعاف کروایا ہے۔ یہ خالد حسین کا تکنیکی اجتہاد ہے۔ اختراع یہ ہے کہ خالد حسین نے اپنا یہ 'زندگی نامہ' 'خود' کے بجائے کئی راویوں کی زبانی بیان کروا کر 'خودنوشت' کی صنف کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ پہلی راوی خالد حسین کی بڑی بہن زبیدہ بیگم ہیں جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں گھر خاندان کے لُٹنے اجڑنے کے بعد خالد حسین اور بچے کُھچے اہل خانہ کو پالا پوسا۔ دوسرا راوی، خالد حسین کے بچپن کے دوست نصیر احمد میر ہیں جنھوں نے خالد حسین کے بچپن کی عادتوں اور شرارتوں سے لے کر، جدو جہد بھرے روز وشب کی حکایات بیان کی ہیں۔

اردو اور کشمیری کے مشہور ادیب، شاعر اور ادبی مورخ جناب ولی محمد اسیرؔ خالد حسین کی داستان حیات کے چوتھے راوی ہیں۔ اسیر صاحب اور خالد حسین نے ضلع ڈوڈہ میں اعلی سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے تقریبا چھ سال تک ایک ساتھ کام کیا۔ دونوں ادبی قلم کاروں نے ادبی تنظیم بنا کر ترقیاتی کمشنر جناب اقبال کھانڈے کی مدد سے کئی کُل ہند مشاعرے کروائے، جن میں ملک کے نامور شعرا نے شرکت کی۔ اسیر صاحب نے اپنی روائت میں، ایک انتہائی دردناک سفر کا ذکر کیا ہے جس میں اقبال کھانڈے، خالد حسین اور جموں کشمیر بینک کے ڈسٹرکٹ منیجر عبدالرشید تیلی اور ڈاکٹر ریاض شامل تھے۔ لیکن گھڑ سواری کرتے ہوئے کشتواڑ سے آگے ایک پہاڑی سے گزرتے ہوئے عبدالرشید تیلی

گھوڑے کے ساتھ ہی پگڈنڈی سے لُڑکتے ہوئے تقریباً ۶۰۰ فٹ نیچے دریائے چناب کے پاس پہنچ گئے۔ ''یہ منظر دیکھ کر خالد حسین اور ڈاکٹر ریاض ڈھلان کی طرف چھلانگیں مار کر تیلی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ عبدالرشید تیلی کے بازو کی ہڈیاں چکنا چور ہو چکی تھیں۔ پاؤں اور کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے پانی مانگا تو خالد حسین نے ایک مردہ جانور کی کھوپڑی دھو کر تیلی صاحب کو پانی پلایا۔ خالد اور ریاض کسی طرح ہمت کر کے عبدالرشید تیلی کو پگڈنڈی پر لے آئے۔ لیکن تیلی نے دم توڑ دیا۔

اسیر صاحب نے اپنے حصے کی روداد میں خالد حسین کی انسان دوستی اور رحم دلی کے اور بھی کئی واقعات بیان کئے ہیں جو خالد حسین کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خالد حسین ایک نڈر اور بے خوف شخص ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے چنانچہ اسیر کشتواڑی نے لکھا ہے کہ، جن دنوں خالد حسین پونچھ میں اسسٹنٹ کمشنر تھے 'ملیٹینسی' اپنے شباب پر تھی، لیکن خالد حسین دور دراز علاقوں کے دورے کرتے اور بیروزگار نوجوانوں کو چھوٹے موٹے کام دیتے۔ دوست احباب انہیں اکیلے دورے پر نہ جانے کا مشورہ دیتے لیکن خالد حسین کا جواب ہوتا کہ، ''جو گولی اس کے لئے بنی ہے وہ اسے ضرور لگے گی، اور جو نہیں بنی وہ اسے کبھی نہیں لگ سکتی۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔

خالد حسین کی اس تصنیف میں ایک اہم ترین باب ''سورج کا مرثیہ'' کے عنوان سے شامل ہے، جس میں کشمیر کی تقسیم، قبائلی حملہ، ہندوستان کے ساتھ جموں کشمیر کے ''الحاق'' مرکزی حکومت کی وعدہ خلافی، شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری، مہاراجہ کا اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر سے فرار، جموں صوبے میں تقریباً دو لاکھ سینتیس ہزار مسلمانوں اور ستر ہزار ہندوؤں اور سکھوں کی ہلاکت (U.N.O کے مطابق) ہوئی۔

شیخ صاحب کا جموں و کشمیر کی مکمل داخلی خودمختاری کا مطالبہ، ہند پاک جنگ بندی، لائن آف کنٹرول کی نشاندہی، پنڈت نہرو کی 'رائے شماری' کروانے کی تحریری یقین دہانی، ڈکسن (Sir Owen Dixan) پلان، ''دلی ایگریمینٹ'' میں ٹال مٹول، بخشی غلام محمد، شمس الدین اور غلام محمد صادق کی حکمرانی، صدر ریاست کی جگہ گورنر اور وزیر اعظم کی جگہ وزیر اعلیٰ بنائے جانے کا فیصلہ، ریاست میں مرکزی قوانین کا نفاذ، اور شیخ محمد عبداللہ پر غداری کا مقدمہ وغیرہ واقعات و سانحات کا ذکر پوری غیر جانبداری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس باب کے یہ چند جملے تو حد درجہ عبرت ناک ہیں کہ ''جو شخص ۱۹۵۳ء سے پہلے وزیر اعظم تھا اور پنڈت نہرو جس کو ایک سربراہ مملکت کے طور پر استقبال کرنے ایئرپورٹ آتے تھے، جو کشمیری عوام کا ہر دل عزیز لیڈر تھا، جس نے 'رائے شماری' کرانے کے لئے ۲۲ سال جیل میں کاٹے، جس پر مرکزی سرکار نے 'غداری' کا مقدمہ چلایا۔ وہی شیخ عبداللہ ایک سمجھوتے کے تحت وزیر اعلیٰ بن گیا، ہائے رے سیاست تیرے رنگ نرالے''۔ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو سیدھے سادے انداز میں سمجھنے میں خالد حسین کی خودنوشت کا یہ باب جتنا معاون ثابت ہوگا شاید تاریخ کی دوسری کتابوں میں نہ ہو سکے۔

خالد حسین کی داستان حیات کے ایک راوی جموں کشمیر کے شہرت یافتہ افسانہ نگار جناب نور شاہ بھی ہیں۔ ''سُخن شناسی'' کے عنوان سے خالد حسین کی سُخن پروری۔ یعنی افسانہ نگاری (اور صحافت) پر روشنی ڈالی ہے۔ نور شاہ اور خالد حسین محکمہ زراعت کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ نور شاہ ماہنامہ دیہات سدھار کے مدیر تھے اور خالد حسین نائب مدیر۔ دونوں مانے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ نور شاہ کو 'رومانیت' سے 'حقیقت نگاری' تک آتے آتے بہت وقت لگا لیکن خالد حسین کی افسانہ نگاری کا 'انکر' پھوٹا ہی 'سچ' کے 'منتھن' سے۔ جہاں پر سچ کی اصل سچائیاں کُھل کر سامنے نہیں آپاتیں، اور سچائیوں کا جاننا بھی کافی نہیں

ہوتا، وہیں سے خالد حسین کے افسانہ کی شروعات ہوتی ہے۔ خالد حسین کی یہ روش اکثر ان کے لئے مصائب بھی کھڑی کرتی ہے۔ خالد صاحب کا پہلا اردو افسانہ ''گھر کی جنت'' ماہنامہ ''دیہات سدھار'' کے اکتوبر نومبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس افسانے کی مقبولیت کے بعد خالد حسین کے کئی اور اردو افسانے شائع ہوئے۔ ۱۹۷۱ء۔ کے اوائل میں خالد حسین کا ایک افسانہ ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس افسانہ کے چھپتے ہی ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ یہ افسانہ سچے واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ خالد حسین پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن نو مہینوں کے بعد وہ ہر غلط الزام سے بری ہو گئے اور نوکری پر بھی باعزت واپس لوٹ آئے۔ لیکن ان کی اہلیہ کے سارے زیورات مقدمہ بازی کی نذر ہو گئے۔ خالد حسین کو ان کی ایمانداری اور انصاف پسندی کے لئے ایسے اور بھی کئی عذابوں سے گذرنا پڑا مثلاً جن دنوں خالد حسین ''پونچھ'' میں ڈپٹی کمشنر تھے، ''رہبر تعلیم'' کی اسکیم آئی۔ ایک بار سورن کوٹ کے ایم۔ ایل۔ اے اور وزیر مملکت جناب مشتاق بخاری کے چچازاد بھائی، سورن کوٹ کے میڈیکل افسر ڈاکٹر ممتاز بخاری نے بغیر اختیارات ۴۵۔ ناجائز تقرریاں کی تھیں، اپنی بیوی کو بھی مِڈ وائف کی آسامی پر لگایا تھا۔ خالد حسین نے جانکاری ملتے ہی کاروائی کی۔ ممتاز بخاری کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی۔ انتقام کے طور پر خالد حسین پر بھی کئی جھوٹے الزامات عائد کردئے گئے۔ مثلاً یہ کہ رہبر تعلیم کے تحت استاد لگانے کے لئے خالد حسین نے فی امیدوار بیس ہزار روپئے لئے ہیں۔ دوئم خالد حسین نے مِلی ٹنٹوں کو بندوق کے لائسنس جاری کئے۔ سوئم اساتذہ کی تقرری میں بے ضابطگی کی گئی ہے۔ ڈائریکٹر جنرل گوربچن جگت جی نے ہریانہ سے پولس ٹیم بُلوا کر تفتیش کروائی۔ پندرہ دنوں کے بعد چیف سکریٹری اور ڈاکٹر گربچن جگت نے خالد حسین کو بتایا کہ ان کے خلاف تمام الزامات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''اس طرح کی الزام

تراشیاں ملازموں پر لگتی رہتی ہیں لیکن ایمان داری اور ضابطے کے مطابق ڈیوٹی سرانجام دینے والوں کو صرف اپنے مالک سے ڈرنا چاہئے۔''

لیکن ایسے سارے معاملات نے خالد حسین کے اندر کے افسانہ نگار کو اور زیادہ پُختہ اور پُراعتماد بنا دیا۔ اسی دوران ان کے دوست ہربھجن سنگھ ساگر نے خالد حسین کو پنجابی میں بھی لکھنے کا مشورہ دیا۔ خالد حسین نے پنجابی میں نئے انداز کا اپنا پہلا افسانہ ''ٹھنڈی کانگڑی'' کے عنوان سے لکھا۔ اور اسے بین الاقوامی شہرت کی مالک، بے باک شاعرہ اور دانشور محترمہ امرتا پریتم کی کی ادارت میں شائع ہونے والے پنجابی کے مشہور رسالہ ''ناگ منی' میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ 'ناگ منی' میں خالد حسین کا افسانہ نمایاں طور پر شائع ہونے کے بعد اس افسانہ کو لاہور کے مشہور ادیب اور شاعر احمد سلیم نے اپنے ماہنامہ ''گونج'' میں 'شاہ مکھی' (فارسی رسم الخط) میں شائع کیا۔ اس ایک افسانہ کی اشاعت سے ہی بحیثیت پنجابی افسانہ نگار خالد حسین کی دھوم مچ گئی۔ اس کے بعد امرتا پریتم کی فرمائش پر خالد کی کئی کہانیاں ''ناگ منی' ' میں شائع ہوئیں امرتا پریتم نے خالد حسین کا ایک انٹرویو بھی شائع کیا۔ پاکستان کے پنجابی رسائل میں بھی خالد حسین کے افسانے تواتر سے شائع ہونے لگے۔ اس طرح خالد حسین پنجابی قارئین کے لئے ایک جانا پہچانا نام بن گئے اور ان کی افسانہ نگاری پر مضامین لکھے جانے لگے۔ اس دوران خالد حسین اردو میں بھی افسانے لکھتے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان کا شاید ہی کوئی قابل ذکر پنجابی اور اردو کا رسالہ ہوگا جس میں خالد کے افسانے نہ شائع ہوتے ہوں۔ ہندو پاک کے کئی کُل ہند اور ہند پاک ادبی کانفرنسوں میں خالد حسین نے حصہ لیا۔ ۱۹۷۵ء۔ میں خالد حسین کو پنجابی ساہتیہ سبھا سری نگر کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس وقت خالد کی عمر صرف تیس سال تھی لیکن اس کی پچاس سے زیادہ پنجابی کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں اس کے فن کا ڈنکا بج رہا

تھا۔ اسی دوران خالد حسین نے سری نگر میں ''دو روزہ پنجابی کانفرنس منعقد کروائی۔ اس تاریخی کانفرنس میں ملک بھر سے ڈھائی سو سے زیادہ شاعروں ادیبوں، دانشوروں، پروفیسروں اور تحقیق کاروں نے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت شیخ محمد عبداللہ نے کی جبکہ پنجاب کے وزیر اعلی گیانی ذیل سنگھ مہمان خصوصی تھے۔ اس کانفرنس سے پنجاب اور جموں کشمیر کے آپسی رشتے تو مزید گہرے ہوئے ہی، پنجابی اور اردو ادب اور ادیبوں کے مابین بھی قربتیں بڑھیں۔ حالانکہ اس کانفرنس کو ناکام بنانے کی سازشیں بھی کی گئیں لیکن خالد حسین کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے آخر کار دشمن بھی دوست بن کر آگئے اور کانفرنس کو کامیاب بنانے میں خالد حسین کے ساتھ تعاون کیا۔

خالد حسین نے اپنی زندگی میں دوست اور دوستی بہت کمائی ہے۔ اس خودنوشت میں خالد حسین نے بچپن سے لے کر نوجوانی تک اور پھر ریٹائرمنٹ اور اسکے بعد کے دنوں کے سینکڑوں دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن جگری اپنائیت کی غیر معمولی حرارت جن دوستوں کے ذکر میں ملتی ہے ان میں چودھری تاج محی الدین، اقبال کھانڈے، فخر زماں، افضل ساحر .....وغیرہ شامل ہیں۔ تاج محی الدین، خالد حسین کے بچپن کے جگری دوست ہیں۔ تاج محی الدین کئی بار الیکشن لڑے، ہارے بھی اور جیتے بھی۔ دو بار وزارت بھی سنبھالی۔ تاج محی الدین نے اپنی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ریاست کے مفاد میں 'اوڑی' اور 'سلال پروجیکٹ' اور 'ولر بیراج' کی تعمیر جیسے کئی انقلابی اقدامات کئے، خاص طور پر N.H.P.C سے معاہدہ کر کے ریاست میں 'بجلی' اور آب پاشی کے انتظام کو بہتر بنایا اور آبیانہ وصول کیا جو کہ ایک تاریخی کامیابی ہے۔ خالد حسین دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ ''تاج میرے اچھے برے وقتوں کا دوست ہے۔ شاید میں واحد ایسا دوست ہوں جس پر تاج نے مکمل بھروسہ کیا، بھرپور اعتماد کیا، میں نے بھی اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے

کے ہم راز ہیں اور زندگی کے اہم فیصلے باہمی مشورے سے کرتے ہیں۔ایسے سچے دوست اللہ کسی کسی کو ہی بخشتا ہے۔

تاج محی الدین کی طرح جناب اقبال کھانڈے بھی خالد حسین کے عزیز ترین دوست تھے۔جموں کشمیر انتظامیہ'' کی تاریخ میں اقبال کھانڈے سے زیادہ ذہین، زیرک، فعال، حوصلہ مند، ایمان دار اور جگر والا ADMINISTRATER اس سے پہلے اور بعد کوئی دوسرا نہیں ہوا۔۱۹۸۵ء۔میں اقبال کھانڈے ضلع ڈوڈہ میں ڈپٹی کمشنر تھے اور خالد حسین پروجیکٹ آفیسر۔خالد تو ادیب تھے ہی، اقبال کھانڈے کو بھی شعروادب سے دلچسپی تھی۔وہ شاعروں ادیبوں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی بڑی عزت کرتا تھا اور خود چونکہ وہ خوش شکل، خوش مزاج اور خوش اطوار کے علاوہ ''خوش گلو'' بھی تھا اس لئے اکثر شاعروں کے اشعار، فلمی گیت گانے اور گلوکاروں کے گائے ہوئے نغمے گنگناتا اور کبھی دوستوں کو گا کر بھی سناتا۔ایک 'ایڈ منسٹریٹر کی حیثیت سے اقبال کھانڈے کی فتوحات بے شمار ہیں۔اقبال کھانڈے واحد ڈپٹی کمشنر تھا جو عوام اور علاقے کے ءمسائل کا بہ چشم خود جائزہ لینے کے لئے، دور دراز اور دشوار گذار علاقوں کا پیدل دورہ کرتا۔خالد حسین ہر دورے میں ان کے ساتھ ہوتے۔ان دوروں سے متعلق کئی واقعات کا ذکر اس خودنوشت میں موجود ہے۔ عبدالرشید تیلی کے دل دہلانے والے سانحے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔لیکن سینکڑوں واقعات خالد حسین زبانی بھی سناتے ہیں۔اقبال کھانڈے کی پوری زندگی چیلنجز کا سامنا کرتے گزری جس کا بیان خالد حسین نے انتہائی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔خاص کر 'ُگر وادیوں' کے خاتمے کے نام پر، عام کشمیریوں کی ہلاکت کے سوال پر گورنر جگموہن اور ان کے درمیان مکالمے کا بیان۔خالد حسین نے پاکستانی فکشن نگار فخر زماں، ڈاکٹر اظہر محمود، اوتار سنگھ چندن، شیخ غلام رسول وغیرہ دوستوں کو بھی بڑے خلوص کے ساتھ یاد کیا ہے۔اس تصنیف

میں جن دیگر اہم شخصیات کے بارے میں کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے ان میں، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاراجہ ہری سنگھ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، شیخ محمد عبداللہ، مولانا مسعودی، مرزا افضل بیگ، گُل شاہ، بخشی غلام محمد، شریمتی اندرا گاندھی، بلراج ساہنی، خواجہ احمد عباس، امرتا پریتم، محمد یوسف ٹینگ، نور شاہ، میاں بشیر احمد، ملکہ پُکھراج، اور دھیریندر برہمچاری جیسی کئی شخصیتیں شامل ہیں۔

یہ 'خودنوشت'...... اردو اور پنجابی کے۔صفِ اول کے افسانہ نگار خالد حسین کی ذات، زندگی اور زمانے کی کھلی کتاب بھی ہے اور تقسیم ملک کے آس پاس سے لے کر، آج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک، ریاست جموں وکشمیر میں ''اٹوٹ انگ'' اور ''شہہ رگ'' کے نام پر ہونے والی سیاسی شعبدہ بازیوں کی دستاویز بھی۔لہٰذا خالد حسین کے اس ''زندگی نامہ'' کے ساتھ ساتھ جموں وکشمیر کے ''سیاست نامہ'' کی ایماندارانہ آگہی حاصل کرنے کے لئے خالد حسین کی اس تصنیف ''میں زندہ آدمی ہوں'' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید
سابقہ صدر شعبۂ اُردو
کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

حیات وکائنات کا عکاس......خالد حسین

خالد حسین کی تحریروں میں پہاڑوں کا حسن بھی ہے اور میدانوں کی زرخیری اور شادابی بھی، یعنی آپ جموں کشمیر سے لے کر پنجاب تک کی تہذیب وثقافت، زبان وبیان کو بہترین محاوراتی اسلوب ونگارش سے مزین کرنے والے فنکار ہیں۔ان کی تحریروں میں گرتے جھرنوں کی سی شفافیت بھی ہے اور بہتے دریاؤں کی سی پاکیزگی بھی۔

فن کوئی بھی ہو، اُس کا مقصد انسانی جذبات اور خیالات کی عکاسی کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خالد حسین زندگی کا فہم وادراک رکھنے والے معتبر قلم کار ہیں جو چھوٹے چھوٹے لطیف جذبوں سے ایک بڑا کینوس ابھارنے اور اپنے قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے ہنر سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔اُن کی یہ خوبی انفرادیت کی حامل ہے۔

خالد حسین کی زبان شائستہ، سادہ اور شیریں ہے اور ساتھ ہی اُس میں پنجابی الفاظ اور لہجے کے رچاؤ نے ایک وقار عطا کیا ہے جو کشش اور پسندیدگی کی وجہ بنتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری لکھنا اپنے آپ میں بڑے حوصلے اور ہمّت کا کام ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی خودنوشت دلچسپ اور کارآمد ہو تو آپ کو اپنی زندگی کے تمام تر واقعات کو سچائی اور ایمانداری سے تحریر کرنا ہوتا ہے جس میں آپ کی خوبیاں بھی شامل ہیں اور کمیاں بھی۔تاکہ قارئین آپ کی کامرانیوں کے ساتھ ساتھ آپ کی ناکامیوں

سے بھی سبق حاصل کرسکیں اور حقیقی زندگی کا لطف لے سکیں۔خالد حسین کی خودنوشت کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جہاں اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے وہیں اپنے بچپن کی شرارتوں سے لے کر موجودہ دور تک کی تمام کھٹی میٹھی یادوں کا تذکرہ بحسن وخوبی کیا ہے۔

لکھتے ہیں، ''جب ہم کھیلتے ہوئے تھک جاتے اور بھوک سے نڈھال ہوجاتے تو اُن کھیتوں میں شلغم، مولیاں، گاجریں اور کرم کی مُنڈیاں چوری کرتے اور پانی سے دھوکر کھاتے، کمیٹی باغ میں املوک توڑ کر کھاتے، کئی بار سبزیاں اُگانے والے ارائیں ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کرتے لیکن ہم بھاگ جاتے ....سرینگر کا سِول سیکرٹریٹ ہمارے بچپن میں زنانہ پارک ہوا کرتا تھا۔اس میں رنگ برنگے پھول، سیب، ناشپاتی، آلو بخارے، خوبانی، چیری اور مُشک بید کے درخت تھے۔ہم لوگ مالی کی نظر بچا کر پارک میں گھس کر پھل کھایا کرتے تھے جب کبھی ہم میں سے کوئی مالی کے ہتھے چڑھ جاتا تو مالی اُس سے پھلوں کے پیسے مانگتا اور پیسے نہ دینے پر اسے پکڑ کر اُس کے گھر لے جاتا اور والد سے رقم کا تقاضا کرتا، مالی کے جانے کے بعد مولا بخش سے اس کی خاطر تواضع کی جاتی۔''

اس طرح کے تمام واقعات کی جزئیات نگاری مضمون کو دلچسپ اور پُرتاثیر بناتی ہے اور لکھنے والے کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہے۔خالد حسین ایک کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں اُردو اور پنجابی زبانوں پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔آپ ایک کامیاب ادیب اور عمدہ مترجم ہیں، درجنوں کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم ہیں۔اُردو کی بات کریں تو اُن کے افسانوی مجموعوں میں 'ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'، 'اشتہاروں والی حویلی'، 'ستی سر کا سورج'، اور 'جنت گرہن' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اُن کی یہ سوانح حیات پہلے 'ماٹی کُدم کریندی یار' کے عنوان سے پنجابی میں شائع ہو چکی ہے جسے اب ''میں زندہ آدمی ہوں'' کے نام سے اردو میں منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔

خالد حسین کی خودنوشت کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف دردمند دل رکھنے والے ادیب ہی نہیں بلکہ اُن کی شخصیت میں ایک بہادر، نڈر اور نہایت حوصلہ مند انسان بھی جلوہ افروز ہے۔ وہ قدرت سے پیار کرنے والے ہیں۔ پہاڑوں اور دریاؤں کے گرد گھوڑ سواری کرنا بھی اُن کے مشاغل میں شامل ہے۔

اُردو زبان وادب میں پائی جانے والی شائستگی، شگفتگی، حلیمی اور شیرینی ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور تقریباً یہی اوصاف خالد حسین کی شخصیت سے بھی اُجاگر ہوتے ہیں۔ محبت اور اپنے پن کی ایک خاص رو ہے جو جھرنے کی طرح بہہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالد حسین نے اپنی پنجابی خودنوشت سوانح کو اردو کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ زبان و بیان ہو یا اسلوب نگارش یا واقعات کی منظر کشی انہیں ہر چیز پر کمال حاصل ہے اور پھر اُردو زبان میں جو پنجابی کا تڑکا لگایا ہے اُس نے کتاب کی زینت وزیبائش میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کے مشمولات میں آگ کی ندی کے تیراک، یاریاں دلداریاں، سخن شناسی، شناسائیاں، رہے نام سائیں کا، میں خطاوار تو بخشنہار، دل دریا بہتا جائے، مومن کافر میں کیا جانوں، کون دلوں کی جانے ہو، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے وغیرہ عنوانات کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔

خالد حسین کی تحریروں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا طرز تحریر جدید اسلوب نگارش پر مشتمل ہے اُن کے یہاں متروک الفاظ ومحاورات کا استعمال نہیں ملتا۔ ایک منجھے ہوئے قلمکار کی طرح بات کرتے وقت کسی طرح کا جارحانہ انداز نہیں اپناتے بلکہ حقائق کو

پیش کرتے ہوئے ان کا لہجہ نرم اور سہل رہتا ہے۔ اُن کی خودنوشت میں زندگی اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو بلاشبہ ایک فنکار کی بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

اس خودنوشت سوانح حیات کا ایک اور وصف جو انفرادیت کا حامل ہے وہ یہ کہ خالد حسین نے اپنی حیات کے رموز ونکات کو سیدھے طور پر خود بیان نہیں کیا بلکہ خود پس پردہ رہ کر انھوں نے یہ سب راویوں سے بیان کروایا ہے۔ اُردو ادب میں غالباً یہ نیا تجربہ ہے اور خالد حسین کی اختراع ہے جو قابل قدر ہے۔ اس کا استقبال ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر ندیم احمد ندیم
مالیرکوٹلہ، پنجاب

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کِدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ
(ناصر کاظمی)

مشہور ادیب، کہانی کار، صحافی اور یاروں کا یار خالد حسین، جس نے جموں و کشمیر کے علاوہ بھارت اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں اپنے افسانوں کی بدولت ایک خصوصی مقام بنایا تھا، وہ کل فوت ہو گیا۔ اُس کی موت کیسے ہوئی، اس بارے میں ڈاکٹر حضرات نے کوئی خاص جانکاری نہیں دی لیکن آپ یہ یقین کرلیں کہ اُس کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا کیوں کہ اُس کا ہارٹ تو ''سویٹ ہارٹ'' تھا۔ پیار سمندر اُس کے اندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ وہ آپ عِشق تھا، عاشق تھا اور معشوق بھی۔ وہ قدرت کی بنائی ہوئی کائنات میں رچ بس گیا تھا۔ وہ سچ اور حق کے مذہب کو ماننے والا تھا۔ وہ انتہا پسند مولویوں اور جنونی ہلک دھاریوں سے دُکھی تھا۔ وہ دُنیاوی دولت کو جُوتے کی نوک پر رکھتا تھا۔ اسی لئے شاہ خرچ تھا۔ اُس نے ساری زندگی گیان کی دولت حاصل کرنے میں گذار دی۔ وہ اپنے دوستوں کو پیار سوغاتیں بانٹتا رہتا۔ اُس نے کبھی اپنی زندگی میں رشتے نہیں گنوائے، بلکہ رشتوں کو پالا، سنوارا اور نبھایا۔ اُس کے دِل کی دُنیا ہمیشہ آباد رہی۔ اُس کی وفات پر ادبی حلقوں میں اُداسی چھا گئی تھی، گورنر، وزیر اعلیٰ، وزراء، سماجی اداروں اور ادبی انجمنوں نے ماتمی قرار دادیں پاس کیں اور خالد حسین کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُسکی شخصیت، سماجی اور ادبی کارگذاریوں کو سراہا گیا۔ سب نے بڑے دُکھی دِل

سے اُس کا سوگ منایا۔ مقررین نے کہا کہ اُسکی وفات سے ادبی دُنیا میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے لیکن سچے اور سُچے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا کہنا تھا کہ خالد حسین کے چلے جانے سے مُلک، سماج اور ادبی دُنیا میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ لوگ مرتے رہتے ہیں اور دوسرے لوگ اُنکی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ سوگ منانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مرحوم خالد حسین بڑا ظریف، زندہ دِل، لطیفے باز اور کبوتر باز تھا۔ بات چیت کرتے ہوئے دو چار لطیفے سُنانا اور بامحاورہ زبان استعمال کرنا اس کا وطیرہ تھا۔ اُس کے محاورے اور ضرب المثلیں سُن کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور ادیب حضرات خوش ہو جاتے تھے۔ سب نے اُس کی رُوح کے ایصالِ ثواب اور جنت الفردوس میں نیک حُوروں کے ہاتھوں شرابِ طہورہ پینے کیلئے رب سچے سے دُعا مانگی مگر سب کو معلوم تھا کہ جس جنّت کی پیشن گوئی، مُلا اور پُجاری کرتے ہیں، وہ اُسے کبھی بھی نصیب نہیں ہوگی۔ پھر بھی دُعا مانگنے میں بھلا کسی کا کیا جاتا تھا اور اس میں حرج بھی کیا تھا۔ ٹیلی ویژن چینلوں اور اخباروں میں دو چار دِن شور و غوغا ہوا۔ پھر سب بھول گئے لیکن تعزیت کے لئے آنے والے اُس کے بچپن کے لنگوٹئے یار، ریاستی سرکار میں کام کرنے والے اُسکے ساتھی، ادیب دوست واحباب اور رشتے دار اُسکی باتیں کرتے۔ اُسکی ناکامیوں اور کامیابیوں کے قصے سُناتے، جنہیں سب دلچسپی سے سُنتے۔ کیونکہ ان میں میر امن دہلوی کے قِصہ "چہار درویش" کا رنگ چڑھا ہوتا۔ قصہ گو خالد حسین کی داستانِ حیات مختلف راویوں کی زبانی قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
(ذوقؔ)

آگ کی ندی کے تیراک

کچھ تو چہرے کی لکیروں سے بھی پڑھنا ہوگا
درد لفظوں میں کہاں سارے بیاں ہوتے ہیں

"میں خالد حسین کی بڑی بہن زبیدہ ہوں۔ میں نے اُسے پالا اور پڑھایا تھا۔ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے کارن ہوئی تباہی، قتل وغارت، عصمت دری، بربادی، کُسم پُرسی اور بدحالی کی میں آنکھوں دیکھی حقیقت ہُوں۔ اِس لئے میں خالد حسین کے بچپن اور اُس کے ساتھ جُڑے واقعات کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گی۔ ہمارے آباؤ اجداد، حسبی نسبی کشمیری پنڈت تھے۔ اور جنّتِ بے نظیر کے پُشتنی باشندے۔ ہمارا الکّڑ دادا دمودر کول ایک غریب دیہاتی تھا اور شال باف تھا۔ وہ لاہور سے آئے کِسی صوفی درویش کا مُرید بن کر اُس کی خدمت کرنے لگا۔ جب وہ درویش واپس لاہور جانے لگا تو ہمارا الکڑ دادا بھی اُس کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ اپنے مُرشد کے کہنے پر دمودر کول نے اسلام قبول کرلیا اور مُرشد نے اُسکی شادی لاہور میں آباد ایک کشمیری مُسلم خاندان کی لڑکی سے کرادی۔ اُس شادی کی نسبت سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ ایک بیٹا اور بیٹی لاہور میں ہی آباد ہو گئے جبکہ ایک بیٹا یعنی ہمارے پردادا کا باپ لاہور سے جموں آ گیا۔ وہ شال بافی کے کام کا ماہر تھا۔ اُسے رام نگر (ضلع اُدھمپور) کے راجہ نے ملازم رکھ لیا اور یوں وہ مُستقل طور پر وہاں آباد ہو گیا۔ اُس نے رام نگر میں ہی ایک کشمیری مُسلم جولاہے کی بیٹی سے شادی کرلی۔ اُس نے رام نگر کے محلے چگلی چوری میں ایک کچّا مکان بنایا اور اُس میں رہائش اختیار کی۔ اُس کے ہاں بھی دو بیٹے اور ایک

بیٹی نے جنم لیا۔ بڑے بیٹے کا نام شیخ محمد علی المعروف علیہ شیخ تھا جو ہمارا پردادا تھا۔ ہمارے دادے کا نام شیخ حبیب اللہ تھا جو پیشے سے درزی تھا لیکن شال بافی اور کنبل بُننے کا کام بھی کرتا تھا۔ جس کے لئے اُس نے گھر میں کھڈّی لگا رکھی تھی۔

ایک بار ہمارا دادا خریداری کے لئے رام نگر سے اُدہمپور آیا۔ اُس نے وہاں دبڑ (اُودہمپور کا پرانا لاری اڈہ) میں ایک کشمیری کُنبے کو دیکھا جو ہماچل کے صحت افزا مقام ڈلہوزی سے وہاں پہنچا تھا اور واپس کشمیر جا رہا تھا۔ اُس کنبے کے سربراہ کا نام جعفر علی تھا اور وہ خاندان شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ اُن دِنوں پیدل سفر زیادہ ہوا کرتا تھا اور مسافر اپنی تھکاوٹ دُور کرنے کیلیئے کچھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک ادھ دِن کیلیئے راستے میں رُک جایا کرتے تھے تا کہ ستانے اور تازہ دم ہونے کے بعد سفر جاری رکھا جا سکے۔ جعفر علی بھی اپنی بیوی اور دو جوان بیٹیوں کے ساتھ اُدہمپور میں کچھ دِنوں کے لئے رُک گیا۔ تا کہ محنت مزدوری کر کے کچھ رقم حاصل کی جائے اور اگلے پڑاؤ کیلیئے رختِ سفر باندھا جائے۔ جعفر علی شہر سری نگر کے علاقے زڈّی بل کا رہنے والا تھا اور سردیوں میں پنجاب کے کئی شہروں میں درزی کا کام کر کے روزی کماتا تھا۔ اُس کی بیوی اور بیٹیاں بھی سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔ یوں یہ کُنبہ سردیوں کا موسم پنجاب میں گذار کر اپریل کے مہینے میں کشمیر واپسی کا سفر شروع کرتا تھا۔ جعفر علی کی بیوی کا نام زینب تھا اور لڑکیوں کا نام تاج بیگم اور مالو تھا۔ جعفر علی ایک عمدہ کاری گر تھا اور سلائی کا کام دستی کرتا تھا کیوں کہ اُن دِنوں سلائی مشینیں نہیں ہوا کرتی تھیں اور درزی سینے پرونے کا کام ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ جعفر علی کوٹ اور واسکٹ بنانے کا ماہر تھا۔ جب اِس بات کا پتہ مقامی تحصیلدار کو لگا تو اُس نے کوٹ اور واسکٹ بنانے کیلیئے جعفر علی کو کپڑا خرید کر دیا۔ ایک آدھ کوٹ سینے کے بعد یہ کُنبہ سارے اُدھمپور میں مشہور ہو گیا۔ ضلع کے وزیر وزارت اور کئی دوسرے افسران نے بھی کوٹ پتلون اور دوسرے

کپڑے سینے کیلئے جعفر علی کو آگے کا سفر کرنے سے روک دیا۔ کام بڑھتا گیا۔ جعفر، زینب، تاجو اور مالو سبھی محنت کرنے لگے تا کہ جلدی کام ختم کر کے سری نگر کی طرف روانہ ہوا جائے لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جعفر علی نے رہنے کیلئے ایک کچا کوٹھا کرایے پر لے لیا۔ میرے دادا شیخ حبیب اللہ اور تحصیل رام نگر کے موضع ڈوڈو کے صاحب دین بٹ بھی وہاں آنے جانے لگے۔ قربتیں بڑھنے لگیں اور آخر دونوں جعفر علی کے داماد بن گئے۔ مالو صاحب دین بٹ کی زوجیت میں آگئی اور تاج بیگم شیخ حبیب اللہ کی منکوحہ بنی۔ بیٹیوں کی ذمہ داری سے فارغ ہو کر جعفر علی اپنی زوجہ زینب کے ساتھ سری نگر اپنے گھر زڈی بل چلا گیا اور اُنکی بیٹیاں رام نگر اور ڈوڈُو میں آباد ہو گئیں۔ شیخ حبیب اللہ ہمارا دادا تھا اور تاجو ہماری دادی جبکہ صاحب دین بٹ ہمارا نانا تھا اور مالو سوتیلی نانی۔ تاجو کے بطن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بیٹوں کے نام غلام حسین، عبدالکریم اور عبدالقیوم تھے۔ بیٹی کا نام غلام فاطمہ تھا۔ تاج بیگم ایک ذہین خاتون تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کو رام نگر سے ہجرت کرنے اور اُدھمپور میں گھر بنانے کیلئے مجبور کیا۔ یوں رام نگر کا یہ خاندان اُدھم پور میں بس گیا جہاں "سیلاں دے تلاہ" (تالاب) کے بازار کے آخر میں شیخ حبیب اللہ نے اپنا مکان بنایا۔ بچوں کو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ تاج بیگم بڑی محنتی اور سلیقہ مند عورت تھی۔ وہ خود بھی سلائی کڑھائی اور شال پر گُل کاری کا کام کرتی اور گھر گھر ہستی میں خاوند کا ہاتھ بٹاتی۔ سفید پوشی میں گھر ہستی کی گاڑی ہچکولے کھاتی رہی اور بچے پڑھتے رہے۔ تینوں بیٹوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی، ایس، سی اور بی، اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جبکہ بیٹی نے دسویں جماعت تک پڑھا۔ اُن دِنوں جموں وکشمیر میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کا دائرہ اختیار ریاست جموں وکشمیر تک بھی تھا۔ عبدالقیوم کے علاوہ باقی تینوں بھائی بہن محکمہ تعلیم میں ٹیچر لگ گئے۔ جبکہ عبدالقیوم بے روزگار تھا۔ تاج بیگم نے اپنے کماؤ بیٹوں کی شادیاں کیں۔ غلام حسین کیلئے اپنی بھانجی اور بہنوئی

صاحب دین بٹ کی بیٹی بتول بیگم کو چُنا اور عبدالکریم کی شادی اُدھمپور میں لوہاروں کے گھر کی جبکہ غلام فاطمہ کی شادی رام نگر کے محمد دین سے کردی۔ صرف عبدالقیوم کنوارہ تھا۔ ہماری دادی مذہبی خیالات والی خاتون تھی اور شیعہ مسلک پر اُس کا اندھا اعتقاد تھا۔ وہ مُحرم کے مہینے میں کسی کو نئے کپڑے پہننے نہیں دیتی تھی۔ عاشورے کی مجلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی اور مرثیے پڑھتی جبکہ دادا سُنی مسلک کے پیروکار تھے۔ بیٹوں کو سینہ کوبی نہیں کرنے دیتے تھے۔

''سیلاں کے تالاب'' محلہ میں رہنے والا یہ خاندان سُکھی جیون گذار رہا تھا کہ ملک میں آزادی کی لڑائی زور پکڑنے لگی۔ انگریز سرکار نے آزادی کی جدوجہد کو ناکام بنانے کیلئے سیاست میں مذہب اور نفرت کا زہر ملا دیا۔ ہندو، سکھ کو مسلمان سے لڑا دیا اور مسلمان کو ہندو، سکھ کے ساتھ۔ معصوم اور بے گناہوں کا قتل عام ہوا۔ گاندھی کی ''اہنساوادی'' سوچ بربادی کی حدیں چھُونے لگی۔ سردار پٹیل، نہرو اور جناح کو ہندوستان کی تقسیم کی جلدی تھی تاکہ اُن کے بخت کو جلد سے جلد تخت نصیب ہو۔ انگریز جاتے جاتے بھارت کی دھرتی پر ایک ایسی لکیر کھینچ گیا جو پھر مِٹ نہ سکی۔ عوام کی رُوح کانٹوں کی تار نے چھلنی کردی۔ بنگال تقسیم ہو گیا لیکن بنگالی زبان، تمدن، گیت، سنگیت اور لوک ورثہ اور بنگالی ادب تقسیم نہیں ہوسکا۔ پنجاب تقسیم ہوا۔ ہندو، مُسلم اور سکھ کے نام پر پنجابیوں نے پنجابیوں کو برباد کیا۔ عصمتیں لوٹیں۔ گھر اُجڑے پھر بھی پنجابی زبان، لوک ورثہ اور ثقافت تقسیم نہیں ہوسکے۔ صوفی سنتوں کا کلام تقسیم نہیں ہوسکا۔ ہمارے صوفی بابے ہماری رُوح کا حِصہ ہی رہے۔ بابا فریدؔ، بابا نانک، مادھو لعل حسین، سلطان باہُو، دمودر، ہاشم، وارث، پیلو، قادر یار، بُلھے شاہ اور میاں محمد بخش بانٹے نہیں جاسکے۔ سیاست دانوں اور مذہبی جنونیوں نے پنجاب کے پانیوں کو لہو سے رنگ دیا۔ انسان مر گیا۔ انسانیت شرمندہ ہوئی۔ گرنتھ، قرآن شرمسار ہوئے۔ گیتا اور رامائن چلائی۔ دوشیزائیں وارث شاہ سے فریاد کرنے لگیں۔ پردے والیاں ننگی ہوئیں۔ لاکھوں مرے، کروڑوں مہاجر بنے۔ یہ

سوغاتیں تقسیم نے ہماری جھولی میں ڈالیں۔

جموں اور کشمیر بھی تقسیم ہوا۔ بلتی اور دردّی تمدن تقسیم ہوا۔ لداخ اور کرگل یہاں رہ گئے۔ اسکردُو، گلگت، اُدھر چلے گئے۔ کیرن، کرناہ، اوڑی، پونچھ اور راجوری تقسیم ہو گئے۔ مظفر آباد، میر پور، کوٹلی، بھمبر، حویلی، باغ، سدھنوتی ہم سے الگ ہوئے۔ ہماری ریاست اٹوٹ انگ اور شہ رنگ کے بھنور میں پھنس گئی۔ اُدھمپور کی دیوک ندی، جموں کا دریائے توی، سانبہ کی بسنتر ندی اور کٹھوعہ کی اُجھ ندی انسانی لہو سے لال ہوئی۔ اُدھمپور، ریاسی، جموں، کٹھوعہ، میر پور، باغ، کوٹلی، مظفر آباد، پلندری اور حویلی نے خُون کے پیالے پیئے۔ سیاست اور مذہب کے نام پر شیطانوں نے انسانوں کو قتل کیا۔ دہشت، وحشت اور غارت کا ننگا ناچ ہوا۔ ہمارا دادا شیخ حبیب اللہ، باپ ماسٹر غلام حسین، چچا عبدالکریم اور عبدالقیوم، چچی اور اُس کا ننھا بیٹا، پھوپھا محمد دین اور ہمارے دو بھائی فرقہ وارانہ فساد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہماری پھوپھی غلام فاطمہ، اُسکی پانچ بیٹیاں، میرے بھائی محمد اسحاق اور خالد حسین، میں اور ہماری ماں بتول بیگم بچ گئے۔ پھوپھی نے اپنی بیٹیوں کو واقف کار اور ہمدرد ہندو بھائیوں کے حوالے کر دیا اور اُنھیں کہا کہ اگر ہم بچ گئے تو اپنی امانت واپس لے لیں گے۔ ورنہ میری بچیاں آپ کی ہوئیں۔ ان کی پرورش اور شادیوں کی ذمے داری آپکے ذمے ہوگی۔ اس طرح پھوپھی ہمارے ساتھ ہولی۔ ''سیلاں کے تالاب'' میں ہمارا ہمسایہ لالہ امرناتھ شرما وکیل تھا۔ وہ ہمارے باپ کا بچپن کا دوست اور ہم جماعتی تھا۔ دونوں نے اکٹھے گریجویشن کی تھی۔ لالہ امرناتھ شرما وکالت کی پڑھائی کے لئے علی گڑھ چلا گیا تھا جبکہ ہمارے والد نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس نوکری شروع کی تھی۔ فسادات میں بلوائیوں نے ہمارا مکان جلا دیا تھا اور گھر کا سامان لوٹ لیا تھا۔ ہم کُسم پُرسی کی حالت میں تھے۔ تبھی ہماری پھوپھی نے اپنے بھائی یعنی ہمارے والد کے بچپن کے دوست لالہ امرناتھ شرما کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تا کہ ہمیں پناہ مِل سکے۔ لالہ امرناتھ راشٹریہ سیوک سنگھ کا مقامی

سنچا لک تھا لیکن ہمارے والد ماسٹر غلام حسین کی دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے اُس نے ہمیں اپنے گھر میں دِن گذارنے دیا اور اندھیرا ہوتے ہی اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ ہمیں اپنے گاؤں جگانو والے گھر مُنتقل کر دیا جہاں اُسکا چوکیدار رہتا تھا۔ چوکیدار ذات کا ڈوم (بروالا) تھا۔ اُس نیک آدمی نے ہمیں کھانے کے لئے سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی دی۔ پھر ہمیں چوپایوں کو رکھنے والی کھُرلی میں چھپا دیا۔ ہماری ماں اُمید سے تھی اور اللہ کی شان کہ گیارواں مہینہ لگا ہوا تھا۔ قدرت کا یہ کمال تھا کہ نو مہینے ختم ہونے کے باوجود بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اُسی رات مویشیوں کی کھُرلی میں ماں نے اپنے چوتھے بیٹے کو جنم دیا۔ وہ بچہ اصل میں ہماری زندگی کا پیغام لے کر آیا تھا، کیونکہ دوسرے روز بلوائیوں نے ہمیں آن دبوچا۔ شاید ہماری مخبری ہوئی تھی۔ بلوائیوں نے چوکیدار سے پوچھا کہ مُسلوں کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ جب چوکیدار نے ہماری موجودگی سے صاف انکار کیا تو اُسکی خوب پٹائی کی گئی۔ انہوں نے ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا اور سزا کے طور پر تلوار کے ایک وار سے چوکیدار کی گردن اُسکے دھڑ سے الگ کر دی۔ اوپر والی منزل کا شور شرابہ سُن کر ہم سب رونے لگے۔ ہماری چیخیں سُن کر بلوائی کھُرلی کے اندر آگئے جہاں اُنہوں نے ہماری ماں کی گود میں نوزائدہ بچہ دیکھا جو رات کو پیدا ہوا تھا اور وہ سمجھ گئے کہ زچگی کی وجہ سے زچہ ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے میرے بھائیوں کو پکڑ لیا۔ جب وہ محمد اسحاق اور خالد حسین کو لے جانے لگے تو ہماری ماں ایک شیرنی کی طرح گرجی۔ ہماری پھوپھی اور ماں دونوں فسادیوں کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور ماں کہنے لگی۔ ”میں آپکو اپنے بچے لے جانے نہیں دُوں گی۔ اگر آپ نے اِنکو مارنا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے مارو۔ ہم سب کو ختم کر دو لیکن میں اپنے بچے خود سے ہر گز جُدا نہیں ہونے دُوں گی۔“۔

بلوائی آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ”زچگی کی حالت میں اِن عورتوں نے کہاں جانا ہے۔ اس لئے کچھ دِنوں بعد آکر اِن کا صفایا کر دیں گے“۔ بلوائیوں کے جانے

کے بعد ہماری پھوپھی اور ماں نے فیصلہ کیا کہ اندھیرا ہوتے ہی وہ یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔ ماں اور پھوپھی نے ہماری مُسلم شناخت ختم کرنے کیلئے چوکیدار کے گھر سے لال سیاہی کی ٹکیہ لی اور اپنے ماتھے پر بِندی بنائی۔ اسحاق اور خالد کے ماتھے پر بھی قشقہ کھینچا۔ پھر ہم سب ایک نئے سفر کو چل پڑے۔ ساری رات بُھو کے پیاسے چلتے رہے اور صبح ایک گاؤں میں پہونچے جہاں ایک شخص نے ہمیں پہچان لیا اور پھر گاؤں والوں نے ہمیں گھیر لیا۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں اور ڈنڈے تھے۔ پھوپھی غلام فاطمہ ہمیں بچانے کیلئے اُن سے اُلجھ پڑی اور کہنے لگی۔

''ہندو دھرم میں کہاں لکھا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کر دو۔ بلکہ دُنیا کے کِس مذہب میں لکھا ہے کہ ابلا عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اُٹھایا جائے''۔ پھوپھی نے اُنھیں گیتا کے شلوک سُنائے۔ رامائن اور گورو گرنتھ صاحب سے حوالے دیئے۔ ہماری پھوپھی کی باتیں سُن کر گاؤں والوں نے ہمیں جانے کیلئے راستہ دے دیا۔ یوں دو بیوائیں اور بچے وہاں سے بچ کر نکل گئے۔ ہماری گھر ہستی اُجڑ چکی تھی۔ گھر جل چُکا تھا۔ اپنا کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ بے چارگی کے عالم میں ہمارا چھوٹا سا قافلہ بارتا کے جنگل میں جا کر چھُپ گیا۔ جہاں ہم جنگلی بیر، گرنے، امرُ ودا اور پتے کھا کر گذارا کرنے لگے۔ کُچھ دِنوں کے بعد حالات سُدھرنے لگے۔ شیخ محمد عبداللہ نے ریاست کے ایڈمنسٹریٹر کا چارج سنبھال لیا تھا اور بخشی غلام محمد کی سربراہی میں امن قائم کرنے والی ''پیس برگیڈ'' پورے جموں صوبے میں پھیل گئی تھی اور موت سے ڈرتے اور زندگی کی تلاش میں بھاگتے لوگوں کو ڈھونڈنے لگی تھی۔ ہمیں بھی تلاش کر لیا گیا اور محلہ اُستاد میں بنے رفیوجی کیمپ میں لا کر رکھا گیا۔ بعدازاں تقریباً پچیس ہزار پنجابی، ڈوگری، پہاڑی اور گوجری بولنے والے مُسلم مہاجروں کو سری نگر کے رفیوجی کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ ہمیں نیلم سنیما کے پاس کھُلے میدان میں بنائے گئے کیمپ میں رکھا گیا۔ اسی طرح میرپور، مظفر آباد، باغ، حویلی، پلندری، کوٹلی اور بھمبر سے آئے ہندو، سکھ شرنارتھیوں کو جموں، سانبہ،

کٹھوعہ، پنجاب اور دہلی کے کیمپوں میں پناہ دی گئی۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ہماری پھوپھی کو ہی کیمپ کمانڈر بنادیا گیا۔ میری عُمر اُس وقت نو سال تھی۔ محمد اسحاق سات سال کا تھا جبکہ خالد حسین پونے تین سال کا تھا۔ گیارویں مہینے میں پیدا ہونے والا ہمارا فرشتہ بھائی فوت ہو چکا تھا۔ ہمارا بچپن سری نگر میں گذرا۔ ہماری ابتدائی تعلیم بھی سری نگر کے سکولوں میں ہوئی۔ باپ کی فیملی پنشن، جی۔ پی فنڈ اور انشورنس کلیم کی رقم سے ہماری پرورش ہونے لگی۔ ماں کپڑے سینے کا کام جانتی تھی، اس لئے گھر آسودگی سے چلنے لگا۔ پھوپھی نے اپنی سبھی بچیاں برآمد کرالی تھیں۔ اُسے سری نگر کے محلہ شہید گنج میں کسٹوڈین کا ایک مکان الاٹ ہوا تھا اور وہ وہاں اپنی بچیوں کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ سری نگر کے کئی سکولوں میں ٹیچر رہی۔ اُس نے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُن کو سرکاری نوکریاں دلوائیں۔ اچھے گھروں میں اُنکی شادیاں کرائیں۔ سری نگر کی نئی کالونی جواہر نگر میں ایک کنال کا پلاٹ الاٹ کروایا اور مکان بنایا اور حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔ پھوپھی ہمیں بہت پیار کرتی تھی۔ محمد اسحاق اور خالد حسین کو دیکھ کر رونے لگتی اور ہر کسی سے کہتی کہ یہ میرے شہید بھائی کی نشانیاں ہیں۔ وہ آخری دم تک اپنے بھائیوں کو یاد کرتی رہی اور ہمارے گلے لگ کر روتی رہتی۔ اللہ اُسے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُسکی رُوح کو سکون بخشے۔

1947ء کی شورش میں ہماری والدہ 35 (پینتیس) سال کی تھی۔ لوگوں کی بُری نظر سے بچنے اور ہمارے لئے سہارا بننے کیلئے اُس نے شادی کرلی اور سوچا کہ گھر میں ایک مرد کے ہونے سے بچوں کو باپ مل جائے گا اور اُنھیں کوئی بُری آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ ہمارے سوتیلے باپ کا نام شُکر اللہ خان تھا۔ اُس کا خاندان میرپور سے آکر سری نگر میں آباد ہوا تھا۔ اُس کا باپ عبداللہ خان محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ ہمارا سوتیلا باپ خود بھی سرکاری ملازم تھا اور دربارمُو کی وجہ سے سردیوں کے چھ مہینے ہم جموں رہتے اور گرمیوں کے چھ مہینے سری نگر میں۔ جموں میں ہمیں

محکمہ کسٹوڈین کا چھوٹا سا مکان الاٹ ہوا تھا جس میں صرف دو کمرے اور ایک رسوئی تھی۔ جبکہ سری نگر میں ہم بٹہ مالو باراں پتھر میں شُکر اللہ خان کے مکان میں رہتے تھے۔ ہمارے گھر کے بالکل سامنے برگیڈیئر خُدا بخش کا مکان تھا، جن کا ایک بیٹا تاج محی الدین خالد حسین کے بچپن کا دوست تھا۔ خالد حسین کا داخلہ بٹہ مالو کے سرکاری پرائمری سکول میں کرایا گیا جو تاج محی الدین کے ننھیال کے ایک مکان میں کھولا گیا تھا۔ اُس سکول میں خالد حسین کی پڑھائی پانچویں جماعت تک ہوئی۔ ایس، پی ہائی سکول سری نگر سے خالد نے دسویں تک تعلیم حاصل کی۔ سری نگر میں پڑھنے اور کشمیری بچوں کے میل جول کی وجہ سے خالد حسین کشمیری زبان اچھی طرح سے بول سکتا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد مجھے سرکاری نوکری مل گئی۔ میں بھی گرلز مڈل سکول میں ٹیچر لگ گئی۔ یوں گھر کے حالات آسودہ ہو گئے۔ ماں نے مزید دو بچوں کو جنم دیا۔ یعنی ہمارا بھائی محمد ایوب خان اور بہن مسرت شیریں۔ باپ کے مرنے کے بعد اِن دونوں بھائی بہن کی پرورش کی ذمہ داری ہم سب نے مِل کر نبھائی۔

خالد حسین بچپن میں بڑا شرارتی تھا لیکن پڑھنے لکھنے میں ہوشیار۔ میٹرک کرنے کے بعد اُسے کلرک کی نوکری مل گئی۔ خالد حسین نے سری نگر میں اپنا مکان بنایا۔ میری شادی کشمیری بٹ خاندان میں ہوئی، اور میں میکے سے سُسرال میں آ گئی۔ میرے چار بچے ہیں۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ اللہ کے فضل سے سب آباد ہیں۔ خالد حسین بھی اپنے گھریلو فرائض عمدہ طریقے سے نبھاتا رہا۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے
(افتخار عارف)

گہرے رنگ یادوں کے

شرطیں لگائی جاتیں ہیں دوستی کے ساتھ
کیجئے مجھے قبول میری ہر کمی کے ساتھ
(وسیم بریلوی)

میرا نام نصیر احمد میر ہے۔ میں خالد حسین کے بچپن کا دوست ہُوں۔ ہم دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ میرا باپ بھی سرکاری ملازم تھا اور وہ بھی دربارمُو کے ساتھ چھ مہینے سری نگر اور چھ مہینے جموں میں رہتا تھا۔ ہم گرمیوں کے مہینے کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں میں گزارتے اور سردیوں کے چھ مہینے جموں میں۔ دربارمُو ملازموں کیلیئے ایسے سرکاری سکولوں کا انتظام تھا کہ وہ اپنی پڑھائی بنا رکاوٹ جاری رکھ سکیں۔ سری نگر کے بٹہ مالو (باراں پتھر) محلے کے بالکل سامنے کمپنی باغ (جہاں آجکل فائر برگیڈ اور پولیس کے دفاتر ہیں) میں ہم ہاکی کھیلتے، گیند چکر کھیلتے اور کبھی کبھی تاش بھی کھیلتے۔ کمپنی باغ کے بغل میں بہت سے کھیت تھے۔ شمشان گھاٹ کرن نگر سے لے کر کمپنی باغ تک سبزیاں اُگائی جاتی تھیں۔ جنہیں کھیت مالکان بازار میں بیچا کرتے تھے۔ ہم جب کھیلتے ہوئے تھک جاتے اور بھُوک سے نڈھال ہوجاتے تو اِن کھیتوں میں شلغم، مولیاں، گاجریں اور کرم کی مُنڈیاں چوری کرتے اور پانی سے دھو کر کھاتے۔ کمپنی باغ میں املوک توڑ کر کھاتے۔ کئی بار سبزیاں اُگانے والے ارائیں ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کرتے لیکن ہم بھاگ جاتے۔ اُن کے ہاتھ نہیں آتے۔ آج کا بال گارڈن، سُتھراشاہی اور کرن نگر کی کالونیاں اصل میں انہی کھیتوں پر بنی

ہیں۔سری نگر کا سیول سیکرٹریٹ ہمارے بچپن میں زنانہ پارک ہوا کرتا تھا۔اس میں رنگ برنگے پھول، سیب، ناشپتی، آلو بخارے، خُوبانی، چیری اور مُشک بید کے درخت تھے۔ ہم لوگ مالی کی نظر بچا کر پارک میں گھُس کر پھل کھایا کرتے تھے جب کبھی ہم میں سے کوئی مالی کے ہتھے چڑھ جاتا تو مالی اُس سے پھلوں کے پیسے مانگتا اور پیسے نہ دینے پر اُسے پکڑ کر اُسکے گھر لے جاتا اور والدین سے رقم کا تقاضا کرتا۔ مالی کے جانے کے بعد مولا بخش سے اُس کی خاطر تواضع کی جاتی۔

گیند چکر، انگریزی کھیل بیس بال سے ملتا جُلتا ایک کھیل تھا۔ میدان کے چار کونوں سے چار دائرے بنائے جاتے اور بیچ میں بلّے سے گیند کو کھیلا جاتا۔ یہ کھیل دو ٹیمیں بنا کر کھیلا جاتا جس میں 9-9 کھلاڑی ہوتے۔ایک ٹیم ٹاس جیت کر پہلے کھیلتی۔گیند کو مارنے کے بعد کھلاڑی دوڑ کر پہلے یا دوسرے دائرے میں پہونچ جاتا جبکہ دوسرا کھلاڑی بال کھیلنے کے لئے آجاتا۔ اگر مخالف کھلاڑی گیند کو روک کر دوڑتے ہوئے کھلاڑی کو گیند مارتا اور اُسے دائرے میں پہنچنے سے پہلے لگ جاتا تو وہ آوٹ قرار دیا جاتا۔ اگر بنا آوٹ ہوئے سبھی کھلاڑی چاروں دائروں سے گذر جاتے تو وہ ٹیم جیت جاتی۔ ہمارے بچپن میں یہ کھیل کشمیر میں عام کھیلا جاتا۔لیکن آج یہ کھیل ریاست میں کہیں بھی نہیں کھیلا جاتا۔جموں میں ہم سنتولیا، گُلی ڈنڈا، کینچے، اتڑ پتڑ، کبڈی اور گاگر پھیسی جیسی گیمیں کھیلا کرتے۔

بچپن میں خالد حسین بڑا تیز طرار، چُست اور پھُرتیلا ہوا کرتا تھا۔ وہ راشن کی سرکاری دُکان سے پچاس کلو آٹا یا چاول کا توڑا کندھے پر اُٹھا کر گھر لے آتا۔ اسی طرح راشن کارڈ سے ملنے والا بالن بھی خود اُٹھا کر لاتا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ گھریلو کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ خالد حسین کو فلمیں دیکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اُن دنوں جموں میں صرف دو سینما تھیٹر تھے۔اُتم ٹاکی اور ہری ٹاکی۔ بعد میں شنکر ٹاکی اور جیول سینما بنے۔اُس کے بعد اپسرا،

سورن، کے، سی اور اندرا تھیٹر تعمیر ہوئے۔ ہری اور اُتم تھیٹر میں ہندوستانی اور پاکستانی پنجابی فلمیں دِکھائی جاتی تھیں۔ہم سب دوست یہ پنجابی فلمیں دیکھا کرتے۔ مُکھڑا، چن ماہی، دُلا بھٹی، لارے، پتن، یکے والی، کرتار سنگھ، مرزا صاحباں، ہیر رانجھا، شیخ چلّی (پاکستانی)، چمن، کوڈے شاہ، دولچھیاں، گُڈی، پوستی، بھنگڑا (ہندوستانی) اور بے شمار فلمیں ہم نے 1965ء تک دیکھیں۔اُس کے بعد سرکار نے پاکستانی فلموں پر پابندی لگادی۔اِن فلموں کو دیکھ کر خالد حسین اکثر ان کے مکالمے زبانی یاد کرتا۔اور پھر ہمیں سُناتا۔ان فلموں کے گیت سُن کر اُس پر وجد طاری ہو جاتا۔اس کے علاوہ لاہور ریڈیو سے مشہور پنجابی پروگرام ''راوی دِیاں چھلّاں'' وہ تواتر سے سُنتا۔اُس پروگرام کے ایک کردار نظام دین کی بامحاورہ پنجابی زبان کا وہ شیدائی تھا۔جموں ریڈیو سے بھی اُن دنوں روزانہ پنجابی پروگرام نشر ہوتا جس میں جموں کا ہی ڈرامہ نگار محمود احمد ہفتہ وار پنجابی ریڈیائی ڈرامے پیش کرتا۔اُس کے ڈراموں میں دو اہم کردار نبھانے والے آرٹسٹ کرشن اور بلدیو تھے۔تقریباً 25 سال تک محمود احمد کے ڈرامے لوگوں کے ذہن ودِل پر چھائے رہے۔خالد حسین کے پنجابی ادیب بننے میں اِن فلموں اور ریڈیائی ڈراموں کا اہم رول تھا۔ 1950ء تا 1965ء محمود احمد کے ریڈیائی ڈراموں نے سرحد پار بھی دھُوم مچائی تھی۔نُوردین سریل کے علاوہ گھکو داویاہ، ہاشم دا پکھا، نُوردین نے تھیٹر کھیولیا، نُوردین نے جہاز چلایا، نُوردین نے کرکٹ کھیڈیا وغیرہ ریڈیائی ڈرامے پنجابی پروگرام کی پہچان تھے۔

''راوی دیاں چھلّاں'' اور محمود احمد کے ریڈیائی ڈراموں نے خالد حسین کو زبان کی باریکیاں سکھائیں۔اُس نے کسی سکول، کالج یا یونیورسٹی سے پنجابی نہیں سیکھی تھی۔اُس نے پنجابی، اُستاد محلے کے کام گروں یعنی لوہار، ترکھان، پانڈی، کوچوان، نائی اور قصائی طبقہ کے بزرگوں سے سیکھی۔یہی لوگ اُس کے اُستاد تھے کیونکہ اِن لوگوں کا لسانی رویہ خالص تھا۔کسی

دوسری زبان کی ملاوٹ سے پاک۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب خالد حسین نے لکھنا شروع کیا تو اُسکی تحریریں ہنداور پاک کے پنجابی ادبی جرائداور اخباروں میں چھپنے لگیں۔

خالد حسین بچپن میں بڑا مضبوط اور سخت جان تھا۔ جب کبھی دوسرے محلے کے لڑکوں سے مقابلہ آرائی ہوتی تو وہ ہمیشہ اگلی صف میں کھڑا ہوتا۔ کیونکہ ٹکر مارنے میں وہ بڑا ماہر تھا۔ کئی بار ہم نے اُسے چھوٹی اینٹ کو ٹکر سے توڑتے دیکھا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ محلے کے سبھی ہم عمر لڑکے اُسکے ساتھ دوستی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ سینما ٹکٹ نکالنے کا بھی ماہر تھا۔ اُن دنوں سنیما کی تیسری کلاس کی ٹکٹ ساڑھے نو آنے کی ہوا کرتی تھی، اور ہمیں اُسکی ٹکٹ کے پیسے بھی دینے پڑتے تھے تا کہ وہ ہماری ٹکٹیں نکالنے کیلئے آمادہ ہو جائے۔ ورنہ بلیک میں ٹکٹ بڑی مہنگی ملتی تھی۔ وہ نئی فلم لگنے پر پہلا دِن، پہلا شو دیکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ کئی بار وہ ہماری ٹکٹیں نکال کر ہمیں ہال کے اندر بھیج دیتا تا کہ جگہ رکھی جا سکے اور خود وہ کچھ ٹکٹیں بلیک کر کے ہمارے لئے مُنگ پھلی، ریوڑیاں وغیرہ خرید کر لاتا اور ہمیں کھلاتا۔

مجھے یاد ہے، جب 1960 میں ''جنگلی'' فلم ریلیز ہوئی تو فلم کا تیسرا شو دیکھنے ہم سبھی دوست ہری تھیٹر پہنچے۔ وہ شب قدر کی رات تھی اور ہم شب بیداری کیلئے مسجد میں بیٹھے تھے۔ عشا کی نماز پڑھی جا چکی تھی۔ اب مولانا وعظ فرما رہے تھے۔ اُنکی گفتگو میں دم نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دوست نے اشارے سے مجھے باہر بلایا اور ''جنگلی'' فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے خالد حسین سے مشورہ کیا اور یوں ایک ایک کر کے ہم چار یار مسجد سے نکلے اور ہری سنیما جا پہونچے۔ اور فلم دیکھ کر دوبارہ مسجد میں آ گئے۔ اُن دِنوں بجلی کے پنکھے محلے کے چند امیر گھروں میں ہی لگے ہوتے۔ باقی لوگ گرمیوں میں چھتوں پر چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے اور تقریباً سب کے ہاتھ میں جھولنے کیلئے پنکھی ہوتی۔ چارپائی پر چادر گیلی کر کے بچھائی جاتی تا کہ نیند آ جائے۔ جب چادر سُوکھ جاتی تو دوبارہ یہ عمل دُہرایا جاتا۔ لڑکے

آدھی آدھی رات تک برگد یا پیپل کے پیڑ کے نیچے گپ شپ کرتے رہتے کیونکہ شدّت کی گرمی کی وجہ سے لُو چلتی اور سونا محال ہوتا۔ 1960-61ء میں خالد حسین نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور محکمہ دیہات سُدھار میں کلرک بھرتی ہوگیا۔ اُس کا جنم پہلی اپریل 1945 کو ہوا تھا اور یوں وہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں سرکاری ملازم بنا تھا۔ ستمبر 1960ء میں اُسے ورک مستری بنایا گیا کیونکہ تب تک اُس کا میٹرک کا رزلٹ نہیں نکلا تھا۔ نتیجہ نکلنے کے بعد 7اگست 1961ء کو اُسے کلرک بنا دیا گیا۔ تین سال تک اُس کی سروس بُک نہیں بن سکی کیونکہ وہ نابالغ تھا۔ 18 سال پورے ہونے کے بعد ہی اُسکی ملازمت پکی کی گئی۔ گھر کے حالات کی وجہ سے وہ کلرک بن گیا جبکہ اُسکے دوست تاج محی الدین اور میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ 19 سال کی عمر میں خالد حسین کی شادی ہوگئی۔ شادی پر ہم دونوں نے پگڑیاں بدلی تھیں اور دوستی کو بھائی کے رشتے میں باندھا تھا۔ اُسکی شادی تحصیل رام نگر کے موضع دُھونہ لاٹی کے سعید اللہ ملک کی دختر نسیم فردوس سے ہوئی۔ خالد کے ننھیال لاٹی سے 18 کلومیٹر آگے ڈوڈو میں تھے۔ سعید اللہ ملک کے پردادا مختار ملک (مختۂ ملک) کشمیر کے قصبے شوپیاں سے ہجرت کر کے لاٹی میں آباد ہوئے تھے۔ اُن دِنوں شادیوں اور دعوتِ ولیمہ پر گوشت والا پلاؤ، زردہ (میٹھے چاول) اور روغن جوش کا سالن پکایا جاتا۔ جبکہ تیل مہندی والی شام کتلمے اور نمکین چائے سے تواضع کی جاتی اور جاتی بار مہمانوں کو بتاشے دیئے جاتے۔ اُن دِنوں سونا بارہ ماسے کا تولہ ہوتا تھا اور فی تولے کی قیمت 130 روپے تھی۔ جو اُن دِنوں بھی مہنگا لگتا تھا۔ خالد حسین کی شادی 12 جنوری 1964ء کو ہوئی تھی۔ اُن دِنوں رواج تھا کہ جو اشخاص دعوتِ ولیمہ میں شامل نہ ہو سکے ہوں اُن کے گھروں میں سمالہ (تانبے کی بڑی تھالی میں پلاؤ اور زردہ ڈال کر محلے والوں کو بھیجا جاتا) بانٹنے کا کام نوجوانوں کے سپُرد کیا جاتا اور ہم بڑی خوشی سے اور خوش اسلوبی سے اس کام کو انجام دیتے۔ کیوں کہ سمالے کی تھالی سے ایک آدھ گوشت کی

بوٹی کھانا اور کبھی کبھی پوری تھالی پر ہاتھ صاف کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے۔

خالد حسین گھرہستی کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانے لگا۔ پونے تین سال کے بعد اُس کے ہاں ایک بچی نے جنم لیا۔ اُس کا نام سمیہ تبسم رکھا گیا۔ اس بچی نے خالد کی آوارہ گردی اور خرمستی پر کچھ وقت کے لئے روک لگا دی۔ یہ احساس جاگنے پر کہ وہ ایک بچی کا باپ ہے، اور آنے والے وقت میں اُس کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جائیں گی، اُس نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ادیب فاضل کشمیر یونیورسٹی سے کرنے کے بعد اُس نے پارٹ ٹائم پرائیویٹ کالج میں داخلہ لیا جس کی تحریک اُس کے ایک دوست ششی کانت شرما نے دی تھی۔ نوکری کے ساتھ ساتھ اُس نے پڑھائی بھی جاری رکھی اور 1970ء میں بی، اے پاس کر لیا۔ 1972ء میں اُس نے صحافت میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ وہ اپنی گھرہستی کو خوشحال بنانے کیلئے پارٹ ٹائم اخبارات کی ادارت کرتا رہا۔ جموں میں اُس نے روزنامہ ''سندیش''، روزنامہ ''وقت'' اور روزنامہ ''عمارت'' کی ادارت کی اور سری نگر میں روزنامہ ''زمیندار''، روزنامہ ''روشنی'' اور روزنامہ ''پولٹیکل ٹائمز'' کی ادارت کی۔

یہاں میں قارئین کو کچھ سال پیچھے لے جانا چاہتا ہوں۔ یہ بات ستمبر 1965ء کی ہے۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ زوروں پر تھی۔ پاکستانی لڑاکو جہاز ''سیبر جیٹ'' جموں کے آسمان پر چیلوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ بھارتی فوجیں سیالکوٹ اور لاہور کے کئی دیہاتوں پر قبضہ کر چکی تھیں۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ ٹینکوں اور توپوں سے آگ برس رہی تھی۔ پاکستانی فوج نے چھمب جوڑیاں پر قبضہ کر لیا تھا اور حاجی پیر پر بھارتی فوج قابض تھی۔ پاکستانی توپوں کے گولوں سے جموں میں مکانوں کے شیشے ٹوٹ رہے تھے۔ گولے بیچ شہر گر رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ ہندو اور سکھ ہماچل اور ہریانہ یا دہلی جا رہے تھے جبکہ مسلمان کشمیر کی طرف۔ میرا اور خالد حسین کا کُنبہ بھی مہاجر بن کر سری نگر پہنچ گیا۔ سری نگر میں خالد کے احباب

اور یارِ گار بڑی گنتی میں تھے۔ بٹہ مالو (باراں پتھر) کی جرنیلی سڑک (جواوڑی تک جاتی ہے) کے کنارے ریٹائرڈ سیشن جج قاضی نظام الدین کا مکان تھا۔ جج صاحب اپنے اہل خانہ کے ہمراہ جموں میں رہائش پذیر تھے اور سری نگر والے مکان کی حکومت اُن کے بڑے بیٹے قاضی نصیر الدین کے ہاتھ میں تھی جو وہاں اکیلے رہائش فرما رہے تھے تاکہ یار دوستوں کی محفلیں سجتی رہیں۔ میں یعنی نصیر احمد میر، خالد حسین، تاج محی الدین، شجی احمد، شجاع سلطان اور رام لال وغیرہ اِن محفلوں کی ''جند جان'' تھے کیونکہ ہم سب پنجابی بولنے والے کلاکار تھے اور قاضی نصیر کے تکیہ پر ہند، پاک سیاست، کشمیر کی تاریخ اور دیگر مسائل پر پُرمغز تبصرے کیا کرتے تھے۔ گپ بازی اور لطیفہ بازی کی بھرپور نشستیں ہوتیں۔ سگریٹ، دارُو اور ہانڈی گوشت سے تواضع ہوتی۔ ہانڈی میں پکنے والا گوشت خالص دیسی مرغے کا ہوتا، کیونکہ اُن دنوں ولائتی مرغوں کا چلن نہیں تھا اور یہ دیسی مرغے اکثر چوری کے ہوتے۔ آج کی طرح اُن دنوں بھی پوری کشمیر وادی میں کرفیو لگا رہتا۔ چنانچہ اپنے محلے میں شب خون مارنا آسان ہو جاتا۔ اس میں سارا قصور مرغوں کا ہوتا جو کرفیو میں بھی آوارہ گردی کرتے اور ہمیں مجبوراً اُنہیں پکڑنا پڑتا۔ خیر۔۔۔ قاضی نصیر صاحب مرغوں کو کشمیری چھری سے حلال کرتے اور خود ہانڈی پکانے کا ثواب بھی حاصل کرتے۔ مرغوں کے پر اور دیگر فضولیات لفافہ میں بند کر کے دُور شمشان گھاٹ کے پاس دِن کے اُجالے میں پھینک آتے۔ آپریشن جبرالٹر کے تحت پاکستانی مِلی ٹینٹ اُن دِنوں بھی براستہ پونچھ، لورن، کشمیر میں آئے تھے اور جب اُن کا پڑاؤ توش میدان میں تھا تو ایک خالص قوم پرست گوجر محمد دین نے اُن کی اطلاع فوجی افسران کو دی اور پدم شری کا تاج اپنی پگڑی پر سجایا۔ جنگ بند ہونے پر مہاجر اپنے اپنے گھروں کو واپس آئے۔ ہم لوگ بھی سری نگر سے جموں آ گئے۔ سری نگر میں ہم پنجابی دوستوں کا ٹھکانہ ریذیڈنسی روڈ پر بنا ''کافی ہاؤس'' ہوتا۔ ''کافی ہاؤس'' میں کافی کی چُسکیوں کا سلسلہ

1989ء میں بند اہوا جب ملی ٹینسی نے مضبوطی سے ریاست میں اپنے قدم جمائے۔ ''کافی ہاؤس'' کے دِن بڑے یادگاری تھے۔ گپ شپ ہوتی، کاروباری لوگ کافی کے کپ پر لاکھوں کا بیوپار کر لیتے۔ ہم کھلنڈرے دوست کسی نہ کسی مرغے کو پھنسا کر کافی ہاؤس لاتے اور کانتی کباب کھاتے۔ کبھی کبھی تاج محی الدین ہمیں احدُ و ہوٹل میں وازوانی لنچ بھی کراتا۔ کافی ہاؤس کی رونقیں ملی ٹینسی نے ختم کر دیں۔ لیکن وہ بے فکری کا سُنہری زمانہ ہمیں آج بھی یاد آتا ہے۔ گریجویشن کرنے کے بعد خالد حسین نے کلرکی کا چولا اُتارنے کا فیصلہ کر لیا اور اچھی نوکری کے لئے انٹرویو دینے لگا۔ وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مئی 1970ء میں اُس کے گھر دوسری بیٹی ھُما تبسم پیدا ہوئی اور 25 دسمبر 1972ء کو بیٹا ذاکر حسین پیدا ہوا۔ خالد حسین نے اپنا پہلا مکان زیارت بٹہ مالو میں بنایا۔ پھر جموں میں باغ باہو کے قریب اوقاف کالونی میں دو کمروں پر مشتمل ایک مکان بنایا۔ پھر دونوں مکان بیچ کر آلوچہ باغ سری نگر میں دو کنال زمین خریدی۔ اُسے بھی بیچ کر آزاد بستی نٹی پورہ میں ایک تعمیر شدہ مکان خریدا۔ تب کشمیر میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تھا اور کشمیری پنڈت کشمیر سے ہجرت کرنے لگے تھے۔ خالد حسین نے نٹی پورہ والا مکان فروخت کر دیا اور مستقل طور پر جموں میں آبسا۔ کچھ دیر وہ اُستاد محلے کے پُرانے مکان میں رہا۔ پھر اُس نے گوجر نگر کالونی میں نیا مکان بنایا اور وہاں رہائش اختیار کی۔ مرتے دم تک خالد حسین کا اپنے دوستوں کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ وہ اپنے دوستوں کے دُکھ سُکھ کا ساتھی بنا رہا اور اُن کا مددگار بھی۔

''معراج عالم'' اور ''عید میلاد النبیؐ'' کے متبرک موقعوں پر ہم سب دوست شب بیداری کیلئے اُستاد محلے کی مسجد وزیرنی (مسجد الہجری) میں جاتے۔ نماز پڑھتے، نفل ادا کرتے۔ ایک آدھ سپارہ بھی پڑھ لیتے۔ پھر بزرگوں کے حکم پر نمکین چائے کا رنگ نکالنے اور حلوہ بنانے کیلئے لکڑیاں جلاتے اور دیگیں اُن پر چڑھاتے اور پھر خود ایک ایک کر کے

مسجد سے باہر نکل آتے اور کسی فلم کا آخری شو دیکھنے چلے جاتے۔ ساڑھے بارہ بجے تک فلم ختم ہو جاتی اور ہم پھر مسجد شریف میں آ جاتے۔ تب تک حلوہ اور چائے تیار ہو چکی ہوتی اور ہم نہایت عقیدت سے نمازیوں کو چائے پلاتے اور حلوہ پروستے۔ بزرگ ہمیں دعائیں دیتے۔ کئی بار سینما کے احاطے میں لڑائیاں بھی ہوتیں۔ جس میں خالد حسین ایک ماہر جنگجو کی طرح حِصہ لیتا اور اُستاد محلے کا نام روشن کرتا۔ ایسی چند لڑائیوں کا ذکر خیر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں تا کہ خالد حسین کی نوجوانی کی صلاحیتوں سے قارئین واقف ہو سکیں۔

ہم تین یار یعنی ناصر حسین قریشی، میں اور خالد حسین اُتم ٹاکی میں فلم دیکھ رہے تھے کہ کسی نے میرے ننگے بازو پر اپنا سگریٹ بُجھایا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر اُسکے مُونہہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ شور مچ گیا لیکن گیٹ کیپروں نے موقع سنبھال لیا۔ انٹرول کے وقت جب ہم کولڈ ڈرنک پینے ہال سے باہر آئے تو کچھ نوجوانوں نے ہمیں گھیر لیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ میں نے اور خالد نے پیٹھ جوڑ کر اُن کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ بیس پچیس منٹوں میں ہی ہم نے مخالف پارٹی کے پانچ چھ لڑکوں کو زخمی کر دیا۔ خالد حسین نے اپنے آزمودہ ہتھیار ٹکر کا استعمال بے مثال کیا اور کئی لڑکوں کے ناک اور ماتھے سُوجا دیئے۔ پولیس کے آنے سے پہلے ہی ہم وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ ایسے ہی ایک بار محلے کی ایک لڑکی نے خالد حسین سے فریاد کی کہ فلاں بدمعاش لڑکا اُسے تنگ کرتا ہے اور اُسکی مدد کی جائے بس پھر کیا تھا۔ خالد کا جوان خون اُبلنے لگا اور اُس نے بدمعاش لڑکے کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ محمد اشرف خان المعروف ''افو'' اور میں اُس کے ساتھ ہو لئے اور اُس بدذات کا پیچھا کرنے لگے۔ بالآخر ایک دِن ہم نے اُسے ''رانی کے تالاب'' کے پاس جا پکڑا اور ہاکیوں سے روئی کی طرح دُھنا۔ اُسکے بعد وہ لڑکی ہم تینوں کو سلام کیا کرتی کیونکہ اُس کی نظر میں ہم شریف النفس اور معتبر تھے۔ ہم دوستوں کا ایک گروپ ہوا کرتا تھا جس میں محمد اشرف خان المعروف ''افو''، میں یعنی

نصیر احمد میر، خالد حسین، بھوشن شرما، درشن شرما اور کنیڈی شامل تھے۔ کئی بار مخالف گروپ کے للکارنے پر ہم اُن سے لڑنے طے شُدہ مقام پر جاتے۔ چاقو، چین، لوہے کا کڑا اور پنجہ ہمارے ہتھیار ہوا کرتے تھے۔ بالکل ہماری فلموں کی طرح۔ خالد حسین کے دوست محمد سعید قریشی اور کرشن سنگھ اور دیگر لڑکے اکثر مہاراجہ ہری سنگھ کی پیلس سے مُلحق پھلوں کے باغ میں آم، مالٹے اور امرود کھانے جاتے۔ اور یہ کام مالی کی عدم موجودگی میں کرتے تا کہ پکڑے نہ جائیں۔ بعدازاں ڈاکٹر کرن سنگھ نے اس باغ کو فروخت کر دیا۔ آج کا کرن نگر اسی باغ پر بسایا گیا ہے۔ اسی طرح ایک بار ہم بخشی وشوامتر کے گھر سنگترے چوری کرنے چلے گئے۔ بخشی وشوامتر اُس وقت جموں کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھا۔ وہ عاشقوں کا جلّاد اور لڑکیاں چھیڑنے والوں کا نائی مشہور تھا۔ کیوں کہ وہ ایسی حرکتیں کرنے والے لڑکوں کے سر مُنڈوا کر اور اُن کا مُونہہ کالا کر کے پورے جموں شہر کے بازاروں میں گُھماتا تھا۔ ایسے جلّاد اور جابر پولیس افسر کے گھر دیوار پھلانگ کر خالد حسین کا سنگترے کے واحد درخت سے سنگترے اُتارنا گویا شیر کے مونہہ میں ہاتھ دینے والی حرکت تھی۔ ہوا یوں کہ کچی چھاؤنی میں دُودھ والی ڈیری سے دُودھ لینے کے بعد خالد حسین، پرویز پال اور میں گھر جا رہے تھے کہ بخشیوں کی گلی کے ایک مکان کے اندر سنگترے کا درخت پورے جوبن پر تھا۔ شوخ پیلے رنگ کے سنگترے دیکھ کر پرویز پال نے خالد حسین کو چیلنج دے دیا کہ اگر وہ مکان کی دیوار پر چڑھ کر سنگترے اُتار لائے تو شام کو اُسے جلیبی والا دودھ پلائے گا۔ خالد حسین نے تاؤ دیکھا نہ بھاؤ، فوراً راضی ہو گیا۔ اُس نے اپنا دُودھ والا برتن پرویز پال کے ہاتھ میں دیا اور خود بندر کی سی پھُرتی سے دیوار پر چڑھ گیا اور درخت سے سنگترے اُتارنے لگا۔ مکان مقفل تھا لہٰذا اُسے یقین تھا کہ چند منٹوں میں یہ کمانڈو ایکشن کر کے واپس آ جائے گا۔ اُسکی دیکھا دیکھی پرویز پال کا کزن خالد بھٹی بھی دیوار پر چڑھ گیا لیکن درخت تک پہونچنے کیلئے اُس نے

دیوار کے ساتھ بنے غسل خانے کے دروازے پر پاؤں رکھا۔ دروازہ کھُل گیا اور خالد بھٹی دھڑام سے آنگن کے پکے فرش پر گر پڑا اور کراہنے لگا۔ اُسی اثنا میں ڈی آئی جی صاحب پہونچ گئے۔ اُنکے اردلی نے مکان کا قفل کھولا تو اندر ایک زخمی لڑکے کو فرش پر کراہتے دیکھا اور خالد حسین کو درخت پر چڑھے ہوئے۔ اُن دِنوں ہم شاید ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ دونوں خالد بُری طرح سے پھنس گئے تھے۔ بخشی وشوامتر نے اپنی سرکاری چھڑی المعروف ''بینت'' پکڑی اور تفتیش شروع ہوئی۔ خالد حسین نے سارا الزام خالد بھٹی کے سر ڈالا اور کہا کہ وہ سنگترے توڑنے کیلئے دیوار پر چڑھا تھا۔ ایک پکے ہوئے سنگترے کو توڑنے کے لالچ میں فرش پر گر پڑا اور وہ اُسے دیکھنے دیوار پر چڑھا تھا۔ بخشی صاحب نے چھڑی مبارک کو جب خالد حسین کی پیٹھ پر جمایا تو وہ چلانے لگا اور اپنی والدہ کو یاد کرنے لگا، جبکہ خالد بھٹی مار کھاتا رہا لیکن موںہہ سے اُف تک نہ کی۔ کیونکہ خالد حسین کی نظروں میں وہ بُزدل بننا نہیں چاہتا تھا۔ بخشی وشوامتر آخر اِس نتیجے پر پہونچے کہ خالد حسین معصوم ہے۔ اسے چھوڑ دیا جائے اور خالد بھٹی کو پکہ ڈنگہ تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ جب محلے کے بزرگوں کو خالد بھٹی کی گرفتاری کا پتہ چلا تو محلے کا ایک وفد بخشی صاحب سے مِلا اور منت سماجت کرنے کے بعد خالد بھٹی کو چھڑا لائے۔ اس طرح کے کئی اور کارناموں کی رُوداد بیان کی جاسکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ خالد حسین کے بچپن اور لڑکپن کی شوخیوں اور خرمستیوں کا اتنا ذکر کافی ہے۔

کبھی خُود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
(ساحر لدھیانوی)

یاریاں دِلداریاں

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا
(نِدا فاضلی)

میرا نام ہربھجن سنگھ ساگر ہے۔ میں نے اور خالد حسین نے ایک ساتھ کلرکی کی نوکری شروع کی تھی۔ ابتدا میں اُسکی آوارہ روح دفتر کے پنجرے سے باہر نکل جاتی اور دوستوں کے باغیچہ میں جابیٹھتی۔ وہ فلمیں دیکھنے کا بڑا شوقین تھا اور اکثر دفتر سے کسی کو بتائے بغیر نکل جاتا اور دوپہر کا شو دیکھنے کے بعد اڑھائی تین بجے تک واپس دفتر آجاتا۔ پندرہ سولہ سال کے معصوم لڑکے کو سینئر کلرک، ہیڈ کلرک یا سیکشن افسر کچھ نہیں کہتے تھے۔ اُنہیں یہ گُمان تھا کہ ترقیاتی کمشنر آغا مظفر علی (جو بعد میں ریاست کے چیف سیکریٹری بنے) کے حکم سے اُس کی تقرری ہوئی ہے لہذا یہ لڑکا اُن کا رشتے دار ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خالد حسین گورا چٹا اور مِلن سار لڑکا تھا۔ اس لئے اُس پر کام کا بوجھ کم ہی ڈالا جاتا۔ 1960ء میں خالد نے دسویں جماعت کا امتحان دیا تو ایک دِن ترقیاتی کمشنر آغا مظفر علی صاحب کے پاس پیش ہوگیا اور اپنے گھریلو حالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے خالد کو عارضی طور پر ورک مستری لگادیا۔ بعدازاں جب میٹرک کا رزلٹ نکلا تو اُسے بطور کلرک تعینات کردیا گیا۔ ملازمت کے اڑھائی سال بعد اُسکی شادی ہوگئی لیکن اُس کے رویے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اُس کا کھلنڈراپن اور آوارہ گردی قائم رہی۔ لیکن جب اُس کے گھر پہلی بچی کا جنم ہوا تو اُسے ذمہ داری

کا احساس ہوا اور اُس نے پڑھنا شروع کیا اور ادیب فاضل کرنے کے بعد ایک نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اُس کے دوست ششی کانت شرما نے اُسے اپنی کتابیں اور نوٹس دیئے تاکہ اُسے کتابیں خریدنی نہ پڑیں۔ اُس نے پہلے مہینے کی فیس بھی خود ادا کی اور خالد حسین پر نظر بھی رکھنے لگا تاکہ وہ فلم دیکھنے یا دوستوں کی محفلوں سے دُور رہے۔ بہر حال اُس نے بی اے پاس کرنے کے بعد بہتر ملازمت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ وہ محکمہ دیہات سُدھار کے ماہنامہ "دیہات سُدھار" کا نائب مُدیر بنا۔ ریاستی اسمبلی اور محکمہ منصوبہ بندی میں مترجم بنا۔ 1975ء میں جب شیخ محمد عبداللہ "اندرا۔ شیخ ایکارڈ" کی بدولت وزیر اعظم سے وزیر اعلیٰ بنے تو اُنہوں نے اپنی وزارت کو چار وزراء تک محدود رکھا۔ مرزا محمد افضل بیگ اور خود شیخ صاحب کشمیر سے، جسٹس دیوس داس ٹھکر جموں سے اور سونم نربُو لداخ سے وزیر بنائے گئے۔ مرزا محمد افضل بیگ کو ایک ایسے پرسنل اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو انگریزی، ہندی اور اُردو کے علاوہ مقامی زبانیں کشمیری، ڈوگری وغیرہ بول سکتا ہو۔ جنرل ایڈمنسٹریٹیو ڈیپارٹمنٹ کے سیکریٹری نے ریاستی کلچرل اکادمی کے سیکریٹری محمد یوسف ٹینگ سے اس سلسلہ میں پوچھا تو اُنہوں نے خالد حسین کا نام تجویز کیا۔ مرزا محمد افضل بیگ صاحب نے خالد کا انٹرویو لیا۔ اُسے انگریزی میں لکھا ہوا ایک مختصر مضمون دیا گیا اور اُس کا ترجمہ اُردو میں کرنے کے لئے کہا گیا۔ اسی طرح اُردو کی ایک تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کیلئے کہا۔ یہ دونوں تراجم بیگ صاحب نے خود پڑھے۔ کچھ مزید سوالات ہوئے اور پھر خالد حسین کو منتخب کر لیا گیا۔ خالد نے نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ صاحب کے ساتھ پونے چار سال تک کام کیا۔ بیگ صاحب ایک قابل وکیل کے علاوہ انگریزی، اُردو اور فارسی کے عالم بھی تھے۔ ادب کے ساتھ اُن کا مضبوط رشتہ تھا۔ خالد حسین نے اُن سے زبان اور بیان کے حوالے سے بہت کچھ سیکھا۔ یہ ساتھ تب چھوٹا جب شیخ محمد عبداللہ کے داماد اور اُن کی کابینہ کے

وزیر غلام محمد شاہ المعروف گُل شاہ کی سازشوں سے بیگ صاحب کو مستعفی ہونا پڑا۔ خالد حسین دوبارہ اپنے اصلی محکمے میں آ گیا جہاں اُسے ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کا مُدیر بنایا گیا۔ اُن دنوں کشمیر انتظامیہ سروس (Kashmir Administrative Service) کے نئے رنگ روٹ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اپنی تقرری کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے پاس بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اُن K.A.S افسروں میں خالد حسین کا دوست اور مشہور اُردو شاعر پرتپال سنگھ بیتاب بھی تھا۔ چنانچہ اُسکی وجہ سے وہ سب افسران خالد حسین کے کمرے میں بیٹھ جاتے اور دِن بھر چائے کے دور چلتے رہتے۔ ان نوجوان افسروں میں بیتابؔ کے علاوہ خالد کی مونہہ بولی بہن تنویر جہاں، نسیم لنگر، دلیپ سنگھ، سید فضل اللہ، اوتار کرشن رینہ، سُنیتا گپتا اور مسعود الحسن سامون شامل تھے۔ آج یہ سب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ سروس کے آخری پڑاؤ میں اِن سب کی انڈکشن انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس (I.A.S) میں ہو چکی تھی۔ اُن دِنوں خالد حسین پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا اور کئی اخبارات کو ایڈٹ کرتا رہا۔ دفتر سے نکلنے کے بعد وہ اخبار کے دفتر چلا جاتا اور اخبار کا سارا کام ختم کر کے رات گئے گھر لوٹتا۔ کئی نوجوان آئی، اے، ایس افسر شام کو اُسکے اخبار والے دفتر میں وقت گذارنے کیلئے آ جاتے۔ کیونکہ اُن کو جموں کشمیر کیڈر الاٹ ہوا تھا اور یہاں تب اُنھیں کوئی جانتا نہیں تھا اور خالد حسین کے ساتھ سیکرٹریٹ میں اُن کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ لہٰذا وہ اُس کے پاس آ جاتے۔ اُن افسروں میں ماریہ ڈیزال فن، شیام سنگھ کپور (جو بعد میں ریاست کے چیف سیکریٹری بنے) اے، ایس سِدھو اور سائمل ورگیز اہم نام ہیں۔ سبھی گپ شپ کرتے اور چائے کے دور چلتے۔ پھر دوسرے دِن ملنے کا کہہ کر وہ چلے جاتے۔ اُن میں سائمل ورگیز کو چرس پینے کی عادت تھی جو خالد حسین نے اُن سے چھڑائی تھی۔ ماریہ ڈیزال فِن، ایس، ایس کپور اور سائمل ورگیز نہایت ایماندار افسر تھے۔ میں نے بھی اُن کے ساتھ مختلف محکموں میں کام کیا تھا اور خالد حسین نے بھی۔ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ

اِن لوگوں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ کبھی اپنے گھر میں کوئی نوکر نہیں رکھا۔ مہمانوں کی خدمت خود کرتے۔ ان کے علاوہ تاج محی الدین، بلدیو سنگھ جسوال، محی الدین فورمین اور شجعی احمد بھی اکثر اخبار کے دفتر میں آجاتے اور خالد کے ساتھ وقت گذارتے۔ چٹکلے بازی اور گپ شپ ہوتی۔ اِن دوستوں کے آنے سے پہلے ہی خالد اخبار کا ایڈیٹوریل لِکھ دیتا اور کئی بار گھر سے لکھِ کرلے آتا، تاکہ اخباری کام کاج میں حرج نہ ہو۔ خبروں کو بنانا اور اُنکی سرُخی لگانا وہ بات چیت کے دوران بھی لگا دیتا تھا۔ کاتبوں کو ہدایت دینا اور ریڈیو سے لگاتار تازہ خبریں سُننا تو روز کا معمول تھا۔ خالد حسین، سیاسی یا سماجی موضوعات پر ابنِ حسین کے نام سے لکھتا تھا تاکہ سرکاری نوکری پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اخبار ایڈٹ کرنے کیلئے اُسے ماہوار تین سو روپے ملتے تھے یعنی دس روپے روزانہ۔ پانچ روپے کی عیاشی دوستوں کیلئے مخصوص تھی جبکہ باقی کے پانچ روپے گھر کی مالکن نسیم فردوس کو عزت واحترام اور تابعداری کے ساتھ دے دیئے جاتے تاکہ گھریلو محاذ مضبوط اور خوشگوار رہے۔ سرکاری تنخواہ کے 150 روپے تو اُس کا منکوحی حق تھا۔ یوں اُسکی گھرہستی عمدہ چل رہی تھی۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی وجہ سے اُس کی دوستی اُس افسر منڈلی سے تاحیات رہی۔ تنویر جہاں کی پہلی پوسٹنگ تو محکمہ رورل ڈیولپمنٹ (دیہات سُدھار) میں ہی بطور انڈر سیکریٹری ہوئی تھی۔ خالد حسین والے کمرے میں ہی اُردو کے مشہور افسانہ نگار نور شاہ صاحب جو اُن دِنوں ڈپٹی ڈائریکٹر پنچایت تھے، سوامی راج بھگت انڈر سیکریٹری بھی بیٹھا کرتے تھے چنانچہ تنویر جہاں کی میز کُرسی بھی اُسی کمرے میں لگا دی گئی۔ کمرے کے حُجم یعنی جسامت اور ضخامت کے اعتبار سے یہ فیصلہ درست مانا گیا تھا۔ پھر ایک انتہائی خوبصورت اور خُوشنما چہرے پر بھلا کس کو اعتراض ہوتا۔ خالد حسین 1978ء میں گزٹیڈ افسر بن چُکا تھا جب اُسے مُدیر ''دیہات سُدھار'' کے عہدہ پر ترقی دی گئی تھی۔

یہاں محترمہ تنویر جہاں کا تفصیل سے ذِکر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس خاتون کی وجہ

سے خالد حسین کی آنے والی زندگی میں فرحت بخش تبدیلی آئی تھی اور تغیر و تبدّل کا یہ سلسلہ متواتر جاری وساری رہا تھا۔ جہاں ہمارے نریندر مودی جی چائے بیچتے بیچتے پردھان منتری بن گئے تھے، وہاں خالد حسین چائے نہ پلانے کے خوشگوار جُرم میں تنویر جہاں کی بدولت بہت دُور تک پہونچ گئے۔ محترمہ تنویر جہاں ایک امیر باپ کی بیٹی تھی۔ اُس کے والد جناب عبدالغنی وِکڑی قالینیں اور پشمینے کے شال بنانے والے کارخانے کے مالک تھے۔ اُن کی فیکٹری میں بنی کشمیری قالینیں اور پشمینے کے شال یورپی ممالک میں جاتے تھے۔ تنویر جہاں صاحبہ کے، اے، ایس کا امتحان پاس کر کے سِول سروس میں آئی تھی۔ اُس نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سے انگریزی ادب میں ایم، اے کیا تھا۔ وہ بے باک اور کھری بات مونہہ پر کرنے کی عادی تھی۔ وہ اکثر اپنے گھر سے بڑھیا پکوان بنوا کر لاتی اور خالد حسین، نُور شاہ اور سوامی راج بھگت کو کھلاتی۔ اُن سب کو چائے پلاتی۔ کئی بار سیکریٹریٹ کی کنٹین سے کانتی، کباب بھی منگواتی۔ سیاست، سماجیات سے لیکر اُردو شاعری اور ادب کی ہر صنف پر کھُل کر بات کرتی۔ خالد حسین سے اُس کے افسانے سُنتی۔ پورا ایک گھریلو ماحول بنا رہتا۔ ایک دِن اُس نے خالد کو چائے پلانے کے لئے کہا۔ خالد نے معذرت کی کیونکہ اُس کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ انکار کرنے پر تنویر جہاں صاحبہ نے خالد حسین کو دو چار صلواتیں سُنائیں اور نُور شاہ صاحب سے کہا کہ وہ خالد حسین کی مسکینی اور خباثت کو دُور کرے اور اُسے بلاک ڈیولپمنٹ افسر بنوائے۔ جب نُور شاہ صاحب نے کہا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ بی، ڈی، او ایک کیڈر پوسٹ ہے اور اُس پر نان کیڈر ملازم نہیں لگ سکتا تو تنویر جہاں صاحبہ نُور شاہ صاحب پر برس پڑی اور کہا ''اِس غریب کے پاس رشوت دینے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ اسی لئے یہ بی، ڈی، او نہیں بن سکتا۔ ورنہ میں سب دیکھتی رہتی ہوں کہ آپ نے کیسے کیسے لوگوں کو کیڈر پوسٹوں پر لگایا ہے''۔ یہ سُنتے ہی نُور شاہ صاحب نے مجھ سے خالد حسین کی فائل

منگوائی اورتنویر جہاں صاحبہ کی میز پر رکھ دی اور کہا۔ ''تم اِس پر اپنی مرضی کے مطابق نوٹ لکھ دو۔ میں دستخط کردوں گا اور فائل افسران بالا کے پاس بھیج دُوں گا''۔

چنانچہ تنویر جہاں اور سوامی راج بھگت نے مِل کر نوٹ لکھا۔ جِس میں خالد حسین کی تعریفوں کے پُل باندھے گئے اور لِکھا کہ یہ فیلڈ افسر کے طور پر انتہائی موزوں رہے گا۔ نورشاہ صاحب نے نوٹ پر دستخط کر دیئے۔ اُن دنوں رورل ڈیولپمنٹ محکمہ میں ایڈیشنل سیکریٹری ماریہ ڈیزال فن تھا۔ وہ خالد حسین کا دوست تھا۔ اُس نے بھی اپنے نوٹ میں سفارش کر دی کہ خالد حسین کا بی، ڈی، او بننا عوامی مفاد کیلئے بہتر رہے گا۔ تنویر صاحبہ یہ فائل لے کر خود کمشنر سیکریٹری جناب محمودالرحمان کے پاس گئی۔ جب اُنہوں نے پوچھا کہ کیا خالد حسین چاہتا ہے کہ اُسے بی، ڈی، او بنایا جائے تو تنویر صاحبہ نے کہا ''اُسے تو پتہ بھی نہیں ہے۔ یہ ہم سب چاہتے ہیں''۔ محمودالرحمان صاحب (جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے) نے نفسِ مضمون سے اتفاق کرتے ہوئے مِسل وزیر زراعت اور پنچایتی راج جناب محمد اشرف خان آف شانگس کو منظوری کے لئے بھیج دی۔ تین چار دِنوں تک جب مِسل واپس نہیں آئی تو محترمہ تنویر جہاں خود منتری صاحب کے سامنے پیش ہوگئی اور فائل منظور کروا کر لائی۔ سرکاری حکم نامہ جاری ہوا اور خالد حسین کو بلاک ارناس کا بلاک ڈیولپمنت افسر لگا دیا گیا۔ اگر خالد حسین تنویر جہاں صاحبہ کو چائے پلا دیتا تو وہ شاید کبھی بی، ڈی، او نہیں بنتا اور نہ ہی تنویر جہاں صاحبہ یہ پنگا لیتی۔ اسے آپ مُعجزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں گے کہ ہنسی مذاق میں خالد حسین ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کی ادارت چھوڑ کر فیلڈ افسر بن گیا۔ وہ سچے من سے تنویر جہاں صاحبہ کو اپنی بہن اور مُحسن مانتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ خالد حسین کے دُکھ سُکھ میں شریک رہی۔

یہاں ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ خالد حسین کے ہاں دو بیٹیوں کے جنم کے

بعد ہماری بھابھی نسیم فردوس پھر اُمید سے تھی۔ اور بھائی خالد بے چین اور سخت پریشان کہ کہیں پھر بیٹی پیدا نہ ہو۔ اُنہی دِنوں ہم دونوں ایک پنجابی ادبی کانفرنس میں حِصہ لینے امرتسر چلے گئے۔ وہاں رات ہم خالد کے دوست اور مشہور پنجابی ناول نگار اور پروفیسر موہن کاہلوں کے ویرکہ والے گھر میں ٹھہرے۔ باتوں باتوں میں خالد حسین نے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو موہن کاہلوں اور اُسکی اہلیہ کہانی کار دیپ موہنی نے کہا کہ اگر پھر بیٹی پیدا ہوئی تو وہ اُسے گود لے لیں گے کیونکہ اُن کا صرف ایک بیٹا ''پال'' ہے (جو آئی ایس افسر بنا اور مغربی بنگال کا چیف سیکریٹری رہا) بیٹی گود لینے سے ''پال'' کو بہن مل جائے گی اور ہمیں بیٹی۔ یہ طے ہونے پر خالد کو قرار آ گیا۔ کانفرنس میں شمولیت کے بعد جب ہم جموں پہونچے تو اُستاد محلے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بُڑھیا نے خالد حسین کو مبارک دی لیکن وہ بغیر جواب دیئے گھر کی اور چل پڑا۔ جب وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو ماں نے خوب ڈانٹا اور دو تین تھپڑ بھی جھڑ دیئے۔ اور کہا کہ ایسی حالت میں بیوی کو چھوڑ کر آوارہ گردی کرنے نکل پڑے تھے۔ میں نے بیچ بچاؤ کر کے خالد کی خلاصی کرائی تو اُسکی ماں نے بچے کو خالد کے ہاتھوں میں دے دیا اور کہا کہ تیسری بیٹی ہوئی ہے۔ پکڑو اور سنبھالو اپنی بچی کو۔ یہ سُن کر خالد مایوس ہو گیا لیکن اُسکی خوش دامن صاحبہ نے وضاحت کر دی کہ بیٹا پیدا ہوا ہے اور مبارک دی۔ خالد کی ماں نے پوتے کا نام ذاکر حسین رکھا۔ اپنے ایک ہندو دوست کے کہنے پر خالد حسین نے اُس کی جنم پتری بنوائی جو تالاب تلو کے پنڈت گردھاری لعل نے بنائی تھی۔ جب یہ جنم کنڈلی بنوائی گئی اُس وقت ذاکر حسین کی عُمر چھ برس تھی۔ جنم کنڈلی میں لکھا تھا کہ ذاکر کا ایک بھائی اور ہوگا۔ وہ بچہ خالد حسین کیلئے بڑا خوش قسمت ہوگا۔ جب خالد نے پنڈت جی سے کہا کہ وہ مزید کوئی بچہ نہیں چاہتے تو پنڈت گردھاری لال نے بتایا کہ اگر خالد حسین نے بچے کو کوکھ میں مارنے کی کوشش کی تو ذاکر حسین اُسے تیزاب میں

نہلائے گا اور اُسکی زندگی عذاب بنادے گا جبکہ آنے والا بچہ باپ پر آنے والی ہر آفت سے اُسے محفوظ رکھے گا اور اُس پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ یوں خالد حسین کی اہلیہ نے سات سالوں کے بعد دوسرے بیٹے کو جنم دیا۔ بچہ وقت سے پہلے پیدا ہوا یعنی ساتویں مہینے میں۔ اُس کا جنم 12 جنوری 1980ء کو ہوا یعنی اُسی روز جس دِن خالد کی شادی ہوئی تھی۔ خالد نے اُسی پنڈت سے یاسر کا ٹیوا بنوایا، جس نے ذاکر کا بنایا تھا۔ ٹیوے میں لکھا تھا کہ یاسر راج یوگ میں پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے باپ کیلئے خوش بخت ہوگا۔ گھر میں خوشحالی ناچے گی اور بالکل ویسے ہی ہوا۔ یاسر کی پیدائش کے بعد خالد حسین بلاک افسر بنا۔ پارٹ ٹائم صحافت کا کام چھُٹ گیا۔ وہ 1981 سے اگست 1983 تک ارناس بلاک کا بی، ڈی، او رہا۔ 1983 میں جو انتخابات ہوئے اُس میں نیشنل کانفرنس نے اپنے لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سربراہی میں اپنے بل بوتے پر انتخاب لڑا اور دو تہائی اکثریت سے الیکشن جیتا۔ کانگریس جماعت اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کی خواہش تھی کہ جموں وکشمیر میں الیکشن مل کر لڑا جائے لیکن ڈاکٹر فاروق عبداللہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس انکار کو محترمہ اندرا گاندھی نے اپنی توہین سمجھا اور مختلف ایجنسیوں کے ذریعے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو بدنام کیا جانے لگا۔ اُسے پاکستانی ایجنٹ کہا جانے لگا۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین میجر امان اللہ خان اور مقبول بٹ کے ساتھ کھینچے گئے فوٹو اخبارات میں چھپنے لگے۔ فاروق عبداللہ کی جماعت کے پاس 58 ممبر اسمبلی تھے پھر بھی پردھان منتری اندرا گاندھی نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت گرانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ قومی اخبارات میں فاروق عبداللہ کے خلاف بیان بازی جاری تھی۔ جالندھر اُن دِنوں اخبارات کا مرکز تھا۔ وہاں سے 'ہند سماچار'، 'ملاپ'، 'پرتاپ' اخبارات نکلتے تھے۔ اسی طرح ''پنجاب کیسری''، ''وِیر پرتاپ'' ہندی میں چھپتے تھے اور کشمیری لیڈر شپ کے خلاف زہر اُگلتے تھے۔ پنجابی میں ''اجیت''، ''جگ بانی''،

''اکالی پتریکا''، ''نواں زمانہ'' وغیرہ اخبارات بھی جالندھر سے شائع ہوتے تھے۔ جبکہ انگریزی میں ''ٹربیون''، ''انڈین ایکسپریس''، ''ٹائمز آف انڈیا'' اور ''ہندوستان ٹائمز'' کے پنجاب ایڈیشن جالندھر اور چندی گڑھ سے چھپتے تھے۔ ایک منصوبے کے تحت سبھی اخبارات میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو غدار اور دیش دروہی لکھا جارہا تھا۔ اِن حالات میں ریاست کے وزیر اطلاعات اور وزیرِ تعلیم جناب محمد شفیع اُوڑی نے خالد حسین کو اپنے دفتر میں بلایا اور جالندھر میں جموں کشمیر انفارمیشن بیورو کا سربراہ بنانے کی آفر دی۔ شفیع اُوڑی صاحب جانتے تھے کہ ایک صحافی اور پنجابی ادیب کے ناطے پورے پنجاب میں خالد حسین کے تعلقات ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے بہت گہرے ہیں اس لئے وہ چاہتے تھے کہ خالد وہاں جاکر جموں وکشمیر کی صحیح تصویر پیش کرے اور منفی پروپیگنڈے کو روکے۔ خالد حسین نے وزیر اطلاعات کی تجویز کو بخوشی مان لیا لیکن اُن سے کہا کہ جالندھر کے اطلاعتی مرکز میں عوامی رابطہ افسر کی آسامی بی، ڈی، او کے سکیل سے دو گریڈ اوپر ہے۔ جب تک اُسے ایک گریڈ پرموشن نہیں دی جاتی وہ اگلی پوسٹ پر کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خالد حسین کو ایک گریڈ پرموشن دی گئی تاکہ وہ عوامی رابطہ افسر کی آسامی پر کام کر سکے۔ اُس وقت محکمہ اطلاعات کے کمشنر اونکار ناتھ دھر، ایک کشمیری پنڈت تھے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ جالندھر جیسی اہم پوسٹ پر کسی مسلم افسر کو تعینات کیا جائے۔ اُنہوں نے فائل پر لکھا کہ اس سے محکمہ اطلاعات کے افسروں میں مایوسی پھیلے گی لیکن شفیع اوڑی صاحب بھی اڑ گئے۔ اُنہوں نے فائل کو وزیر اعلیٰ کی منظوری کے لئے بھیج دیا۔ اور ڈاکٹر فاروق صاحب نے فائل منظور کر کے کمشنر کو بھیج دی۔ جس پر کمشنر او، این دھر صاحب نے انگریزی میں لکھا،

"I Still disagree with this Proposal, but I have to obey the orders of my superiors. Order may be issued" اور آخر او، پی،

شرما کی جگہ خالد حسین کو جالندھر اطلاعتی مرکز کا پبلک ریلیشنز افسر بنا دیا گیا۔ جب خالد حسین نے پی، آر، او کا چارج سنبھالا اور اخبارات کو ریاستی خبرنامہ بھیجا تو دوسرے روز کسی بھی اخبار میں ریاست جموں وکشمیر کے اطلاعتی مرکز کی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔ پوری طرح بلیک آؤٹ کیا گیا تھا۔ دفتر میں بھی اُردو، انگریزی، ہندی اور پنجابی مترجم عملے نے بھی چھٹیوں کی درخواستیں دے دیں۔ خالد حسین نے سب کی درخواستیں منظور کر لیں لیکن جب ہندی، انگریزی اور پنجابی کے ٹائپسٹ چھٹی مانگنے لگے تو اُس نے انکار کر دیا۔ اُن دنوں خبریں ٹیلی پرنٹر کے ذریعے ملتی تھیں اور خالد حسین ٹیلی پرنٹر چلانا جانتا تھا۔ اُس نے پنجابی اور ہندی ٹائپسٹ کو خبروں سے متعلق ڈکٹیشن دیا اور جب وہ ٹائپ کر کے لائے تو خالد نے ہندی اور پنجابی کی غلطیاں نکال کر دوبارہ ٹائپ کرنے کو کہا۔ دونوں حیران تھے کہ خالد حسین کو گورمکھی اور دیوناگری کیسے آتی ہے۔ جب خبریں ترجمہ کرنے والوں کو خبر دی گئی تو سبھی باری باری کام پر حاضر ہو گئے۔ یہ سب کمشنر صاحب کی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ جب دو روز تک اطلاعتی مرکز جالندھر کی کوئی خبر نہیں چھپی تو خالد حسین اپنے دوست اور مشہور پنجابی افسانہ نگار پریم پرکاش کھنّوی سے ملا جو ہند سماچار اخبار کا نائب مُدیر تھا۔ اُس نے خالد حسین کو مدیرِ اعلیٰ اور مالک شری رمیش چوپڑہ سے ملایا۔ خالد نے ریاستی سرکار اور خصوصاً مسلم افسروں کے خلاف پھیلائی گئی غلط فہمیوں اور الزام تراشیوں کو یکسر رد کیا اور اُنہیں بتایا کہ کشمیر میں نہ تو کوئی مندر جلایا گیا ہے اور نہ ہی کسی ہندو کو قتل کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی ہندو بہن بیٹی کا اغوا ہوا ہے۔ خالد حسین نے سرکاری نوکری میں ہندو، مُسلم اور سکھوں کی نمائندگی کے بارے میں بھی ریاستی حکومت کا کتابچہ شری رمیش کو دیا۔ جس کے مطابق کشمیری مسلمانوں کا نوکریوں میں تناسب 48 فیصدی تھا جبکہ کشمیری پنڈتوں کا 36 فیصد اور باقی جموں صوبہ کے ہندوؤں (12 فیصد)، مُسلمانوں (4 فیصد) اور بُودھوں وسکھوں کا (2 فیصد) یعنی کُل تناسب 18

فیصد تھا۔ جبکہ آبادی کے لحاظ سے کشمیر میں مسلمان 93 فیصد اور پنڈت 4 فیصد تھے اور جموں کے ہندو تعداد میں سب سے زیادہ تھے اور دوسرے نمبر پر مسلمان تھے۔ یعنی جموں صوبے میں ہندوؤں کا تناسب 61 فیصد، مسلمانوں کا تناسب 35 فیصد باقی 4 فیصد دیگر اقلیتی گروپ تھے۔ خالد حسین نے رمیش جی اور وجے چوپڑا جی کو جموں اور کشمیر کا دورہ کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے ریاست کے حالات جان سکیں۔ یوں ''ہند سماچار'' گروپ کے اخباروں ''ہند سماچار''، ''پنجاب کیسری'' اور ''جگ بانی'' میں ریاست کی خبریں لگنی شروع ہوئیں۔ اسی طرح ''پرتاپ'' کے نائب مُدیر اور شری ویریندر جی کے بیٹے جگموہن کی وساطت سے ویریندر جی سے بھی ملاقات ہوئی اور اُنکی غلط فہمیاں بھی دُور کی گئیں اور یوں ریاستی سرکار کی خبریں تواتر سے اِن اخبارات میں لگنی شروع ہوئیں۔ جب اُن لوگوں کو پتہ چلا کہ خالد حسین جموں کا رہنے والا ہے اور پنجابی بھاشا کا ادیب ہے تو اُسکے تعلقات صحافیوں اور ادیب قبیلے سے مزید گہرے بن گئے۔ روزنامہ ''اجیت'' پنجابی کے مُدیر اور مالک ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد سے خالد حسین کی جان پہچان بہت پُرانی تھی۔ 1975ء میں جب خالد حسین نے سری نگر میں کل ہند پنجابی کانفرنس کرانے کا فیصلہ لیا تو اُس وقت سادھو سنگھ ہمدرد صاحب نے خالد کی بھرپور مدد کی تھی۔ جناب ہمدردؔ سے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ''اجیت'' اُردو میں بھی چھپنا شروع ہوا تھا اور یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا۔ جالندھر کی پوسٹنگ کے دوران خالد حسین نے ابن حسین کے قلمی نام سے تقریباً 45 آرٹیکل مختلف اخبارات کیلئے لکھے جن میں شیخ محمد عبداللہ کی ریاستی عوام کیلئے خدمات کا ذکر ہوتا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت کے بارے میں حقائق پیش کئے جاتے۔ خالد اِن مضامین کے تراشے شفیع اُوڑی صاحب کو بھیج دیتا۔ جب ''ہند سماچار'' کے رمیش جی خالصتانی مِلی ٹینٹوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا تعزیت نامہ خالد حسین نے ہی شری وجے کمار چوپڑا کو پیش

کیا تھااور زبانی بھی تعزیت کی تھی۔ کیونکہ لالہ جگت نارائن کی شہادت کے بعد اس خاندان کے لئے یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ وہ ارتھی کے جُلوس میں بھی شامل ہوا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھارت کو ایک مضبوط ملک اور ایک عالمی طاقت کے رُوپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ملک کے الگ الگ علاقوں میں اُٹھنے والی علیحدگی پسند تحریکوں سے دُکھی تھے جن میں پنجاب میں خالصتانی تحریک بھی شامل تھی۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ مسلح جدوجہد اور تصادم کے بجائے بات چیت سے مسئلہ حل کیا جائے۔ اُنہوں نے اس سلسلہ میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں والے سے رابطہ قائم کرنے کی بھی کوشش کی اور خالد حسین کے ہاتھ ایک خط اُن کے نام دیا جو اُس نے دربار صاحب امرتسر کی چھت پر بیٹھے سنت بھنڈراں والے کو دیا تھا۔ اس مسئلے میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا دخل دینا پردھان منتری اندرا گاندھی کو بہت بُرا لگا تھا اور اُنہوں نے برملا اسکی مخالفت اور نکتہ چینی کی تھی۔ محترمہ اندرا گاندھی کا یہ بیان اُس وقت کے اخباروں کی بڑی سُرخی بنا تھا۔ آخر اُنہوں نے ''بلیوسٹار'' آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پہلی جُون سے پورے پنجاب میں کرفیو لگا دیا گیا اور تین جُون رات کو فوج دربار صاحب میں داخل ہوگئی اور چھ جُون تک شدید لڑائی کے بعد دربار صاحب پر قبضہ کر لیا اور بھنڈراں والا شہید ہوگیا۔ 8 جُون تک تک فوجی کاروائی چلتی رہی۔ اکال تخت کو ٹینکوں نے چھلنی کر دیا گیا۔ اس کاروائی کے دوران خالد حسین جالندھر میں ہی تھا اور دفتر سے ملحقہ اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اکیلا رہ رہا تھا۔ اُس کا دفتر اور رہائش گاہ جالندھر کے شاستری چوک میں تھی۔ فوجی کاروائی کی وجہ سے پورا پنجاب فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ 13 دِن تک سخت کرفیو کے بعد جب اخباری نمائندوں کا پہلا جتھہ اکال تخت کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھنے گیا تو اُس گروپ میں خالد حسین بھی شامل تھا۔ اُس نے وہاں گولیوں سے چھلنی اکال تخت کی عمارت کو دیکھا۔ دربار صاحب کے حجروں کی دیواروں پر انسانی خون کے نشان صاف دکھائی

دے رہے تھے۔ بڑے دردناک مناظر تھے۔

''بلیوسٹار'' آپریشن سے فارغ ہونے کے بعد شریمتی اندرا گاندھی نے جموں وکشمیر کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ اُنہوں نے اپنے ماموں اور ریاست کے گورنر شری بی، کے، نہرو سے کہا کہ وہ ریاست میں گورنر راج لگائیں۔ شری نہرو نے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کردیا کہ ایسا کرنا جمہوریت کا قتل ہوگا کیونکہ وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کو ایوان میں دوتہائی اکثریت حاصل ہے۔ اُن کے انکار کرنے پر پردھان منتری نے جگموہن کو ریاست کا گورنر بنادیا اور اُن کے ذمے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت برخاست کرنے کا کام سونپا گیا۔ گورنر جگموہن نے ڈاکٹر فاروق کی حکومت ختم کردی۔ اُس وقت بھارتی پارلیمنٹ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے حق میں 145 ممبران نے بولتے ہوئے محترمہ اندرا گاندھی کی سخت تنقید کی تھی اور گورنر جگموہن کی کاروائی کو جمہوریت کا قتل قرار دیا تھا۔ جگموہن نے نیشنل کانفرنس کے ایک سینئر ممبر اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے داماد اور فاروق عبداللہ کے بہنوئی غلام محمد شاہ المعروف گل شاہ کو بلایا اور اُسے وزیر اعلی کی کُرسی آفر کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ کم از کم 15 ممبران اسمبلی توڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو اُنہیں چیف منسٹر بنایا جاسکتا ہے۔ گُل شاہ اسمبلی ممبران توڑنے میں کامیاب ہوگیا اور اُسے کانگریس کی حمایت سے وزیر اعلیٰ بنادیا گیا۔ باقی نیشنل کانفرنس چھوڑنے والے سبھی اسمبلی ممبران کو منسٹر بنایا گیا۔ فاروق عبداللہ سے غداری کرنے والے سبھی ممبران کشمیر وادی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بالکل اُسی طرح ہوا جیسا اگست 1953ء میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ہوا تھا، جب کشمیر خطہ سے ہی اسمبلی ممبران نے بخشی غلام محمد کی سربراہی میں شیخ صاحب کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تھا اور اُنھیں قید کرلیا گیا تھا۔ کشمیر کی سیاسی تاریخ ایسے ابن الوقت سیاہ کاروں سے بھری پڑی ہے۔ بہر حال گورنر جگموہن کا وہ قدم بڑا خطرناک ثابت ہوا جس

کاخمیازہ بھارت سرکار کو کچھ سالوں بعد بھگتنا پڑا۔

گُل شاہ کی سرکار بننے کے بعد جو پہلا حکم نامہ جاری ہوا وہ خالد حسین کو واپس بلانے اور جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں اٹیچ کرنے کا تھا۔ اُس وقت محکمہ اطلاعات کے وزیر مینڈھر (پونچھ) نواسی سردار رفیق خان تھے۔ جالندھر سے واپس آنے کے بعد خالد حسین ریاست کے چیف سیکریٹری سے مِلا اور تحریری گذارش کی کہ اُسے اُس کے پُرانے محکمے رورل ڈیولپمنٹ (دیہات سُدھار) میں تعینات کیا جائے اور اُس کے گریڈ کے مطابق پوسٹ دی جائے۔ ایک لمبی لڑائی کے بعد پہلے اُسے ڈوڈُو بسنت گڑھ کا ایریا ڈیولپمنٹ افسر (ایس، ڈی، ایم) بنایا گیا لیکن پھر چھ مہینے بعد ہی اُسے پروجیکٹ افسر ضلع دیہی ترقیاتی ایجنسی (Distt.Rural Development Agency) یا ڈی، آر، ڈی، اے پونچھ تعینات کیا گیا۔ ایک مہینے کے بعد اُسکی تبدیلی ڈوڈہ ضلع میں کر دی گئی یعنی اگست 1985 سے وہ بحیثیت پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی، اے ڈوڈہ اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ جنوری 1988ء میں اُسکی انڈکشن "کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس" (K.A.S) میں ہوگئی۔ وہ ضلع ڈوڈہ پونچھ اور راجوری میں بھی اے، سی، ڈی رہا اور پھر ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیٹ جموں تعینات ہوا۔ دو سال وہاں گذارنے کے بعد اُسے ایڈیشنل رجسٹرار کوا پریٹیو سوسائٹیز جموں اور پھر ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جموں لگایا گیا۔ 1999ء میں اُسے ڈپٹی کمشنر پونچھ اور 2001ء میں رجسٹرار اگریکلچر یونیورسٹی جموں لگایا گیا۔ تاکہ وہ اس نئی یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریٹیو بلاک سنبھالے۔ ایک سال کے بعد اُسے ڈائریکٹر ایمپلائمنٹ جموں وکشمیر تعینات کیا گیا اور پھر مینیجنگ ڈائریکٹر درجہ فہرست ذاتوں اور قبیلہ جات کارپوریشن (M.D S.C, S.T & O.B.C) بنایا گیا اور بالآخر محکمہ خوراک وامور صارفین کے سپیشل سیکریٹری کے عہدہ سے 2003ء میں ریٹائر ہوا۔ خالد حسین کے ریٹائر ہونے سے پہلے ہی اُسکے بچپن کا دوست

تاج محی الدین ریاستی وزیر بن چکا تھا۔اُس نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے خالد کو پانچ سال کیلئے State Consumer Commission کا ممبر بنوا دیا۔مُدت پوری ہونے کے بعد تاج محی الدین کی ہی سفارش پر اُس کو ''ووڈافون'' ٹیلی کام کمپنی نے ریاست جموں وکشمیر کا کارپوریٹ افیئرز کا ہیڈ بنا دیا گیا جہاں اُس نے اڑھائی سال تک کام کیا۔

اس طرح اچھی نوکری اور خوشحال زندگی کیلئے پندرہ سال کی عمر سے جدوجہد کرنے والے خالد حسین نے پچاس سال تک سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ نوکری کی۔بچوں کو پڑھایا۔اُن کے لئے جائیداد بنائی۔اُنھیں ہر طرح کا سُکھ دیا۔میں کلرک سے صرف دو قدم آگے سیکشن افسر تک ہی پہونچ پایا لیکن میرے یار نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے لیکن ہماری دوستی میں اُسکی افسری کبھی آڑے نہیں آئی۔وہ جب بھی سیکرٹریٹ آتا تو سب سے پہلے مجھے اُس ہال میں آکر ملتا جہاں کلرک بیٹھا کرتے تھے کیونکہ میں اُن کا سیکشن افسر تھا۔ وہ میرے ساتھ چائے پیتا۔باتیں کرتا، پھر چلا جاتا۔ وہ چاہے ڈپٹی کمشنر تھا یا سیکریٹری تھا لیکن میرے لئے وہ وہی پُرانا یار اور دِلدار خالد حسین تھا اور میں اُس کا ہر بھجن سنگھ ساگر۔اُسکے اندر غُرور یا گھُمنڈ یا لالچ بالکل نہیں تھا۔وہ زمین کے ساتھ جُڑا ہوا انسان تھا اور آخر زمین کی گود میں ہی چلا گیا۔

فریداؔ خاک نہ نیندیے، خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تھلے، مویاں اُوپر ہوئے

(حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر عرف بابا فریدؔ)

ترجمہ: فرید مٹی کو کبھی بُرا مت کہو، مٹی تو قابل احترام ہے
جیتے جی یہ پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور مرنے کے بعد اوپر

قادر کی قدرت

میں اپنے فن کی بُلندی سے کام لے لوں گا
مجھے مقام نہ دو میں مقام لے لوں گا
(نامعلوم)

میرا نام ولی محمد بٹ اور تخلص اسیرؔ ہے۔ میں ایک ادیب اور شاعر ہُوں۔ تاریخ بھی میرا من پسند مضمون ہے اوران موضوعات پر میری کتابیں چھپ چکی ہیں۔ میں کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس کا امتحان پاس کر کے سرکاری انتظامیہ میں شامل ہوا تھا اور مجھے اکوئنٹس کیڈر مِلا تھا۔ ملازمت کے ابتدائی دِنوں میں میری پوسٹنگ بحیثیت اکوٹنس افسر محکمہ ٹرانسپورٹ میں ہوئی تھی۔ وہاں ایک دِن خالد حسین اپنی سرکاری جیپسی کو رجسٹر کرانے آیا تو بات چیت میں پتہ چلا کہ اُسے ادب سے دلچسپی ہے۔ پھر میری پوسٹنگ ضلع ڈوڈہ میں بحیثیت ضلع خزانہ افسر اور بعدازاں ضلع فنڈ افسر ہوئی جہاں خالد حسین ڈی، آر، ڈی، اے ڈوڈہ کا پروجیکٹ افسر اور پھر اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ ڈوڈہ تعینات رہا۔ ڈوڈہ میں ہم دونوں کو تقریباً چھ سال اکٹھے رہنے کا موقع ملا۔ خالد حسین سے میری قربت دوستی میں بدلی۔ ادب ہمارا بنیادی مرکز تھا۔ خالد حسین افسانہ نگار تھا۔ وہ اکثر اپنی کہانیاں سُناتا۔ ہم نے ایک ادبی تنظیم بنائی اور کئی کُل ہند مشاعرے کروائے۔ جن میں ملک کے نامور شعرا نے شرکت کی۔ ہمارے ضلع ترقیاتی کمشنر اور ضلع مجسٹریٹ محمد اقبال کھانڈے مرحوم بھی ادب نواز تھے اور وہ ادبی پروگرام اور مشاعرے کروانے میں ہماری بھرپور مدد کرتے تھے۔ اُن دِنوں ضلع ڈوڈہ 14 بلاک پر

مشتمل تھااور سات تحصیلیں تھیں۔ ڈوڈہ ضلع کی سرحد ایک جانب ہماچل پردیش کے ضلع چمنبہ، دوسری طرف ضلع کرگل کی تحصیل زنسکار، تیسری طرف ضلع اُدھمپور کے صحت افزا مقام پتنی ٹاپ اور چوتھی طرف پیر پنچال میں جواہر سُرنگ تک تھی۔ مرگن اور سنتھن ٹاپ کی پہاڑیاں بھی کشمیر کے ضلع اننت ناگ سے ملتی تھیں۔ ضلع چمنبہ کی کمشنری پانگی سے دریائے چناب (پُرانا نام چندر بھاگا) پاڈر بلاک میں داخل ہوتا ہے جو ضلع ڈوڈہ کا ہی ایک بلاک ہے۔ ضلع ڈوڈہ کا کُل رقبہ 11800 مربع کلومیٹر تھا جو وادیٔ کشمیر کے رقبہ سے صرف 3 ہزار کلومیٹر کم تھا۔ آج اِس ضلع کے تین اضلاع بن گئے ہیں یعنی ضلع رام بن، ضلع کشتواڑ اور ضلع ڈوڈہ۔ اپنی پوسٹنگ کے دوران شاید ہی کوئی گاؤں یا پہاڑ ایسا ہو جہاں خالد حسین پیدل نہ گیا ہو۔ اُن دِنوں ضلع ڈوڈہ کا بیشتر حِصہ سڑکوں کے ساتھ جُڑا ہوا نہیں تھا۔ اور تقریباً سارے بلاکوں کا سفر پیدل یا گھوڑے پر کیا جاتا۔ کشتواڑ سے آگے پاڈر جانے کیلئے تین دِن کا سفر پیدل کرنا پڑتا جبکہ آج کل وہاں پختہ سڑک بن چکی ہے جو پانگی تک جاتی ہے۔ اسی طرح بلاک مڑواہ اور بلاک واڑون جانے کیلئے بھی تین دِنوں کا پیدل سفر کرنا پڑتا۔ کشتواڑ اور ڈُول سے پاڈر اور مچیل یاترا کیلئے بھی پیدل مسافت طے کرنا پڑتی۔ مچیل سے ایک راستہ کرگل کی تحصیل زنسکار (پدم) کو جاتا ہے اور دوسری طرف لیہہ کو۔ اسی طرح ڈوڈہ سے بھا گواہ اور دیسہ کا سفر بھی پیدل تھا۔ وہاں سے پیر پنچال کو عبور کر کے ضلع اننت ناگ کا سیاحتی مقام ویری ناگ کا گاؤں کپرن آتا ہے۔ ڈوڈہ ضلع کی ایک پہاڑی کا نام ہنس راج ٹاپ ہے، جہاں سے تین اضلاع کی حدیں ملتی ہیں۔ اِن سب پسماندہ علاقوں کا دورہ خالد حسین نے پیدل یا گھوڑے پر کیا اور غریب لوگوں کی دادرسی کی۔

یہاں میں ایک ایسے دردناک سفر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا اہم کردار خود خالد حسین تھا۔ اُس وقت کے نوجوان ضلع ترقیاتی کمشنر محمد اقبال کھانڈے نے بلاک پاڈر جانے

کا پروگرام بنایا اور اپنے ساتھ ڈی، آر، ڈی، اے کے پروجیکٹ افسر خالد حسین اور جموں کشمیر بنک کے ڈسٹرکٹ منیجر عبدالرشید تیلی۔ ایس، ڈی، ایم اور تحصیلدار کشتواڑ کو بھی ہمسفر بنایا تا کہ اُس دُوردراز اور پسماندہ علاقے کے لوگوں کے مسائل موقع پر سُنے جائیں اور اُن کو حل کیا جائے۔ بلاک افسر پاڈر نے مویشی اور خچریں خریدنے کے لئے پچاس کیس تیار کئے تھے۔ محکمہ رُورل ڈیولپمنٹ کی طرف سے ان کی خرید کیلئے مالی امداد اور جموں کشمیر بنک نے قرضہ دینا تھا۔ خالد حسین اور اور بنک کے اعلیٰ افسر عبدالرشید تیلی نے فیصلہ کیا کہ اٹھولی (پاڈر کا صدر مقام) میں موقع پر ضلع ترقیاتی کمشنر کی موجودگی میں مقامی لوگوں کو مویشی مہیا کئے جائیں۔ تین دِن کی پیدل مسافت کے بعد وہ لوگ اٹھولی پہونچے تھے۔ رات آرام کرنے کے بعد دوسرے دن لوگوں کے وفود ضلع ترقیاتی کمشنر سے ملتے رہے اور بلاک افسر اور بنک کا برانچ منیجر کیس منظور کروا کر جانوروں کی خرید کروانے لگے۔ اسی اثنا میں کھانڈے صاحب کو وائرلیس پر پیغام ملا کہ وہ فوراً ڈوڈہ پہونچیں کیونکہ اگلے دِن گورنر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اقبال کھانڈے صاحب اُسی وقت ایس، ڈی، ایم، تحصیلدار کشتواڑ اور دوسرے عملے کے ساتھ واپس لوٹ گئے جبکہ خالد حسین اور عبدالرشید تیلی وہاں رُک گئے تا کہ بنک قرضے اور محکمانہ امدادی رقم سے مقامی لوگوں کو جرسی گائے، خچریں اور چنوّر اور چنوریاں (یاک اور گائے کی کراس بریڈ) خرید کر اُنھیں دی جاسکیں۔ کام مکمل کرنے کے بعد خالد حسین، اُسکا ماتحت سرکاری عملہ اور جموں کشمیر بنک کا ضلع منیجر واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ خالد حسین گھوڑے پر سوار تھا جبکہ اُس کا اسسٹنٹ پروجیکٹ افسر ڈاکٹر ریاض عنایت اللہ بھی گھوڑے پر سوار تھا۔ ضلع بنک افسر عبدالرشید تیلی نے ضِد کی کہ وہ بھی گھوڑے پر بیٹھے گا۔ خالد کے منع کرنے کے باوجود وہ نہ مانا۔ لہٰذا اُسکے لئے بھی ایک گھوڑا منگوایا گیا۔ کشتواڑ بلاک کا انسپکٹر دُھونی چند، تین گرام سیوک اور چپڑاسی رات

کوٹھہرنے اور کھانے کا بندوبست کرنے کیلئے علی الصبح شاشو کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس کیلئے
نکل پڑے تھے۔ اور اب صرف خالد حسین۔ عبدالرشید تیلی اور ڈاکٹر ریاض ہمسفر تھے۔
عبدالرشید تیلی اناڑی گھوڑ سوار تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گھوڑا عقل مند جانور ہوتا ہے اور وہ اپنے
سوار کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ جنگل میں پگڈنڈی پر چلتے چلتے ایک پہاڑی کا کونا دیکھ
کر عبدالرشید تیلی سمجھا کہ اُس کا سر پہاڑی کے کنارے سے نہ ٹکرا جائے۔ چنانچہ اُس نے
اپنے بچاؤ کیلئے کنارے کو ہاتھ سے روکا۔ جسکی وجہ سے گھوڑا توازن کھو بیٹھا اور عبدالرشید کا
پاؤں رکاب میں پھنس گیا۔ رکاب سے پاؤں نکالنے کے لئے اُس نے پاؤں کو جھٹکے دیئے۔
اس عمل سے گھوڑا اپنے سوار سمیت گر پڑا اور پگڈنڈی سے نیچے لُڑھک گیا۔ رکاب میں پاؤں
پھنسنے کی وجہ سے گھوڑے نے سوار کو بھی گھسیٹ لیا۔ یوں گھوڑا اور عبدالرشید تیلی لُڑھکتے
لُڑھکتے تقریباً 600 فٹ نیچے دریائے چناب کے پاس پہونچ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر خالد حسین
اور ڈاکٹر ریاض گھوڑوں سے اُترے اور پہاڑی کی ڈھلان کی طرف چھلانگیں ماردیں۔ اُن
کے کپڑے کانٹوں سے پھٹ گئے۔ دونوں عبدالرشید تیلی کے پاس پہونچ گئے جو درد سے
کراہ رہا تھا۔ گھوڑا مر چکا تھا۔ خالد حسین نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ عبدالرشید تیلی کے
بازُو کی ہڈی چکنا چُور ہو چکی تھی۔ کمر کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُس نے پانی مانگا۔ ڈاکٹر ریاض
مُردہ گھوڑے کی کاٹھی کھولنے لگا تا کہ کمبل نکالا جا سکے۔ خالد حسین دوڑ کر چناب دریا کے
کنارے پر گیا اور ہاتھوں میں پانی بھر کر لانے لگا لیکن پانی رشید تیلی تک نہ پہونچ پاتا اور
ضائع ہو جاتا۔ خالد حسین کو ایک مردہ جانور کی کھوپڑی ملی۔ اُسے دھو کر اُس نے پانی بھرا
اور عبدالرشید کو پلایا۔ پھر خالد اور ریاض نے کمبل میں رشید تیلی کو ڈالا اور پہاڑی چڑھنے
لگے۔ کسی غیبی طاقت نے اُنھیں اِتنی ہمت دی کہ وہ اُسے پگڈنڈی پر لے آئے۔ اُس نے
پھر پانی مانگا اور ڈاکٹر ریاض پانی تلاش کرنے کے لئے دوڑا۔ اس دوران عبدالرشید تیلی نے

پیشاب کرنے کیلئے کہا۔ خالد نے اُسکی زِپ کھولی اور پیشاب کرایا۔ اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو چُکا تھا۔ اُس نے خالد حسین کی طرف دیکھا اور دم توڑ دیا۔ ڈاکٹر ریاض صاحب جب پانی لے کر آیا تو عبدالرشید تیلی کی لاش دیکھ کر زاروقطار رونے لگا۔ خالد حسین نے اُسے دلاسہ دیا اور سمجھایا کہ یہ رونے کا وقت نہیں ہے بلکہ لاش کو واپس اٹھولی لے جانے کیلئے انتظام کرنے کا وقت ہے کیونکہ دو تین گھنٹے بعد سورج غروب ہو جائے گا اور رات کے اندھیرے میں لاش کو لے جانا بہت مشکل ہوگا۔ خالد حسین نے ڈاکٹر ریاض کو عبدالرشید تیلی کے جسدِ خاکی کے پاس بٹھایا اور خود شاشو کی طرف چل پڑا جو حادثہ کی جگہ سے تقریباً دس کلومیٹر دُور تھا تا کہ انسپکٹر دُھونی چند اور گرام سیوکوں کو واپس لایا جائے اور لاش کو اٹھولی لے جانے کا بندوبست کیا جاسکے۔ شاشو پہنچ کر جب خالد حسین نے سارا ماجرا بیان کیا تو وہ سبھی رونے لگے۔ پھر وہ سب واپس حادثے والی جگہ کی طرف چل پڑے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ دُھونی چند اکیلا مشعل جلا کر اٹھولی کی طرف نکل گیا اور موضع کجائی اور پڈیرنا سے کچھ لوگوں کو لے کر آیا۔ اُن کے ساتھ ایک چارپائی اور رسّی تھی۔ عبدالرشید تیلی کی لاش کو چارپائی پر لٹایا گیا اور چارپائی کو رسّیوں سے باندھا گیا۔ کیونکہ راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے کئی بار چارپائی کو ٹیڑھا کرنا پڑتا تھا۔ لاش کو لے کر سبھی وہاں سے روانہ ہوئے اور رات دو بجے جب اٹھولی پہونچے تو ساری بستی جاگ رہی تھی اور لوگ جوق در جوق ڈاک بنگلے میں آنے لگے۔ سبھی رو رہے تھے۔ خاص کر عورتیں بین کر رہی تھیں۔ صبح تک آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ آنے لگے۔ خاص کر کجائی اور پڈیرنا سے۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ گذرے کل عبدالرشید تیلی لوگوں میں قرضے کی رقم بانٹ رہا تھا اور آج اُسکی لاش اُنکے سامنے پڑی تھی۔ خالد حسین نے اپنے ڈپٹی کمشنر محمد اقبال کھانڈے کو وائرلیس کے ذریعے اس حادثے کی اطلاع دی اور ہیلی کاپٹر بھیجنے کی گذارش کی تا کہ لاش کو سری نگر لے جایا جاسکے اور لواحقین کے

حوالے کیا جا سکے۔ دِن کے دو بجے ملٹری کا ہیلی کاپٹر اٹھولی پہونچا۔ پائلٹ نے لاش کو ہیلی کاپٹر میں رکھوایا اور خالد حسین کو ساتھ لے کر سری نگر کے لئے روانہ ہو گیا جہاں اُس نے بادامی باغ آرمی کنٹونمینٹ کے ہیلی پیڈ پر لینڈ کیا۔ عبدالرشید تیلی کے جسدِ خاکی کو لینے کیلئے اُس کے اہل خانہ آئے تھے جن میں اُس کا ماموں عبدالصمد تیلی بھی تھا جو اُس وقت نیشنل کانفرنس کا صوبائی صدر تھا۔ عبدالرشید تیلی کی میّت کو اُس کے آبائی قبرستان دُرگجن میں دفنایا گیا۔ خالد حسین جنازے میں شامل ہوا۔ قبر پر مٹی ڈالی اور دُعائے مغفرت پڑھ کر واپس ڈوڈہ آ گیا۔

بٹوت سے ڈوڈہ جاتے ہوئے عسّر بلاک کے دو گاؤں بگھّر اور عسّر آتے ہیں۔ اِن دیہات کے بالکل سامنے والی پہاڑی پر ''ٹاپ نیل'' کا گاؤں ہے۔ وہاں جانے کیلئے دریائے چناب پر بنے رسّیوں کے پُل کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ''ٹاپ نیل'' میں عسّر بلاک کی طرف سے ہائی سکول کی عمارت بن رہی تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگ خالد حسین کے دفتر آئے اور شکایت کرنے لگے کہ ٹھیکیدار مقامی گرام سیوک کے ساتھ مل کر گھٹیا میٹریل استعمال کر رہا ہے۔ اُس نے سیمنٹ بیچ دیا ہے اور چھت پر ڈالنے کیلئے لوہے کی چادریں (سی، جی، آئی شیٹ) بھی فروخت کر دی ہیں۔ خالد حسین نے خود موقع ملاحظہ کرنے کا فیصلہ لیا۔ اُس نے بلاک ڈیولپمنٹ افسر عسّر، جونیئر انجینئر اور گرام سیوک کو ساتھ لیا اور فجر کی نماز کے بعد چلنا شروع کیا۔ بگھّر کی سڑک سے ٹاپ نیل بڑا نزدیک دِکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب اُنہوں نے بگھّر سے ٹاپ نیل کا سفر شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ لوہے کے چنے چبانے والا معاملہ ہے۔ تین گھنٹے سے زیادہ تو بگھّر سے چناب دریا پر بنے رسیّوں کے پُل تک پہونچنے میں لگے حالانکہ خالد حسین، بی، ڈی، او اور انجینئر گھوڑوں پر سوار تھے۔ وہاں اُن کے لئے ناشتے کا انتظام کیا گیا تھا۔ برف باری کی وجہ سے راستے میں بہت زیادہ پھِلسن تھی اور گھوڑے اپنا توازن

برقرار نہیں رکھ پا رہے تھے، چڑھائی بھی خطرناک تھی۔ انجینئر غلام حسین سلہریا اور گرام سیوک کیشو رام ٹھاکر نے مشورہ دیا کہ گھوڑوں سے اُترا جائے۔ ورنہ کوئی بھی حادثہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اب سبھی پیدل چلنے لگے۔ پگڈنڈی کا راستہ اتنا دشوار گذار تھا کہ کئی جگہ ہاتھوں سے برف صاف کر کے پتھر یا درخت کو سہارے کے لئے پکڑا جاتا۔ جب یہ قافلہ ٹاپ نیل پہونچا تو اُس وقت رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ہمارے ٹھہرنے کا انتظام سرپنچ کے گھر کیا گیا تھا۔ تھکاوٹ سے سب نڈھال ہو چکے تھے۔ سرپنچ کے بیٹوں نے گرم پانی میں نمک ڈال کر اُن کے پاؤں دُھلائے۔ رات کا کھانا کھا کر خالد حسین، اُسکے لئے تیار کئے گئے کمرے میں چلا گیا اور سو گیا صبح جب وہ اُٹھا تو ناشتہ تیار تھا اور گاؤں کے لوگ سرپنچ کے صحن میں بیٹھے تھے تا کہ اے، سی، ڈی ڈوڈہ خالد حسین کو دیکھ سکیں اور اپنے مطالبے پیش کرسکیں۔ پھر وہ سکول کی زیرِ تعمیر بلڈنگ دیکھنے چلا گیا جو وہاں سیت قریباً ایک کلومیٹر دور تھی۔ سکول کی عمارت پر ٹین کی چادروں کا چھت پڑ چکا تھا۔ صرف اندر پلستر کا کام چل رہا تھا۔ گاؤں والے ٹھیکیدار کی تعریف کر رہے تھے۔ دراصل شکایت کُنندہ اور اُسکے ساتھیوں کو اس بات کی تکلیف تھی کہ اُن کو کام نہیں ملا تھا۔ اس قسم کی شکایات اُن علاقوں میں عام ہوتی ہیں۔ وہاں خالد حسین کو ایک بوڑھا براہمن ملا۔ پورے گاؤں میں صرف وہی ہندو تھا جو اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ وہاں رہتا تھا۔ باقی کا سارا گاؤں مُسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ پوچھنے پر بوڑھے پنڈت نے بتایا کہ یہاں کی ساری آبادی کے پُرکھے ہندو تھے اور یہ سب اُن کی اولاد ہیں۔ صرف میرا خاندان اپنے دھرم پر قائم رہا۔ اُس بوڑھے پنڈت نے مانگ کی کہ گاؤں کے واحد پُرانے مندر کی مرمت کرائی جائے اور اُس سے ملحقہ میدان میں شردھالوؤں/ زائرین کے ٹھہرنے کیلئے سرائے بنا کردی جائے تا کہ سالانہ میلے پر یاتریوں کے رہنے کا انتظام ہو سکے۔ خالد حسین بلاک افسر کو ساتھ لیکر موقع پر گیا تو اُس نے دیکھا کہ

پانی کا ایک قدرتی جھرنا بہہ رہا ہے اور اُس جھرنے کے اندر چھوٹا سا انتہائی خوبصورت مندر بنا ہے جس میں شری رام، سیتا اور لچھمن کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں رکھی گئی ہیں۔ بوڑھے براہمن کا کہنا تھا کہ مندر کو بڑا کیا جائے لیکن خالد حسین نے اُسے سمجھایا کہ یہ مندر یقیناً اُن کے بزرگوں نے بنایا ہوگا۔ اس لئے مندر کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ پُرانے زمانے کی نشانی سمجھ کر اسکی حفاظت کی جائے۔ البتہ ساتھ ملتے میدان میں زائرین کے لئے ایک بڑی سرائے بنائی جائے گی اور ایک خوبصورت باغ بھی بنایا جائے گا تا کہ دھارمک میلے میں آنے والے یاتری لُطف اندوز ہو سکیں۔ بوڑھا براہمن بہت خوش ہوا۔ پھر وہ خالد حسین کو تقریباً ایک کلومیٹر دُور ایک ایسی جگہ پر لے گیا جہاں پتھر سے تراشا ہوا ایک گھوڑا کھڑا تھا جو ہاتھ لگانے سے ہلتا تھا۔ بوڑھے براہمن نے بتایا کہ اس گھوڑے کا چمتکار یہ ہے کہ اس پر بیٹھنے سے یہ ہلتا نہیں بلکہ ساکن رہتا ہے۔ جب خالد حسین اُس پر بیٹھا تو وہ مضبوط کھڑا تھا اور اُس کا ہلنا بند ہو گیا تھا۔ بی، ڈی، او الطاف حسین بابا نے کیمرے سے تصویریں کھینچیں جن میں خالد حسین گھوڑے پر سوار ہے۔ بعد ازاں خالد حسین نے خود مجھے یہ تصاویر دکھائی تھیں۔ گاؤں میں اُس وقت تقریباً اڑھائی، تین سو افراد رہتے تھے۔ وہ کشمیری اور سراجی بولیاں بولتے تھے۔ رام بن، رام سُو سے لے کر ڈوڈہ، بھاگواہ اور کاستی گڑھ وغیرہ سارا علاقہ مقامی بولی سراجی ہی بولتا ہے یا پھر کشمیری۔ کشتواڑ سے لے کر رام بن تک چناب دریا کے دونوں اطراف کے علاقے کو سراج بھی کہا جاتا ہے۔ خالد حسین نے پتھروں کو تراش کر بنائے گئے اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے گھوڑے گُول کے علاقے میں بھی دیکھے تھے۔ گھوڑا گلی نام کے اس علاقے میں جو بھی افسر دورے پر جاتا تو وہ وہاں سے ایک آدھ گھوڑا اپنا ڈرائنگ روم سجانے کیلئے لے آتا۔ لیکن اب مقامی لوگ کسی کو بھی پتھر کے یہ گھوڑے لے جانے نہیں دیتے۔ اپنے اجداد کی یہ نشانیاں وہ اب سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اِن پہاڑی علاقوں میں پانی

کے چشموں پر بنے سنگ تراشی کے کئی خوبصورت نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ جنکو دیکھ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ پُرانے زمانے میں لوگ اِن دشوار گذار علاقوں میں کِس طرح سنگ تراشی کرتے تھے۔

یہ شاید 15 اگست 1992ء کی بات ہے جب میں اور خالد حسین دیگر ضلع افسران کے ساتھ یومِ آزادی کی پریڈ میں شمولیت کے بعد ڈپٹی کمشنر عبدالرشید پرے کی طرف سے دیئے گئے ظہرانے میں شرکت کرنے کیلئے اُن کی سرکاری رہائش پر تھے کہ اُسی وقت ایس، ایس، پی اشوک گپتا اور ڈی، آئی، جی انوپ سنگھ کو ڈی، ایس، پی بھدرواہ کا وائرلیس پیغام ملا کر سرتھل کے جنگل میں پولیس نے ملی ٹینٹوں کو گھیر لیا ہے اور جلد ہی اُن کا صفایا کر دیا جائے گا۔ ڈوڈہ ضلع کے سپرانٹنڈنٹ پولیس شری اشوک کمار گپتا نے فوری طور پر بھدرواہ جانے کا فیصلہ کیا تا کہ سرتھل میں پولیس فورس کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ اُنہوں نے اپنی سرکاری جیپ کے بدلے خالد حسین کی جیپ میں جانے کو ترجیح دی۔ خالد حسین نے اپنے ڈرائیور کلبھوشن سنگھ کو حکم دیا کہ وہ ایس، ایس، پی صاحب کے ساتھ بھدرواہ جائے اور اُن کے ساتھ ڈیوٹی دے جب تک کہ وہ واپس نہیں آجاتے۔ اشوک گپتا صاحب بھدرواہ سے سیدھا سرتھل چلے گئے اُن کی دیکھا دیکھی اُدھمپور۔ ڈوڈہ رینج کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس انوپ سنگھ جی کی جیپ بھی جب وہاں پہونچی تو ملی ٹینٹوں نے ہتھ گولے پھینکے۔ جس کی وجہ سے انوپ سنگھ جی زخمی ہو گئے۔ ڈرائیور اور دو سپاہی بھی زخمی ہوئے جبکہ جیپ کے پرخچے اُڑ گئے۔ اُدھر سرتھل کے جنگل میں ملی ٹینٹوں نے پولیس کا گھیرا توڑ کر پولیس کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور پولیس کے آٹھ سپاہی شہید ہو گئے جبکہ S.S.P اشوک گپتا کو ایک گولی گردن میں لگی اور اُنھیں ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر جموں کے ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ وہ گولی آج بھی اشوک گپتا جی کی گردن میں پھنسی ہے۔ ڈاکٹروں نے گولی کو اسلئے نہیں نکالا کہ اُس سے

اُنھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ پولیس کے سپاہیوں کی جانیں تلف ہونے کی وجہ سے بھدرواہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے اُس وقت کے ضلعی صدر دیا کرشن کوتوال نے ہڑتال کی کال دی تھی۔ خالد حسین کا ڈرائیور بھی ہڑتال کی وجہ سے بھدرواہ میں پھنس گیا تھا۔ مقامی مسلمانوں اور ہندوؤں میں تلخی بڑھتی جارہی تھی اور کئی بار ایک دوسرے کے گھروں اور دُکانوں پر حملے ہورہے تھے۔ حالات بہت کشیدہ تھے۔ آخر ضلع انتظامیہ نے کرفیو لگادیا۔ اُسی بیچ ڈپٹی کمشنر نے خالد حسین کو مرحوم دیا کرشن کوتوال (جو بعد میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے ریاستی صدر بنے) سے ملنے اور حالات بہتر بنانے میں اُن کی مدد لینے کے لئے کہا۔ اُدرانا (گاٹھا) میں اُن کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ اُس کے بعد جامع مسجد بھدرواہ میں مُسلم نمائندوں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ بات واضح طور پر اُبھری کہ سبھی امن چاہتے ہیں۔ دو دِن کی بات چیت کے بعد کرفیو اُٹھالیا گیا اور خالد حسین اپنے ڈرائیور کلبھوشن کے ساتھ واپس ڈوڈہ آ گیا۔

جن دِنوں خالد حسین پونچھ ضلع میں اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ تعینات تھا۔ اُن دِنوں وہاں بھی مِلی ٹینسی عروج پر تھی۔ پونچھ ضلع تین اطراف سے پاکستانی انتظام والے کشمیر سے گِھرا ہوا ہے۔ آزادی سے پہلے پونچھ جاگیر کی چار تحصیلیں تھیں جن میں اب ہمارے پاس صرف ڈیڑھ تحصیل ہے جبکہ اڑھائی تحصیلیں پاکستانی انتظامیہ کشمیر میں شامل ہیں۔ یعنی تحصیل مینڈھر اور تحصیل حویلی کے 83 گاؤں۔ پونچھ پہاڑوں اور جنگلات سے بھرا علاقہ ہے۔ مِلی ٹینٹ سرحد عبور کرنے کیلئے کپواڑہ کے علاوہ یہ راستے بھی استعمال کرتے تھے، اور اِن راستوں سے ہی کشمیر میں اپنی کاروائیاں کرتے تھے۔ حالات بہت خراب تھے۔ پولیس، سیکورٹی فورس اور فوج کے ساتھ اُن کے مقابلے تقریباً روز ہوتے رہے۔ سرکار نے ضلع پونچھ اور ضلع راجوری کیلئے ایک خصوصی کمشنر شری سُدھر سنگھ بلوریہ کو تعینات کیا گیا۔

پونچھ میں اُس وقت ڈپٹی کمشنر پی، دھرچکروتی اور پولیس سربراہ پتمبر لال گپتا تھے۔ڈپٹی کمشنر پونچھ اور راجوری دونوں سپیشل کمشنر بلوریہ صاحب کے ماتحت تھے اور اُنھیں ہی جواب دہ تھے۔مِلی ٹینسی کے اُس ماحول میں خالد حسین پونچھ کے بلاکوں، پنچایتوں اور دیہاتوں کے دورے کرتا اور بے روزگار نوجوانوں کو بلاک کے چھوٹے چھوٹے کام دیتا۔ اُسے دوست احباب مشورہ دیتے کہ وہ اکیلے دُور دُراز علاقوں میں نہ جایا کرے۔لیکن خالد حسین کا جواب ہوتا کہ جو گولی اُس کے لئے بنی ہے وہ اُسے ضرور لگے گی اور جو نہیں بنی، وہ اُسے کبھی نہیں لگ سکتی۔ باقی زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔بچوں کو ملی ٹینٹوں کی صفوں میں جانے سے روکنے کے لئے خالد حسین نے ڈپٹی کمشنر پی، دھرچکروتی کو صلاح دی کہ ''پونچھ میلہ'' کے عنوان سے بلاک اور ضلعی سطح پر کھیل کُود اور کلچرل پروگرام کرایا جائے۔سب سے پہلے پنچایت کی سطح پر کھیلوں کے مقابلے کرائے جائیں۔فاتح ٹیموں کا مقابلہ بلاک کی سطح پر کرایا جائے اور پھر بلاک لیول پر کامیاب ہونے والی ٹیموں کا مقابلہ ضلع کی سطح پر کرایا جائے۔ اس طرح نوجوانوں کا ذہن کھیلوں اور تمدنی پروگرام میں لگا رہے گا اور وہ بنیاد پرستی سے بچے رہیں گے۔چکرورتی کو خالد حسین کا مشورہ بہت پسند آیا۔اُنہوں نے سپیشل کمشنر سُدھرسنگھ بلوریا صاحب سے بات کی۔وہ بھی اس پرپوزل سے خوش ہوئے۔ اس بڑے پروگرام کیلئے سرکار نے فنڈ مہیا کرادیئے۔ چکرورتی صاحب نے خالد حسین کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی جس میں خوش دیومینی بھی ایک ممبر تھا جو اُردو، پنجابی اور پوٹھواری کا ایک مشہور ادیب اور شاعر ہے۔دونوں نے مل کر مختلف پروگرام تیار کئے۔ کھیلوں کے آخری مقابلے پونچھ میں کروانے کے علاوہ مشاعرے اور سنگیت کے رنگارنگ پروگرام ضلعی سطح پر منعقد کرانے کا فیصلہ لیا گیا اور نارتھ زون کلچرل سنٹر پٹیالہ کے ڈائریکٹر کو چٹھی لکھ کر پنجاب کے آرٹسٹوں کو پروگرام میں شرکت

کرنے کیلئے کہا گیا۔ ''پونچھ میلہ'' دو دِن تک کرایا گیا۔ کبڈی، والی بال، فُٹ بال اور کرکٹ کے مقابلے ہوئے۔ پورن چند وڈالی اور پیارے لال وڈالی، بھائیوں کو بُلایا گیا۔ اُنہوں نے اپنے پنجابی گیتوں سے میلہ لوٹ لیا۔ سرُدول سکندر اور اُسکی پارٹی نے پونچھ کے لوگوں کا دِل جیت لیا۔ پنجاب کی لڑکیوں نے گِدا ڈالا اور مقامی لڑکوں کے بھنگڑا ناچ سے لوگ خُوب محظوظ ہوئے۔ پونچھ میلہ بہت کامیاب رہا۔ اسکے علاوہ خالد حسین نے دہلی کی مشہور قوالن چنچل بھارتی کو پونچھ میں آنے کی دعوت دی۔ اُس نے پونچھ کے میونسپل ہال میں قوالیوں کا زبردست پروگرام پیش کیا اور مقامی لوگ کئی دِنوں تک سنگیت کی مستی میں ڈُوبے رہے۔ ملی ٹینسی کے باوجود سُدھر سنگھ بلوریا صاحب (آئی، اے، ایس) نے لورن سے کُچھ دُور ننندی شُول آبشار پر جانے کا پروگرام بنایا۔ چکرورتی صاحب، ایس، ایس، پی پتمبر لال گپتا اور خالد حسین اِس دورے میں بلوریا صاحب کے ہم سفر تھے۔ ننندی شُول لورن کے موضع سُلطان پتھری سے چھ کلومیٹر دُور ہے۔ اس آبشار کا پانی دراصل پیر پنچال پہاڑی درے سے ایک گلیشیئر پر گرتا ہے۔ جس کی وجہ سے گلیشئر میں ایک بہت بڑا سوراخ ہو گیا ہے۔ اور تقریباً 150 فٹ گہرا کنواں بن گیا ہے۔ آبشار کا پانی اس کنویں میں گرنے سے قوس قزح بن جاتی ہے۔ یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پہاڑی کے دوسری طرف ضلع بڈگام کا توش میدان کا علاقہ ہے۔ بلوریا صاحب کے حکم پر خالد حسین نے مقامی بلاک افسر کو وہاں سیاحوں کیلئے ٹورسٹ ہٹ بنانے کیلئے کہا۔ اسی طرح ایک بار پھر بلوریا صاحب نے مغل روڈ پر پونچھ ضلع کے آخری گاؤں ''پوشانہ'' جانے کا پروگرام بنایا۔ خالد حسین کے علاوہ کئی دیگر ضلعی افسر بھی اس سفر میں اُن کے ساتھ تھے۔ مغل روڈ جھنگڑ، نوشہرہ، راجوری، تھنہ منڈی، ڈیرا گلی، بہرام گلا، نُوری چھم، چندی مڑھ، ڈوگریاں اور پوشانہ سے ہوتی ہوئی پیر کی گلی تک جاتی ہے اور کشمیر کے ضلع شوپیاں سے جاملتی ہے۔ اُن دِنوں پیدل

سفر ہوا کرتا تھا۔ جب کہ آجکل موٹر والی سڑک بن چکی ہے۔ اس سڑک پر جگہ جگہ مغل سرائے بنی ہیں۔ نُوری چھم کی آبشار ملکہ نُور جہاں سے منسوب ہے۔ اِس آبشار میں ملکہ نُور جہاں نہایا کرتی تھی اور ایک قدآور شیشہ بھی پہاڑی کو تراش کر فِکس کیا گیا تھا جِسے خالد حسین نے 1990ء میں خود دیکھا تھا لیکن اب وہ شیشہ وہاں نہیں ہے۔ البتہ نشان باقی ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کی وفات بھی اسی مغل روڈ پر پیر گلی کے پاس ہوئی تھی۔ اس خبر کو پوشیدہ رکھنے کے لئے شاہی طبیب نے جہانگیر کا پیٹ چاک کیا اور ساری گندگی باہر پھینک دی۔ انتڑیوں اور اُوجھری کو چنگس کی سرائے میں دفن کردیا۔ پیر کی قبر سمجھ کر لوگ وہاں منّت مانتے ہیں اور نذر نیاز دیتے ہیں۔ اُنھیں کون بتائے یہاں انتڑیاں دفن ہیں۔ انتڑیوں کو تُرکی زبان میں چنگس کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس موضع کا نام بھی چنگس ہے۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ مغلوں کی بنائی ہوئی سرائیوں میں پہلے مغل رہا کرتے تھے۔ پھر پٹھان، پھر سکھ اور پھر ڈوگرہ سپاہی۔ اور آجکل یہ سرائیں بھارتی فوج کے استعمال میں ہیں۔ مغل روڈ کا علاقہ انتہائی خوبصورت ہے۔ آب وہوا کے لحاظ سے، چراگاہوں کے لحاظ سے اور سرسبز میدانوں کی وجہ سے۔ پونچھ اور راجوری کے لوگوں کے لئے کشمیر جانے کا یہ مختصر ترین راستہ ہے لیکن صرف چھ مہینوں کیلئے کھُلا رہتا ہے۔ اگر پوشانہ سے ڈُگجن (ڈُگجی) تک ٹنل بن جائے تو یہ راستہ پورا سال کھُلا رہ سکتا ہے اور بانہال کارٹ روڈ پر ٹریفک کا دباؤ کم ہوسکتا ہے۔ پوشانہ کے لوگ کشمیری اور پہاڑی (پوٹھوہاری) زبانیں بولتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے راشن، تیل خاکی اور دیگر سہولتیں اِن لوگوں کو میسر ہیں لیکن لگ بھگ یہاں کی ساری آبادی صرف تین مہینے یہاں گذارتی ہے باقی نو مہینے یہ تھنہ منڈی میں رہتے ہیں جہاں ان لوگوں نے پختہ مکانات تعمیر کئے ہیں۔

نوری چھم سے دائیں طرف ایک پیدل راستہ پیر پنچال کے سلسلہ کوہ میں واقع اٹھارہ

جھیلوں کی طرف جاتا ہے۔ جو اپنے شفاف پانی اور چراگاہوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ جھیلیں راجوری کے درہال کی چوٹی سے آنے والے راستے میں بھی پڑتی ہیں۔ اگر اِن جھیلوں تک سرکار موٹر سڑکیں بنا دے تو جموں خطے میں یہ اہم سیاحتی مرکز بن سکتا ہے۔ یا ہیلی کاپٹر سروس شروع کرے تو سیاح یہاں آکر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اب تک تو صرف گوجر بکروال اور گدی ہی اِن جھیلوں اور ملحقہ چراگاہوں کا لُطف اُٹھاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مویشی، بھیڑ بکریاں اور گھوڑے لیکر یہاں گرمیوں کا موسم گذارتے ہیں۔ اِن جھیلوں کے کُچھ نام اس طرح ہیں۔ نندن سر، کٹوری سر، چندن سر، اکال دچھنی، بھاگ سر، سمور سر، دیپا سر اور کوثر سر۔ (کوثر ناگ) کوثر سر جانے کیلئے ایک راستہ شوپیاں سے بھی جاتا ہے۔ خالد حسین نے اس طرح کے کئی ایڈونچرز کئے تھے اور کئی بار تو وہ موت کے مونہہ سے بچ کر نکلا تھا۔ دو بار تو وہ دچھن، مڑھوا اور واڑون پیدل گیا اور مرگن کا پہاڑ عبور کر کے اننت ناگ کے آخری گاؤں لہنون کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ اسی طرح دوبارہ چھاترو سے مغل میدان اور سِنتھن ٹاپ کو پار کرتا ہوا ڈُکسم اور گُگر ناگ گیا۔ ان پسماندہ علاقوں میں جانے سے خالد حسین کو لوگوں کی غربت کا اندازہ ہوا۔ اُن کے مسائل سمجھنے اور اُن کو حل کرنے کا موقع ملا۔ خالد حسین کی کئی کہانیوں کے پلاٹ انہی علاقوں سے منسُوب تھے۔ ان علاقوں میں جا کر خالد حسین کے اندر کا ادیب نئے اور ان چھُوئے موضوع تلاش کرتا تھا ہم دونوں نے مل کر ڈوڈہ اور جموں میں کئی ادبی پروگرام کئے۔ جن کا ذکر میں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ اُس زندہ دِل انسان کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس عطا کرے۔ آمین۔

اِس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھُول گئے
اِک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص ہمیشہ یاد رہا
(نوشی گیلانی)

سورج کا مرثیہ

کس کو غم ہے جو کرے مرثیہ خوانی میری
رو رہی ہے میرے مرقد پہ جوانی میری
(فانی بدایونی)

شیخ۔اندرا سمجھوتے کی بدولت جموں کشمیر میں کانگریس کی سرکار ختم کردی گئی اور وزیراعلیٰ سید میر قاسم نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے لئے کُرسی خالی کردی۔اِس سمجھوتے سے پہلے شیخ محمد عبداللہ کی سرکار کو ایک سازش کے تحت بھارت سرکار نے 9 اگست 1953ء کو برخاست کردیا تھا اور اُنھیں آدھی رات کو گُل مرگ سے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ جبکہ اُس وقت ریاستی اسمبلی میں شیخ عبداللہ کی مکمل اکثریت تھی اُس وقت شیخ صاحب کی صرف یہ مانگ تھی اُس الحاق نامے پر پوری طرح سے عمل کیا جائے جس پر مہاراجہ ہری سنگھ نے بحیثیتِ سربراہ ریاست جموں وکشمیر اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بحیثیت گورنر جنرل بھارت دستخط کئے تھے۔شیخ مرکزی سرکار پر زور دے رہے تھے کہ اُن تمام شرائط پر عمل کیا جائے جو الحاق نامہ میں درج ہیں اور جن پر عمل کرنے کی منظوری اور یقین دہانی گورنر جنرل نے دی تھی لیکن ایسا نہیں ہو پا رہا تھا۔مرکزی سرکار وعدہ خلافی پر اُتر آئی تھی۔بات چیت کا ایک نیا دور شروع ہوا اور 1952ء میں ایک نیا سمجھوتہ عمل میں لایا گیا۔جسے 1952ء کا ''دِلی اگریمینٹ'' کہا جاتا ہے۔جب نئے سمجھوتے پر بھی بھارت سرکار نے عمل کرنے میں آنا کانی شروع کی تو شیخ صاحب نے مرکزی سرکار کے خلاف بیان بازی شروع کردی، اور دِلّی

سرکار نے شیخ عبداللہ کے دست راست بخشی غلام محمد، شیام لعل صراف اور دُرگا پرشاد دھر کو ساتھ ملا لیا۔ شیخ صاحب کی حکومت ختم کردی اور بخشی غلام محمد کو نیا وزیر اعظم بنا دیا۔

''دستاویز الحاق'' کا پس منظر یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے فارمولہ کے مطابق انگریز سرکار کے ماتحت علاقے مذہبی بُنیاد پر تقسیم کئے جائیں یعنی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ علاقے پاکستان میں اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان میں رہیں گے۔ چنانچہ مُسلم اکثریتی علاقے پنجاب اور بنگال تقسیم کردیئے گئے جب کہ سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (خیبر پختون خواہ) مکمل طور پر پاکستان میں آگئے۔ تقسیم کے فارمولہ کے مطابق انگریز سرکار کی خراج گذار نیم خودمختار ریاستوں کے مہاراجوں اور نوابوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کے مجاز ہیں۔ نظام حیدرآباد دکن (موجودہ آندھرا پردیش اور تامل ناڈو کا حِصہ) اور نواب جُوناگڑھ (موجودہ ریاست گجرات کا حِصہ) نے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کردیا لیکن بھارت سرکار نے نظام اور نواب کے فیصلہ کو اِس بنا پر ماننے سے انکار کردیا کہ اِن دونوں ریاستوں میں ہندو اکثریت میں ہیں۔ جبکہ مُسلم آبادی کا تناسب تقریباً 20 فیصدی ہے۔ لہٰذا بھارت سرکار نے فوج کشی کرکے دونوں ریاستوں پر قبضہ کرکے اُن کو بھارت میں ضم کرلیا۔ نظام حیدرآباد کو قید کرلیا گیا جبکہ نواب جُوناگڑھ پاکستان بھاگ گیا۔

ریاست جموں و کشمیر کی حالت بھی کُچھ ایسی ہی تھی۔ یہاں مسلم اکثریت کا تناسب 79 فیصد تھا جبکہ مہاراجہ ہندو تھا جو ریاست جموں و کشمیر کو خودمختار رکھنا چاہتا تھا۔ اُسکی مرضی تھی کہ دونوں مُلک ریاست کے دفاع کی ذمہ داری لیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ پاکستان اور ہندوستان کی سرکاروں کے ساتھ اِس موضوع پر بات چیت کرتا رہا لیکن دونوں ملکوں کے سربراہان کا موقف یہ تھا کہ تقسیم کے فارمولہ کے مطابق مہاراجہ کو ہندوستان یا پاکستان میں

سے ایک مُلک کو چُننا ہوگا۔ پاکستان کے دباؤ میں آکر مہاراجہ ہری سنگھ نے Stand Still (جُوں کا تُوں) معاہدہ کیا اور ڈاک اور تار کا نظام پاکستان کی حکومت کے حوالے کر دیا جو کچھ دیر تک قائم رہا۔ ریاست کے سبھی ڈاک خانوں پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اِس دوران مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت سرکار کے ساتھ بھی بات چیت جاری رکھی اور کہا کہ وہ ریاست کی خودمختار حیثیت کو تسلیم کرے۔ بات چیت کا سلسلہ دونوں ملکوں کے ساتھ چلتا رہا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ ان حالات میں پاکستان کی سرکار نے صوبہ خیبر پختون خواہ کے علاقے وزیرستان اور ہزارہ ڈویژن کے آفریدی قبائلی سرداروں سے رابطہ کیا اور اُنھیں ریاست پر حملہ کرنے کیلئے تیار کیا۔ معاہدہ کے مطابق علاقہ پاکستان کو ملنا تھا اور مالِ غنیمت قبائلیوں کو۔ چنانچہ 22 اکتوبر 1947ء کو قبائلی مظفرآباد پر قابض ہوئے اور برق رفتاری سے یلغار کرتے ہوئے اوڑی اور بارہ مولہ پر قبضہ کر لیا۔ مہاراجہ نے پٹیالہ، نابھہ اور کپُورتھلہ کے حکمرانوں سے فوجی امداد طلب کی لیکن قبائلیوں کی پیش قدمی نہیں رُک سکی۔ پنجاب سے آنے والی فوج کا بھی بہت جانی نقصان ہوا۔ اس حملے میں قبائلیوں کا صلاح کار اور حکمت عملی میں معاون کا کردار پاکستان کی فوج کا میجر اکبر خان کر رہا تھا۔ جب قبائلیوں کی پیش قدمی نہ رُکی اور اُنکی کچھ ٹکڑیاں نار بل (شالہ ٹینگ) تک پہونچ گئیں تو مہاراجہ اپنے خاندان اور ذاتی عملہ کے ساتھ کشمیر سے بھاگ گیا۔ رات اُس نے اُدھمپور کے تارا نواس پیلس میں گذاری اور دوسرے دِن جموں پہونچ گیا۔ لیکن بقول میجر اکبر خان (جو بعد میں میجر جنرل بنا) قبائلیوں کا سردار مانگ کرنے لگا کہ پاکستان کی سرکار اُسے کشمیر کا سلطان تسلیم کرے ورنہ اُسکے قبائلی دستے آگے نہیں جائیں گے۔ (Raiders in Kashmir) جموں پہونچ کر مہاراجہ نے بھارت سرکار سے فوجی مدد کیلئے گذارش کی لیکن بھارت سرکار نے الحاق کی شرط رکھی جو مجبوراً مہاراجہ ہری سنگھ کو تسلیم کرنا پڑی۔ اُدھر قبائلیوں

کے کچھ دستے میرپور، کوٹلی، بھمبر، باغ، سدھنوتی، راولاکوٹ اور نیلم گھائی کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ گلگت بلتستان گو کہ ریاست جموں وکشمیر کا حصہ تھا لیکن جغرافیائی اعتبار سے اہم علاقہ ہونے کی وجہ سے انگریز سرکار نے اسے اپنی عملداری میں رکھا تھا۔ اور وہاں انگریز حکومت کی فوج اور رزیڈنٹ مستقل رہتا تھا۔ تقسیم سے کوئی دو مہینے پہلے گلگت، بلتستان کا علاقہ مکمل طور پر انگریز حکومت نے مہاراجہ ہری سنگھ کے حوالے کر دیا۔ مہاراجہ نے بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کو گلگت کا گورنر بنا کر بھیجا اور اُسکے ساتھ فوج کی ایک بٹالین بھی روانہ کی جس کی سربراہی کرنل عبدالمجید خان دُرانی کر رہا تھا۔ قبائلی حملے کی وجہ سے پوری ریاست میں افراتفری اور قتل وغارت کا ماحول بنا ہوا تھا جس کا فائدہ گلگت بلتستان کے عوام نے اُٹھایا اور اُنکی مدد انگریز سرکار کے فوجی افسر میجر اسکارٹ نے کی۔ اُس نے اپنے ماتحت گلگت سکاؤٹ کے فوجیوں کو اُکسایا اور اُنہوں نے ڈوگرہ فوج پر حملہ کر دیا۔ ساری فوج ماری گئی۔ گورنر گھنسارا سنگھ، کرنل عبدالمجید دُرانی اور دیگر افسران کو قیدی بنا کر اٹک جیل میں رکھا گیا۔ اُن لوگوں کی رہائی تب ممکن ہوئی۔ جب دونوں ملکوں میں جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہوا۔ گھنسارا سنگھ کے بدلے پاکستان کی ہوائی فوج کے پہلے سربراہ ایئر مارشل اصغر خان کے والد بریگیڈیئر رحمت اللہ خان کو پاکستان کے حوالے کیا گیا۔ رحمت اللہ خان جموں کے رہنے والے تھے اور محلّہ دلپتیاں کے کوچہ سمندر خان میں اُنکی کوٹھی آج بھی موجود ہے۔ اب میں یہاں ''دستاویز الحاق'' کے بارے میں چند حقائق درج کرنا چاہتا ہوں۔

قبائلی حملے کے فوراً بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے مورخہ 26 اکتوبر 1947ء کو گورنر جنرل ہندوستان کو ایک خط تحریر کیا جس کی تلخیص یوں ہے۔ ''جموں کشمیر کی سرحدیں پاکستان اور ہندوستان دونوں سے ملتی ہیں۔ ریاست اقتصادی اور تمدنی طور پر بھی دونوں ملکوں سے جُڑی ہے۔ اسکے علاوہ ریاست کی سرحدیں چین اور روس کے ساتھ بھی ملتی ہیں۔ لہذا وہ چاہتے

تھے کہ جموں وکشمیر ایک آزاد ریاست کے طور پر قائم رہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے پاکستان کے ساتھ Stand Still کا معاہدہ کیا لیکن حالات تب بدتر ہو گئے جب آفریدی پٹھانوں کے قبائلی پونچھ، مظفر آباد، سیالکوٹ اور کئی دوسرے راستوں سے ریاست میں داخل ہو گئے۔ اُنہوں نے موہرا پاور ہاؤس کی سپلائی کاٹ دی۔ عورتوں کی عصمت دری کی اور وہ سری نگر پر قبضہ کرنے کیلئے پیش قدمی کرر ہے ہیں۔ یہ کام پاکستانی سرکار کی اجازت کے بغیر ناممکن تھا کیونکہ قبائلیوں کے پاس جدید ہتھیار رہیں۔ یہاں کے حالات کی مکمل جانکاری شری وی، کے مینن کو ہے جو آپ کو تفصیل سے بتائیں گے۔ ان حالات میں ہندوستان کی حکومت کے ساتھ الحاق کرنے کو تیار ہوں اور میں نے دستاویزِ الحاق تیار کی ہے اور اپنے دستخط ثبت کر دیئے ہیں۔

آپ کا مخلص — جلد بازی میں اور انتہائی احترام کے ساتھ

ہری سنگھ — دی پیلس۔ جموں

مورخہ۔ 26 جنوری 1947ء"۔

اس خط کے جواب میں گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواباً لکھا،

"اِن خصوصی حالات کے پیش نظر جنکا آپ نے ذکر کیا ہے، الحاق کے دستاویز کو تسلیم کرتا ہوں جب کشمیر میں حالات سازگار ہو جائیں گے اور قانون کی حکمرانی قائم ہوگی اور ریاست کو حملہ آوروں سے آزاد کرا لیا جائے گا تو عوام کی خواہشات کے مطابق ریاست کے مکمل الحاق کا حتمی فیصلہ کر لیا جائے گا۔ دریں اثنا میں نے فوج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ ریاست کی سالمیت اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کیلئے فوری طور پر قدم اُٹھائے۔ میری حکومت کو اس بات سے اطمینان ہوا ہے کہ آپ نے شیخ محمد عبداللہ کو عارضی سرکار بنانے اور آپ کے وزیر اعظم کے ساتھ کام کرنے کیلئے کہا ہے۔

احترام کے ساتھ

میں آپ کا مخلص 27اکتوبر 1947ء"۔

ماؤنٹ بیٹن آف برما

مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے کئے گئے اس الحاق نامہ میں جوشرائط قابل غور ہیں، وہ شق نمبر I، IV، II، V، VII، VI اور VIII ۔میں درج ہیں۔شق نمبر 8 میں لکھا گیا ہے کہ۔"الحاق نامے کی رُو سے میری حاکمیت اِس ریاست پر ہمیشہ قائم رہے گی اور ریاست کے مہاراجہ کے طور پر مجھے جواختیارات حاصل ہیں اُن میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوگی"۔

(صفحہ 14 سے صفحہ 20 تک۔ڈاکومنٹس آن کشمیر پرابلم)

بائی۔ایم،ایس ڈیورا۔آر،گروور۔حِصہ اول

بھارتی فوج،(جو کہ ایک منظم فوج تھی)،ہوائی جہازوں کے ذریعہ کشمیراور پونچھ میں اُتاری گئی۔اُس نے قبائلیوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔قبائلی پسپائی اختیار کرنے لگے لیکن پنڈت نہرو اور شیخ عبداللہ نے شاید سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ لیا ہوگا کہ کمان پُل سے آگے فوج نہیں جائے۔چنانچہ بھارتی فوج نے نالہ پار نہیں کیا۔کیونکہ آگے کا سارا علاقہ پوٹھو واری پنجابی بولنے والا تھا اور شیخ صاحب وہ علاقہ واپس لینے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے کیونکہ اُس صورت میں جموں کشمیر میں پنجابی، پوٹھوواری، گوجری اور ڈوگری بولنے والے لوگوں کی اکثریت ہوجاتی جو پنجابی گھرانے کی سسٹر بولیاں تھیں اور یہ اُنھیں منظور نہ تھا۔ کشمیری بولنے والی آبادی، وادیٔ کشمیر کے علاوہ جموں صوبے میں پونچھ ضلع کا منڈی لورن، رام بن ضلع کا بانہال، گُول اور مہور اور ضلع ڈوڈہ اور ضلع کشتواڑ کی تقریباً آدھی آبادی کشمیری زبان بولنے والے علاقے ہیں اور یہ آبادی ریاست جموں وکشمیر کی کُل آبادی کا

32% بنتا تھا۔ یعنی کشمیری لیڈر شپ کبھی اقتدار میں نہیں آتی۔ جبکہ پاکستانی انتظام والے جموں اور کشمیر کی ساری آبادی پوٹھواری، گوجری اور پنجابی بولتی ہے اور بھارتی انتظام والے جموں و کشمیر میں تحصیل کرناہ، ٹیٹوال، کیرن، اُوڑی، پونچھ اور راجوری کے علاقہ جات میں پوٹھواری اور گوجری بولی جاتی ہے جبکہ جموں، کٹھوعہ، سانبہ، ریاسی، اُودھمپور میں ڈوگری اور پنجابی بولی جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں کشمیری ہمیشہ اقلیت میں رہتے اور اتنی قربانیاں دینے کے باوجود اقتدار کشمیری لیڈر شپ کو نہ ملے، یہ شیخ صاحب کو منظور نہیں تھا۔ کیونکہ ہر دور میں غیر کشمیری حاکموں کے ہاتھوں ہی کشمیریوں نے ظلم سہے تھے۔

وہ کشمیری بولنے والوں کی اکثریت چاہتے تھے۔ چنانچہ پنڈت نہرو نے اُنکی بات مان لی (ایسا کہا جاتا ہے) کیونکہ شیخ صاحب نے مُسلم کانفرنس کو پنڈت نہرو کے کہنے پر ہی نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تھا۔ پنڈت نہرو کے ساتھ شیخ صاحب کی دوستی اسلیئے بھی مثالی تھی کہ جب مہاراجہ ہری سنگھ نے اُنھیں گرفتار کیا تھا تو پنڈت نہرو اُنکا مقدمہ لڑنے کے لئے کشمیر آرہے تھے تو مہاراجہ نے کوہالہ پُل پر اُنکو گرفتار کر کے واپس لاہور بھیج دیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کی بُنیاد کشمیر میں بہت مضبوط تھی جبکہ مُسلم کانفرنس جموں میں اپنا اثر رکھتی تھی یعنی پنجابی، پوٹھواری اور گوجری بولنے والے لوگوں کی من پسند جماعت مُسلم کانفرنس تھی اور کشمیری بولنے والوں کی جماعت نیشنل کانفرنس۔ قبائلی حملے کے بعد پوری ریاست میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ میر پور، مظفر آباد، باغ، پلندری، بھمبر، کوٹلی اور پونچھ میں ہندو اور سکھوں کا زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا اور اُنہوں نے اپنے گھروں سے ہجرت کر کے جموں، پنجاب، دہلی اور دوسری جگہوں پر پناہ لی۔ اسی طرح صوبہ جموں کے کٹھوعہ، ریاسی، اُدھم پور، جموں، ڈوڈہ، بھدرواہ اور کشتواڑ میں مسلمانوں کا بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ جموں صوبے میں تقریباً دو لاکھ سینتیس ہزار مسلمان مارے گئے جبکہ

ساٹھ ستر ہزار ہندو اور سکھ مُسلم اکثریتی علاقوں میں مارے گئے (یہ اعداد و شمار یو، این، او کے جاری کردہ ہیں)۔ اور یہ سب مذہب اور سیاست کے نام پر ہوا۔ شیخ صاحب نے اقتدار سنبھالتے ہی حالات کو قابو میں کیا۔ تین انقلابی فیصلے لئے یعنی زمین کاشت کار کی، مفت تعلیم اور سُود خوری نظام کا خاتمہ۔ جاگیرداری اور سُود خوری نظام ختم کرنے کا نقصان ریاست کے جاگیرداروں اور کاروباری طبقے کو ہوا اور کشمیر کی عام جنتا اور جموں کے پسماندہ کاشتکار طبقے کو اِن انقلابی فیصلوں کا فائدہ ہوا۔ جس کی وجہ سے یہ طاقت ور طبقہ شیخ صاحب کے خلاف ہو گیا اور انکے خلاف سازشیں کرنے لگا۔

شیخ صاحب جموں و کشمیر کی مکمل اندرونی خودمختاری چاہتے تھے اور الحاق نامے کی شرائط کے مطابق ہندوستان دفاع، داخلہ اور رسل ورسائل (Communication) کے امور اپنے پاس رکھے گا اور باقی معاملات ریاست کے پاس رہیں گے جبکہ ہندوستان آہستہ آہستہ اپنا قبضہ مضبوط کر رہا تھا۔ معاملہ یو، این، او میں گیا۔ اقوام متحدہ نے سب سے پہلے دونوں ملکوں میں جنگ بندی کروائی جو یکم جنوری 1949ء کو لاگو ہوئی۔ دونوں ملکوں کی فوجوں کی پیش قدمی رُک گئی اور سیس فائر لائن بن گئی جو دو جنگوں کے باوجود قائم رہی اور شملہ سمجھوتے کے بعد لائن آف ایکچوول کنٹرول میں تبدیل ہوئی۔ پھر اقوام متحدہ میں دو بار رائے شماری کی قراردادیں منظور ہوئیں لیکن بے سُود۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انگلینڈ اور پاکستان کے پرائم منسٹروں کو خطوط کے ذریعہ یقین دلایا کہ حالات سازگار ہونے پر رائے شماری کرائی جائے گی تاکہ عوام اپنی مرضی سے اپنا فیصلہ کر سکیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا جس کے لئے دونوں ملکوں کی ہٹ دھرمی اور سیاسی مفادات ذمہ دار تھے۔ 1949ء میں یو، این، او نے کنیڈا کے جنرل میک ناٹن (Gen. Mc Naughton) کی سربراہی میں ایک کمیشن بنایا تاکہ رائے شماری کے علاوہ کوئی دوسرا

آپشن تلاش کیا جاسکے۔ 1950ء میں آسٹریلیا کے سراوون ڈکسن (Sir Owen Dixan) کی سربراہی میں ایک اور کمیشن بنایا گیا۔ اُنہوں نے جو فارمولہ دیا۔اُسے ''ڈِکسن پلان'' کہا جاتا ہے۔جِسکی رُو سے دریائے چناب کو دونوں ملکوں کی حتمی سرحد تسلیم کرنے کی تجویز رکھی گئی۔ دریا کے اِس طرف کا سارا علاقہ ہندوستان کے پاس اور دریا کے پار والا علاقہ پاکستان کو دے دیا جائے۔ دونوں ملکوں نے اِس فارمولہ کو مسترد کردیا۔ اگر ایسا ممکن ہوجاتا تو بہت کم آبادی کو نقلِ مکانی کرنا پڑتی اور مسئلہ کشمیر ہمیشہ کیلئے ختم ہوجاتا لیکن پاکستان ملکی تقسیم کے فارمولہ کے مطابق پوری ریاست کو اپنا حِصہ بنانا چاہتا تھا جبکہ ہندوستان اس کے لئے تیار نہ تھا۔ دونوں فوجی طاقت کے ذریعہ حاصل شدہ رقبے پر اپنا تسلط مضبوط کرتے رہے۔ یو، این، او کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی ایک کوشش 1951ء میں پھر ہوئی اور امریکہ کے فرینک، پی گراہم (Frank P. Graham) کو دونوں ملکوں میں مصالحت کرنے کیلئے بھیجا گیا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

بہرحال جب ''دِلی اگریمینٹ'' پر بھی عمل نہ ہوا تو شیخ عبداللہ سمجھنے لگے کہ اُن کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور بھارت بداعتمادی اور وعدہ خلافی کا مرتکب ہورہا ہے۔ وہ ہند مخالف تقاریر کرنے لگے جس کی وجہ سے اُن کی حکومت برخاست کردی گئی اور مغلوں کے زمانے کی یہ ضرب المثل پوری ہوگئی کہ ''دِلی سرکار کا کیا اعتبار، پہلے لکھیں چٹھیاں، پھر فوجیں دے اُتار''۔ مرکز کی مہربانی سے بخشی غلام محمد کشمیر کے وزیراعظم بن گئے اور فوجی برتری، سیاسی خریداری اور رشوت خوری کی بدولت گیارہ سال تک حکومت کرگئے جب وہ بھی آنکھیں دِکھانے لگے تو کامراج پلان کے تحت اُنکو بھی گھر بھیج دیا گیا گو اس میں موئے مقدس کی چوری اور بازیابی کا بھی عمل دخل تھا۔ شمس الدین کے 90 دِنوں کی برائے نام حکومت کے

بعد غلام محمد صادق حکمران بنے اور اُنہوں نے ریاست کو اندرونی خودمختاری دینے کے مطالبے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا اور رائے شماری کی مانگ کا گلا دبا دیا۔ اور رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ صدرِ ریاست کی جگہ گورنر اور وزیر اعظم کی جگہ وزیر اعلیٰ نے لے لی۔ مزید مرکزی قانون ریاست پر نافذ کیئے گئے۔ پھر آہستہ آہستہ اندرونی خودمختاری کاغذوں سے بھی مِٹا دی گئی۔

شیخ عبداللہ اور اُن کے وفادار سیاسی ساتھیوں پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا اور کہا گیا کہ امریکہ کی مدد سے وہ کشمیر کا سلطان بننا چاہتا تھا۔ 11 سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ 22 سالوں تک جیل میں آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر وزیر اعلیٰ میر قاسم کی سفارت کاری کی بدولت وزیر اعظم اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور کسی معاہدہ پر پہونچنے کے لئے شیخ صاحب کی طرف سے مرزا محمد افضل بیگ اور اندرا گاندھی جی کی جانب سے جی پارتھا سارتھی نے مذاکرات کیئے اور آخر ایک معاہدہ طے پا گیا جِسے ''اندرا۔ شیخ اکارڈ'' کہا جاتا ہے اور جس کی رو سے میر قاسم صاحب نے وزیر اعلیٰ کی کُرسی چھوڑی اور اُنھیں مرکز میں وزیر بنا دیا گیا۔ اُس وقت شیخ صاحب نہ تو اسمبلی کے ممبر تھے اور نہ ہی اُن کی جماعت کے پاس کوئی اکثریت تھی۔ بلکہ کانگریس کے ممبران اسمبلی کی حمایت سے شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ بنے۔ تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیں کہ جو شخص 1953ء سے پہلے وزیر اعظم تھا اور پنڈت نہرو جس کو ایک سربراہ مملکت کے طور پر استقبال کرنے ایئرپورٹ پر آتے تھے۔ جو کشمیر کی عوام کا بلاشرکت غیرے ہر دِل عزیز لیڈر تھا، جس نے کشمیر میں رائے شماری کرانے کیلئے 22 سال جیل میں کاٹے۔ جس پر مرکزی سرکار نے غداری کا مقدمہ چلایا۔ وہی شیخ محمد عبداللہ ایک سمجھوتے کے تحت وزیر اعلیٰ بن گیا۔ ہائے رے سیاست، تیرے رنگ نرالے۔ شیخ محمد عبداللہ نے

اپنی وزارت انتہائی مختصر رکھی۔ جموں سے جسٹس دیوی داس ٹھاکر، لداخ سے سونم نربواور اپنے علاوہ کشمیر سے مرزا محمد افضل بیگ کو لیا گیا اور خالد حسین کو بیگ صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ بنایا گیا۔ اُس وقت بیگ صاحب کو مال، جنگلات، زراعت اور تجارت کے محکمے سونپے گئے تھے۔ اُن کے پرائیویٹ سیکریٹری کا انتخاب خالد حسین نے ہی کیا تھا اور محکمہ تعلیم کے ڈپٹی سیکریٹری بلدیو سنگھ جسوال کو بیگ صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری بنادیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو مرزا محمد افضل بیگ صاحب نے اپنا پبلک ریلیشن افسر بنا کر لایا تھا اور جس کا نام تھا، محمد سلیم بیگ ہے، جو بعدازاں ڈائریکٹر انڈسٹریز کے عہدہ سے سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوا اور پھر ایک این، جی، او چلانے لگا۔

میرا نام محمد یاسین ہمدانی ہے۔ میں اُن دِنوں جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں سٹینوگرافر تھا اور مجھے بھی وزیر مال اور جنگلات وزراعت کے پرسنل سٹاف میں سرکار نے منتقل کیا تھا۔ چنانچہ میں نے بحیثیت سٹینوگرافر اپریل 1975ء تا ستمبر 1978ء تک وہاں کام کیا۔ خالد حسین سے میری جان پہچان اُن دِنوں سے تھی جب اُس نے ایک افسانہ ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے لکھا تھا اور نوکری سے معطل کردیا گیا تھا۔ یہ شاید سال 72-1971ء کی بات تھی اور پھر میری تعیناتی مرزا افضل بیگ کی پرسنل سیکشن میں ہوئی تو خالد حسین کے ساتھ کام کرنے اور باہم ملاقاتوں کا طویل سلسلہ قائم رہا۔ ہمارے تعلقات گہری دوستی میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ مجھے کشمیر کی تاریخ کے روشن اور سیاہ باب سُناتا رہتا۔ جن کا ذکر میں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خالد حسین خوش طبع اور ہنس مُکھ نوجوان تھا اور اکثر بزمِ نشاط سجائے رکھتا۔ زندہ دِلی کے ساتھ ساتھ وہ رحم دِل انسان بھی تھا۔ اُس نے بے شمار لوگوں کی مدد کی۔ لوگوں کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کا طریقہ اُس نے اپنی سابقہ پریشان حال زندگی کے تجربوں سے کشید کیا تھا۔ اُسے کتابیں پڑھنے کا شوق

تھا۔خصوصاً تاریخی اورادبی کُتب کا۔اُسے اُردواور پنجابی کے سینکڑوں اشعارزبانی یاد تھے۔
وہ ہمیں اکثر شیخ سعدیؒ کی شہرۂ آفاق کتابوں ''گلستان'' اور''بوستان'' کی کہاوتیں سُناتا۔
روسی ادب میں کئی نامورادیبوں کی کتابوں کاذکرکرتا۔خاص کررسول حمزہ توف کی مشہور
زمانہ کتاب ''میراداغستان'' اُسکی پسندیدہ کتابوں میں شامل تھی، کیونکہ اُسکی منظرنگاری
کشمیر سے ملتی تھی۔سفیدے کے درخت،حُقہ،سماوار،چنار،پھل دار بُوٹے،لباس یعنی پورا
ماحول کشمیرجیسا تھا۔ بنگالی اور اُردوادب بھی اُس نے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔
اُردوناول،افسانہ اورشاعری کی مشہورکتابیں وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کرلاتااور پڑھتا۔پنجابی ادب
کاتووہ دِلدادہ تھا۔پنجاب کے صوفیوں کا کلام اُسے ازبرتھا۔پنجابی گیت سنگیت اُسکی روح
میں رچابسا تھا۔جس محفل میں وہ بیٹھتاوہاں لطیفے،چُٹکلے اور پسندیدہ اشعارسُناکرمحفل کوکیسر
کیاری (پھلواری) بنادیتا۔

مرزامحمدافضل بیگ، شیخ محمدعبداللہ کے وفادارساتھی تھے۔1931ء سے دونوں اکٹھے
کشمیریوں کی شخصی راج سے آزادی کیلئے جدوجہد کررہے تھے۔بیگ صاحب شیخ محمد
عبداللہ کے دُکھ سُکھ میں شامل رہے۔عوام میں یہ مشہورتھاکہ گوشیخ صاحب کشمیر کے ایک
قدآورلیڈرہیں اورشیرِکشمیر کے خطاب کے حق دارہیں لیکن سیاسی معاملات میں بیگ
صاحب اُن کادماغ ہیں۔جبھی تولوگوں نے اُنھیں فخرِکشمیر کے خطاب سے نوازاتھا۔
مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت میں اوربعدازاں آزادی کے بعدمرکزی سرکار کے دورمیں
دونوں نے اکٹھے جیلیں کاٹی تھیں۔لیکن اقتدارمیں دوبارہ آنے کے بعدشیخ صاحب کے
بڑے داماد اور وزیرغلام محمد شاہ المعروف گُل شاہ نے دونوں کے درمیان غلط فہمیاں
اوربدگمانیاں پیداکرناشروع کردیں تھیں اورجب 1977ء کے الیکشن میں نیشنل کانفرنس،
شیخ صاحب کی سربراہی میں دوتہائی اکثریت سے جیتی توحلف برداری کے بعدشیخ محمدعبداللہ

نے بیگ صاحب کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور اُنھیں نائب وزیراعلیٰ بنادیا۔ یہ بات گُل شاہ کیلیئے تکلیف دہ تھی۔ اُس نے سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1978ء کے شروع میں قانون ساز کونسل کی خالی نشستوں کیلیئے الیکشن کروانے کا جب فیصلہ لیا گیا تو بیگ صاحب نے ایک سیٹ اپنے داماد مرزا یعقوب بیگ کیلیئے مانگی اور شیخ صاحب نے بخوشی اُن کی خواہش پوری کردی۔ الیکشن میں یعقوب بیگ کو ہرانے کیلیئے گُل شاہ جوڑ توڑ کرنے لگا۔ ایک دن کانگریس کا ممبر اسمبلی منگت رام شرما (جو بعد میں 2002 تا 2005ء ریاست کا نائب وزیراعلیٰ رہا) اُنھیں ملنے آیا اور خالد حسین کی موجودگی میں بیگ صاحب کو ہوشیار کرنے لگا اور بتانے لگا کہ غلام محمد شاہ اُنکے داماد کو ہرانے کیلیئے ہر حربہ اختیار کررہا ہے، یہاں تک کہ کانگریس کے ممبران اسمبلی کو بھی خریدنے کی کوشش کررہا ہے۔ منگت رام جی نے بیگ صاحب کو یقین دلایا کہ کانگریس اپنے ووٹ یعقوب بیگ کے حق میں ڈالے گی۔ اور ایسے ہی ہوا بھی۔ بیگ صاحب کا داماد 46 ووٹوں سے جیت گیا اور ایم، ایل، سی بن گیا۔ شکست خوردہ گُل شاہ پیچ تاب کھا کر رہ گیا۔ الیکشن کا رزلٹ اُسوقت نکلا جب شیخ صاحب ممبئی میں آنکھوں کے آپریشن کیلیئے گئے تھے۔ گُل شاہ ممبئی گیا اور شیخ صاحب کو بتایا کہ مرکزی سرکار ایک بار پھر آپ کے ساتھ 1953ء والا کھیل دُہرانا چاہ رہی ہے۔ اُس وقت مرکزی حکومت نے بخشی غلام محمد کو استعمال کیا تھا اور اب مرزا محمد افضل بیگ کے ذریعے آپکی حکومت گرانا چاہتی ہے کیونکہ کانگریس کے سبھی ممبران اسمبلی نے بیگ صاحب کے داماد کو ووٹ ڈالے ہیں اور وہ 46 ووٹوں سے جیت گیا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ مرکزی سرکار آپکی حکومت برخاست کرنا چاہتی ہے۔ گُل شاہ نے شیخ صاحب کو مجبور کیا کہ وہ بیگ صاحب کو اپنی وزارت سے نکال باہر کریں۔ چنانچہ سری نگر پہونچتے ہی شیخ محمد عبداللہ نے بیگ صاحب سے استعفیٰ طلب کرلیا۔ بیگ صاحب اُس وقت دِلّی میں زراعت کانفرنس میں

شرکت کے لئے گئے تھے۔اُنہوں نے کہا کہ سری نگر پہونچتے ہی وہ استعفیٰ پیش کردیں گے اور بیگ صاحب نے ایسا ہی کیا۔استعفیٰ والا بند لفافہ خالد حسین نے ہی قبلہ شیخ صاحب کے ہاتھوں میں دیا تھا۔مستعفی ہونے کے بعد کئی وزرا اور نیشنل کانفرنس کے اسمبلی ممبران بیگ سے ملنے اُنکی رہائش گاہ پر آئے اور اُن کے ساتھ اپنی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔چند نام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے غلام محمد بھدرواہی، عبدالصمد تیلی، غلام محی الدین ملک (اسپیکر اسمبلی)، حکیم محمد یاسین، بشیر احمد کچلو، حاجی بلند خان، محمد صدیق، پیارے لال ہنڈُو، ابراہیم ڈار وغیرہ۔اُنہوں نے یقین دلایا کہ وہ مرزا محمد افضل بیگ کو اپنا لیڈر مانتے ہیں۔بیگ صاحب نے انقلابی نیشنل کانفرنس نام سے نئی پارٹی بنائی اور پریس کانفرنس کرنے کیلیئے تاریخ مقرر کی۔جس صبح پریس کانفرنس تھی، اُس رات عبدالصمد تیلی، محی الدین ملک، حکیم محمد یاسین، حاجی بُلند خان، محمد ابراہیم ڈار کُل چھ ممبران اسمبلی بیگ صاحب کے مکان میں تھے۔خالد حسین، محمد رمضان (بیگ صاحب کا ذاتی خدمتگار) اور عبدالرحمان (بیگ صاحب کا ڈرائیور) نے رات بھر اُنکی خدمت کی لیکن خالد حسین اُن کے چہروں کو پڑھتا رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ ڈرے سہمے ہیں۔صبح خالد حسین بیگ صاحب کے کمرے میں گیا اور کہنے لگا کہ چھوٹا مونہہ اور بڑی بات ہے، لیکن کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔خالد حسین نے اُنھیں اُن کے حامی ممبران کی ذہنی کیفیت سے آگاہ کیا اور یہ مشورہ دینے کی جسارت کی کہ وہ پریس کانفرنس میں شیخ صاحب کے خلاف کچھ نہ بولیں بلکہ کہیں کہ وہ پہلے بھی اُنکے لیڈر تھے۔آج بھی ہیں اور مرتے دم تک رہیں گے البتہ گُل شاہ صاحب کے بارے میں جو کہنا چاہیں کہہ لیں۔اُسی وقت بلدیو سنگھ جسوال بھی گیا اور انڈر سیکریٹری جلال الدین بھی۔جب بیگ صاحب نے خالد حسین کی تجویز کا ذکر جلال الدین سے کیا تو وہ کہنے لگا کہ اس ڈوگرے مسلمان کو کیا پتہ کشمیر کی سیاست کا۔لوگ آپ کو پیار کرتے ہیں۔آپ

کو فخرِ کشمیر کہتے ہیں۔ وہ آپ کے لئے جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ لہذا خالد حسین کی باتوں میں کوئی وزن نہیں ہے۔ بلد یو سنگھ جسوال نے بھی خالد حسین کی سرزنش کی اور کہا کہ اُسے ان کے معاملوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال پریس کانفرنس ہوئی اور اُس کا یہ نتیجہ نکلا کہ چھ کے چھ ممبران اسمبلی گل شاہ کے کیمپ میں چلے گئے۔ مرزا محمد افضل بیگ صاحب نے گول باغ یا گاندھی پارک (جہاں آجکل اسمبلی اور ہائی کورٹ کی عمارتیں ہیں) میں ایک جلسہ کیا جس کو ناکام بنانے کے لئے جہانگیر ہوٹل سے گُل شاہ، غلام نبی کوچک، پیر حسام الدین بانڈے اور کچھ دوسرے غنڈوں نے سٹیج پر پتھراؤ کرنا شروع کر دیا۔ اور ڈویژنل کمشنر کشمیر حمید اللہ خان بانہالی نے پولیس کی مدد سے بیگ صاحب کو دھکے مار کر سٹیج سے نیچے اُتار دیا اور اُن کے ساتھ بدتمیزی کرنے لگا۔ لوگوں نے نعرے بازی کی۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس چھوڑی اور یوں جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ حمید اللہ خان وہی شخص تھا جسکو بیگ صاحب نے ڈپٹی کمشنر ادھمپور اور ڈویژنل کمشنر کشمیر بنوایا تھا۔ جو بیگ کے بوٹوں کے تسمے باندھتا تھا اور کہتا تھا کہ جو انسولین کا انجیکشن آپ کو لگتا ہے اُس کی تکلیف اُس کے دِل کو ہوتی ہے اور بیگ صاحب خوش ہو جایا کرتے تھے۔ یہ وہی حمید اللہ خان بانہالی تھا جو بعد میں گورنر جگموہن کا منظورِ نظر رہا اور مُشیر (Advisor) تعینات ہوا۔ حمید اللہ خان اور ڈی، آئی، جی پولیس سری نگر اللہ بخش چوہدری کی تعریف گورنر جگموہن نے کشمیر سے متعلق اپنی کتاب (My Frozen Turbulance in Kashmir) میں بہت زیادہ کی ہے۔

شیخ صاحب جیسے چنار کے درخت کے سامنے بیگ صاحب کا سیاسی بوٹا کُملا گیا۔ سارے ساتھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑتے گئے اور وہ گھر کی چار دیواری کے اندر قید ہو کے رہ گئے۔ خالد حسین اور بلد یو سنگھ جسوال بیگ صاحب سے ملنے اکثر جایا کرتے تھے۔

وہ دیکھتے کہ بیگ اپنے کمرے میں اکیلے پڑے نوکروں یا افرادِ خانہ کو آوازیں دے رہے ہیں لیکن کوئی سُننے والا نہیں تھا۔ اُن کے خاص خدمت گار محمد رمضان اور عبدالرحمان بھی اُن کو چھوڑ کر جا چُکے تھے۔ لیکن خالد حسین اور بلد یو سنگھ جسوال کبھی کبھی اُن سے ملنے جاتے۔ ایک دن جب وہ دونوں اُن کے کمرے میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ بیگ صاحب کا پیشاب خطا ہوا تھا۔ اُن دونوں نے بیگ صاحب کو صاف کیا۔ پاجامہ بدلا۔ بستر کی چادر تبدیل کی۔ سرہانے کے غلاف بدلے۔ کمرے میں سپرے کیا اور پھر اُنھیں پلنگ پر لٹایا۔ بیگ صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہہ رہے تھے "مدِ فضول ہوں، کسی کو میری پرواہ نہیں ہے۔ موت مانگتا ہوں لیکن موت نہیں آتی۔ نہ جانے اللہ کو کیا منظور ہے اور میں نے کتنی دیر تک یہ ذِلّت برداشت کرنی ہے۔ آپ دونوں میرے لئے دُعا مانگیں کہ اللہ میرا پردہ رکھے اور مُجھے اُٹھالے"۔

بیگ صاحب جسمانی طور پر معذور تھے۔ اُن کے بائیں ہاتھ اور ایک ٹانگ میں نقص تھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے بھاری جسم سنبھالنا مُشکل ہوتا تھا۔ اوپر سے شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضے میں مُبتلا تھے، جس کی وجہ سے رحلت فرما گئے۔ خالد حسین اور بلد یو سنگھ جسوال نے اُس وقت سیاسی موقع پرستی کے کئی چہرے دیکھے جو ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ تعزیت کے لئے شیخ صاحب، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، گُل شاہ اور شیخ صاحب کی کابینہ کے سبھی وزرا راج باغ والے مکان میں موجود تھے۔ گُل شاہ کی طرف سے لگائے گئے الزامات کی حقیقت کو شاید شیخ صاحب جان چُکے تھے اور وہ پشیمان بھی تھے کہ 45 سال کا مخلص دوست اور سیاسی جدوجہد کا ساتھی گُل شاہ کی وجہ سے اُن کی بے توجہی کا شکار رہا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بیگ صاحب کا انتقال 11 جون 1982 میں ہوا اور اُن کی وفات کے تین مہینے بعد یعنی 8 ستمبر 1982 کو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ بھی یہ جہانِ فانی

چھوڑ کر چلے گئے۔ جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ برسرِ اقتدار آئے تو اُنہوں نے اپنے والد کی طرف سے بیگ صاحب کے ساتھ کی گئی زیادتی کی تلافی کرتے ہوئے اُن کے فرزند ڈاکٹر محبوب بیگ کو اننت ناگ اسمبلی حلقے سے الیکشن لڑوایا اور وہ ممبر اسمبلی بن گیا۔ لیکن ڈاکٹر محبوب بیگ کے اندر یہ خلش تھی کہ اُسے فاروق صاحب نے وزارت میں نہیں لیا کیونکہ بیگ صاحب کے جانشین کے طور پر وہ اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ اور جب گورنر جگموہن نے 1984ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی بھاری اکثریت سے منتخب سرکار کو برخاست کر دیا اور گل شاہ کو وزیرِ اعلیٰ بنایا تو اُسکی وزارت میں ڈاکٹر محبوب بیگ وزیرِ صحت بنا۔ اُس گل شاہ کی وزارت میں جس نے اُس کے والد کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک رکھا۔ اس بات کا افسوس خالد حسین کو عُمر بھر رہا اور وہ اسی لئے کہا کرتا تھا کہ سیاست بڑی بے رحم، بے حس اور ظالم ہوتی ہے۔

خالد حسین کے دوستوں میں ایک حکیم منظور بھی تھا جو ریاست کا ایک مشہور اُردو شاعر تھا۔ یہ دونوں بزمِ فروغ اُردو جموں کی ادبی محفلوں میں جایا کرتے۔ کئی بار حکیم منظور کے گھر پر بھی ادبی محفل سجتی، جس میں خالد حسین، پرتپال سنگھ بیتاب، آنند لہر اور عابد مناوری وغیرہ شرکت کرتے۔ اُن دِنوں حکیم منظور ڈپٹی کسٹوڈین جموں تھا۔ حکیم منظور نے کئی بار خالد حسین سے کہا کہ وہ اُسے بیگ صاحب سے ملائے۔ خالد حسین نے موقع دیکھ کر بیگ صاحب کو بتایا کہ اُس کا دوست حکیم منظور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ ریاست کا مشہور شاعر اور دانشور ہے۔ بیگ صاحب چُوں کہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی قدر کرتے تھے۔ لہذا کہنے لگے کہ لے آنا کسی دِن۔ آخر ایک روز خالد حسین نے حکیم منظور کو بیگ صاحب سے ملایا۔ چھُٹی کا دِن تھا۔ بیگ صاحب اُردو ادب پر اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پھر حکیم منظور نے اُنھیں اپنی چند غزلیں سُنائیں۔ بیگ صاحب کافی متاثر ہوئے

اور دوبارہ ملنے کے لئے کہا۔ دو چار ملاقاتوں میں اپنی شعروسُخن کی وجہ سے حکیم منظور نے بیگ صاحب پر ایسا منتر پھونکا کہ وہ حکیم منظور کے گرویدہ بن گئے۔ بیگ صاحب محفل پرست تھے اور دانشوروں، اچھے ادیبوں اور شاعروں اور دُنیائے سیاست پر گہری نظر رکھنے والوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ حکیم منظور کی بدولت محمد یوسف ٹینگ بھی آنے جانے لگے۔ ہر شام محفل سجتی۔ شعروشاعری، لطیفے اور بیگ صاحب کی تعریفوں کے پُل باندھے جاتے۔ کئی بار حکیم منظور رات کا کھانا بیگ صاحب کے ساتھ ہی کھاتا۔ مرزا محمد افضل بیگ صاحب کی وساطت سے حکیم منظور کی انڈیکشن کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس میں ہوئی۔ وہ کسٹوڈین بنا اور بعد ازاں اہم عہدوں پر فائز رہا۔ لیکن جب بیگ صاحب پر زوال کا وقت آیا تو اس احسان فراموش نے آنکھیں پھیر لیں اور گُل شاہ کے کیمپ میں چلا گیا۔ محمد یوسف ٹینگ نے بھی مونہہ موڑ لیا۔ ایک دِن بیگ صاحب نے خالد حسین سے کہا کہ حکیم منظور کو بُلا کر لاؤ۔ اُسے ملنے کیلیئے آنکھیں ترس گئی ہیں اور کشمیری زبان میں کہا، ''مہ چھُو یتم سُند بڈلوَل آومُت'' (مجھے اُسکی بہت یاد آتی ہے) جب خالد حسین نے حکیم منظور سے کہا کہ بیگ صاحب اُسے یاد کر رہے ہیں اور وہ اُسے ملنا چاہتے ہیں تو حکیم منظور کا جواب تھا ''لعنت مارو یار، اُس ٹُنڈے کو۔ تم نہیں جانتے کہ اُسکے گھر کے باہر پولیس اور سی، آئی، ڈی کا پہرہ لگا ہے۔ سی، آئی، ڈی والے پل پل کی خبر وزیر داخلہ کو دیتے ہیں کہ وہاں کون آیا اور کون گیا۔ اسلیئے تم بھی اپنی نوکری بچاؤ اور وہاں مت جایا کرو''۔

جب خالد حسین نے کہا کہ ٹیلی فون پر ہی بات کر لو تو کہنے لگا کہ اُن کا ٹیلی فون بھی ٹیپ ہوتا ہے۔ اُس دن کے بعد خالد حسین نے حکیم منظور سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

جن دِنوں خالد حسین ریاستی سرکار کی طرف سے جالندھر میں عوامی رابطہ افسر (P.R.O) تھا تو اُس وقت بیگ صاحب کا چھوٹا بیٹا ممتاز افضل بیگ وہاں دُوردرشن

جالندھر میں پروڈیوسر تھا۔ اُسکی ماں جسے ہم سب آپا جی کہتے تھے، وہ اُس کے پاس آئی ہوئی تھی۔ خالد حسین اُسے ملنے ممتاز افضل کے گھر گیا۔ کرائے کے مکان میں ایک درّی پر بیٹھی بوڑھی ماں پنکھی جھول رہی تھی۔ نہ کوئی کُرسی، نہ میز۔ نہ پلنگ، چارپائی اور نہ پردہ داری۔ گرمیوں کا موسم اور لُو کی تپش۔ جیسے جہنم کی آگ۔ خالد حسین کو یہ منظر اور خُدا کی خدائی کے رنگ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ جس خاتون کے آگے پیچھے نوکر، چاکر ہوتے تھے وہ آج اس حالت میں بیٹے کے پاس رہ رہی تھی کیونکہ سری نگر میں بیگ صاحب کے بیٹوں نے جائیداد کا جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔

1995ء کے آخر میں خالد حسین کو تیسری بار ضلع ڈوڈہ میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ بھیجا گیا تاکہ وہاں الیکشن کرایا جاسکے۔ کیونکہ مرکزی سرکار نے جموں و کشمیر میں صدر راج ختم کر کے انتخاب کروانے کا من بنالیا تھا جو دسمبر 1995ء میں کرائے جانے تھے۔ لیکن تاریخ طے کرنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ خالد حسین کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ الیکشن مکمل ہوتے ہی اُسے واپس بُلا کر من پسند پوسٹنگ دی جائے گی۔ اُس نے دفتری کام کرنا شروع کر دیا۔ اُسے پتہ چلا کہ بلاک گھٹ میں سرکاری رقم کو خُرد بُرد کیا گیا تھا۔ ہر کام میں ہیرا پھیری ہے۔ دفتر میں شکایتوں کے انبار لگے تھے لیکن کوئی کاروائی نہیں کی گئی تھی۔ ایک مدّ کا پیسہ دوسری مدّ میں خرچ کیا گیا تھا جب کہ ایسا کرنے کا مجاز ضلع ترقیاتی کمشنر بھی نہیں تھا۔ خالد حسین نے بلاک دفتر پر چھاپہ مارا اور تمام ریکارڈ ضبط کر لیا۔ ریکارڈ کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ سالانہ منصوبے میں جس کام کیلئے پانچ لاکھ کی منظوری دی گئی تھی، اُس کام پر تیس لاکھ کا خرچہ ہونے کے باوجود کام تکمیل کو نہیں پہونچا تھا بلکہ مزید رقم مانگی جا رہی تھی۔ اسی طرح نرسریوں میں پودے لگے دکھائے گئے تھے۔ جبکہ موقع پر کوئی نرسری تھی ہی نہیں۔ صرف کاغذوں میں اندراج تھا۔ خالد حسین نے ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی اور تمام

ثبوت شامل کر کے محکمہ کے متعلقہ کمشنر اور ویجی لینس کمشنر کو بھیج دی بلکہ وہ خود فائل بنا کر لے گیا اور ویجی لینس کمشنر سے مِل کر تمام تفصیل بتائی۔ ضلعی سربراہ یعنی ڈی، سی نے بی، ڈی، او کو ڈسٹرکٹ پنچایت افسر ڈوڈہ کا چارج دیا تھا اور اُسی کے ذریعے پودے خریدے گئے تھے۔ پودے سپلائی کرنے والے بعد میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی، ڈی، پی) کی حکومت میں وزیر اور اعلیٰ عہدیدار بنے۔ لیکن وہ غلام نبی وانی، بی، ڈی، او کو نہ بچا سکے۔ اُس کے خلاف کیس چلا۔ اُسے معطل کیا گیا۔ اُس کے ڈوڈہ اور جموں والے گھروں پر ویجی لینس کمیشن کا چھاپہ پڑا۔ اُسے گرفتار کیا گیا۔

ایک بار خالد حسین نے مجھے بتایا کہ اُدھمپور میں اپنے والد کی بنائی ہوئی جائیداد کو اُس نے فروخت کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب وہ موقع پر گیا۔ تو ''سیلاں کے تالاب'' والا مکان ملبے کا ڈھیر بن چُکا تھا جب کہ بس اڈے کے قریب دو کنال زمین پر کوئی مہربان قابض ہو چُکا تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد اُس نے زمین واگذار کرائی اور ایک مہاجن شکتی گپتا جو سٹی لائٹ سنیما کا مالک تھا، اُسے بیچ دی۔ ''سیلاں کے تالاب'' والے مکان کی زمین بھی ایک مہاجن کو فروخت کر دی۔ یوں اُسکا اُدھم پور سے ہمیشہ کیلئے رشتہ ختم ہو گیا۔ اور وہ مستقل طور پر جموں آ گیا۔ جہاں اُس نے جائیداد بنائی۔ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دی۔ اُنکی شادیاں کیں اور اپنی ذمے داریوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اصلی گھر کو چل دیا۔ اللہ اُسکی قبر ٹھنڈی رکھے۔ آمین۔

محنت کشی کی دین ہے جو کچھ ہے میرے پاس
میری ہتھیلیوں میں کوئی معجزہ نہیں
(نامعلوم)

سُخن شناسی

هم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دِل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
(فیض احمد فیض)

خالد حسین میری بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کا نائب مُدیر تھا اور میں مدیر۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میری پہچان پورے برصغیر میں بن چکی تھی۔ ادبی حلقوں میں میرا نام جانا پہچانا تھا۔ میں ملک کے نامور رسائل میں چھپتا رہتا تھا۔ جن میں ''بیسویں صدی''، ''روبی''، ''آجکل''، ''شاعر''، ''شمع'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خالد حسین میرے افسانے پڑھتا اور اپنی رائے کھُل کر دیتا۔ اُردو ادب میں اُسکی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں نے اُسے مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی نگارشات پڑھنے کا مشورہ دیا۔ یوں تو اُس نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا تھا اور اُس نے رام بابو سکسینہ کی ''اُردو تاریخ ادب'' پڑھی تھی۔ اُس کے علاوہ نصاب کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا لیکن وہ سب امتحانی معاملہ تھا جبکہ میرے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے ادب کی طرف مائل ہونے لگا۔ اُس نے سعادت حسن منٹو، بلونت سنگھ، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدیؔ، خواجہ احمد عباس، الیاس احمد گدّی، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کو پڑھا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے دیکھا کہ خالد حسین کا رُجحان اُردو شاعری کی طرف زیادہ ہے۔ وہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ، قتیلؔ، فیضؔ، ساحرؔ اور ناصر کاظمی کو بڑے شوق سے پڑھتا اور گفتگو میں اکثر اُن

کے اشعار کو دُہراتا۔ ایک دن وہ ایک کہانی اُردو میں لکھ کر لایا اور مجھے سُنانے لگا۔

کہانی دمدار تھی اور اُردو میں وہ اُسکی پہلی کہانی تھی اور اُس کا عنوان تھا۔ ''گھر کی جنت'' میں نے معمولی نوک پلک سنوار کر اُسے ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کے اکتوبر۔ نومبر 1969ء کے شمارے میں شائع کیا۔ یوں اُس کا افسانوی سفر شروع ہوا۔ اب تک تو آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ میں کون ہوں۔ میرا نام نُور شاہ ہے۔ میں نے اور خالد حسین نے تقریباً نو سال اکٹھے کام کیا۔ وہ نائب مُدیر سے ''دیہات سُدھار'' کا مُدیر بنا اور میں ترقی پا کر ڈپٹی ڈائریکٹر پنچایت بنا اور پھر دونوں کئی سالوں تک ایک ہی کمرے میں بیٹھتے رہے۔ 1970ء میں اُسکے دو افسانے نند گوپال باوا نے اپنی اُردو ماہوار میگزین ''نُوری چھم'' میں چھاپے۔ نام تھا ''دھوپ اور سائے'' اور ''شیشہ گھر''۔ خالد حسین کا چوتھا افسانہ 1971ء کے اوائل میں بعنوان ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''۔ سری نگر کے ایک ہفتہ وار اخبار میں چھپا۔ کسی منچلے نے اُس اخبار کی کچھ کاپیاں سیکرٹریٹ میں بانٹ دیں اور ایک زلزلہ آ گیا۔ ہر طرف افسانے کا چرچا ہونے لگا۔ اُس افسانے میں ایک بڑے سرکاری افسر جو سیکرٹریٹ میں سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھا اور اُسکی پی، اے کی دِل رُبائی کی داستان بیان کی گئی تھی۔ اس افسانہ میں خالد حسین نے یہ احمقانہ غلطی کی کہ کرداروں کے نام اصلی لکھ دیئے۔ ایک طوفان مچا اور خالد حسین نوکری سے معطل کر دیا گیا۔ چارج شیٹ میں یہ الزام لگایا گیا کہ اُس نے ایک اعلیٰ سرکاری افسر اور ایک خاتون کے خلاف فحش مضمون لکھ کر اُنکی کردار کشی کی ہے۔ جبکہ مضمون چھاپنے سے پہلے سرکاری ملازموں کو ضابطے کے تحت منظوری لینی ضروری ہوتی ہے۔ خالد حسین نے جواب میں لکھا کہ اُس نے کوئی مضمون نہیں لکھا جس کے لئے سرکاری اجازت نامہ لینا پڑتا ہے بلکہ اُس نے ایک افسانہ لکھا ہے اور فکشن لکھنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس نے فحش زبان استعمال کی ہے۔ ریاستی سرکار نے خالد حسین کی دلیل

مسترد کردی اور ایک انکوائری کمیشن بنادیا جس کی سربراہی ایک سیشن جج کو دی گئی۔ اُن کا نام غلام رسول ہمدانی تھا۔ انکوائری کمیشن نے یہ ثابت کرنا تھا کہ آیا خالد حسین کی تحریر مضمون ہے یا افسانہ اور کیا اُس میں فحش زبان استعمال ہوئی ہے یا نہیں۔ انکوائری کمیشن میں خالد حسین کی طرف سے جو وکیل پیش ہوا، اُس کی دلیل تھی کہ آج تک کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ فکشن میں فحش زبان لکھی جاتی ہے۔ اُس نے سعادت حسن منٹو کی مثال دی جس پر فحاشی کے الزام میں کئی مقدمے چلائے گئے لیکن کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ منٹو نے فحش لکھا ہے۔ جہاں تک افسانے میں ناموں کا ذکر ہے تو وہ کسی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ خالد حسین کے وکیل نے اپنے دلائل میں کہا کہ اس بات کا فیصلہ کرنا، کہ افسانے اور مضمون میں کیا فرق ہے اور کیا فحش زبان استعمال کی گئی ہے یا نہیں۔ یہ ماہر لسانیات، نقاد اور ادیبوں کا کام ہے۔ کیونکہ وہی صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس دلیل کو جج صاحب نے مان لیا۔ اور اگلی پیشی پر ماہر لسانیات، نقادوں اور ادیبوں کی تحریری آرا طلب کر لیں۔ اُن دِنوں بلراج ساہنی اور خواجہ احمد عباس ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلہ میں کشمیر آئے ہوئے تھے۔ خالد حسین اُن سے ملا اور اپنی روداد سُنائی۔ دونوں نے کہانی پڑھی اور اپنی رائے لکھ کر دی۔ دونوں نے لکھا تھا کہ مذکورہ افسانہ ایک ادبی تخلیق ہے اور فحاشی کا الزام غلط ہے۔ بلراج ساہنی اور خواجہ احمد عباس وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے رفیق تھے اور کمیونزم کے نظریے کے حامی۔ ایک روز صادق صاحب نے اُنھیں عشائیے پر بُلایا تھا۔ وہاں باتوں باتوں میں بلراج ساہنی نے صادق صاحب سے خالد حسین کے افسانے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ایک نئے اُبھرتے تخلیق کار کو لال فیتہ شاہی کا شکار نہ بننے دیں اور اُسے بحال کیا جائے تاکہ اُس کے اندر کا ادیب زندہ رہے۔ خالد حسین نے کشمیری اور اُردو کے افسانہ نگار اختر محی الدین، علی محمد لون اور محمد یوسف ٹینگ سے بھی تحریری رائے حاصل کر کے سبھی تحریریں اپنے وکیل کے حوالے کیں۔ مقررہ

تاریخ پر خالد کے وکیل نے جج صاحب کو سبھی آرا کو پڑھ کر سُنایا اور اصل تحریریں کمیشن کے سُپرد کیں۔ یوں نو مہینے کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ ریاستی سرکار کو پیش کی۔ خالد حسین بری ہو گیا اور نوکری پر بھی بحال ہو گیا لیکن اُسکی بیوی کے زیورات مقدمہ بازی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ خالد حسین کے اندر چھُپا ہوا تخلیق کار باہر آ گیا۔ اور وہ اُردو میں کہانیاں، ادبی، تاریخی، سماجی اور سیاسی مضمون لکھنے لگا اور اخباروں میں کام کرنے لگا۔ 1971ء میں ہی خالد حسین کے دوست ہربھجن سنگھ ساگر نے اُسے پنجابی زبان میں لکھنے کی ترغیب دی۔ وہ اُسے اپنے ساتھ پنجابی ساہت سبھا کے دفتر مائسمہ میں لے گیا۔ وہاں پنجابی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادیب اور شاعر بھی آتے تھے اور اپنی تخلیقات سُناتے تھے اور اُن پر سیر حاصل گفتگو ہوتی تھی۔ ہربھجن کی تحریک پر خالد حسین نے پنجابی میں اپنا پہلا افسانہ ''ٹھنڈی کانگڑی'' شاید فروری 1971ء میں لکھا اور پنجابی ساہت سبھا سری نگر کی نشست میں پڑھا۔ مہارتھی کہانی کاروں کو کہانی پسند نہیں آئی خاص کر سرن سنگھ، کنول کشمیری، گورچرن سنگھ گُلشن اور پریم سنگھ کو۔ دوسرے دِن یہی کہانی خالد حسین نے مجھے، ہربھجن سنگھ ساگر، بندھو شرما، نرسنگھ دیو جموال، دینو بھائی پنت اور برج نندن کو سُنائی۔ سب نے کہانی کو سراہا اور کہا کہ پلاٹ، زبان اور بیان کے لحاظ سے یہ ایک مکمل افسانہ ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ خالد حسین نے اپنی یہ پہلی پنجابی کہانی دہلی سے نکلنے والے پنجابی کے مشہور جریدے ''ناگ منی'' میں چھپنے کے لئے بھیجی۔ ''ناگ منی'' بین الاقوامی شہرت یافتہ، ساہت اکادمی اور گیان پیٹھ ایوارڈی محترمہ امرتا پریتم کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ''ناگ منی'' میں چھپنے والے اپنے آپکو بڑے خوش قسمت سمجھتے تھے۔ خالد حسین کی کہانی ''ناگ منی'' میں چھپی تو پاکستان کے مشہور ادیب اور شاعر اور ماہنامہ ''کونج'' لاہور کے مُدیر احمد سلیم نے اس کہانی کو شاہ مُکھی لپی (اُردو رسم

الخط) میں چھاپا۔یوں خالد حسین کی پنجابی کہانیاں دونوں ملکوں کے پنجابی جرائد میں چھپنے لگیں۔''ٹھنڈی کانگڑی'' کہانی کا چرچا پنجاب میں بہت ہوا۔پھر گرمیوں کے مہینے میں (1972) میں پنجاب اگریکلچر یونیورسٹی لُدھیانہ کے پنجابی شعبہ کے صدر ڈاکٹر سُریندر سنگھ دُوسانجھ کی سربراہی میں شعبہ کے طالب علم سیاحت کے لئے کشمیر آئے۔اُنہوں نے گورودوارہ چھٹی پادشاہی میں خالد حسین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہی اور اُس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔وہاں پنجابی ساہت سبھا سری نگر کے جنرل سیکریٹری پروفیسر پریم سنگھ نے اُنھیں دوسرے دِن خالصہ ہوٹل امیرا کدل میں چائے پر مدعو کیا اور کہا کہ خالد حسین کو وہ وہاں لے کر آئیں گے۔خالد حسین کو اطلاع دی گئی اور دوسرے دِن چار بجے خالصہ ہوٹل میں طالب علموں سے ملاقات کی۔اِس ملاقات کے بعد خالد حسین بہت خوش ہوا اور اُس میں خود اعتمادی اور بڑھی۔طالب علموں میں شمشیر سنگھ سندھو بھی تھا جو بعد میں پنجابی فلموں کا مشہور گیت کار بنا۔یہاں یہ بتاتا چلوں کہ 1972ء میں ریاستی اسمبلی کے سابقہ سپیکر اور بعد ازاں گورنمنٹ سروس میں سیکریٹری صنعت وحرفت کے عہدے پر کام کرنے والے ادب نواز جناب غلام رسول رینزو نے جموں میں کُل ہند اُردو کانفرنس کروائی۔جس میں اُردو ادب کے جگمگاتے ستارے شامل ہوئے۔کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، مجروح سلطان پوری، بیکل اُتساہی، انور مرزاپوری، پریم دھون، رامانند ساگر، واجدہ تبسم وغیرہ کی شرکت نے اُس کانفرنس کی افادیت کو معتبر بنایا۔محفل افسانہ میں جو خواجہ احمد عباس کی صدارت میں ہوا اور جس میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم وغیرہ نے اپنے افسانے پڑھے۔وہاں خالد حسین نے ''ٹھنڈی کانگڑی'' افسانہ پڑھا۔اُس کانفرنس کی رُوداد اور کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات، افسانے، غزلیں اور نظمیں وغیرہ شاہد بڈگامی نے کتابی صورت میں چھاپ کر اُن تاریخی واقعات کو محفوظ کرلیا تھا۔خالد حسین کی دوسری پنجابی کہانی

''مائی نی میں کینوں آکھاں'' اور پھر تیسری اور چوتھی کہانیاں بھی امرتا پریتم جی نے ''ناگ منی'' میں چھاپ کر خالد حسین کو پنجابی کا ایک افسانہ نگار بنا دیا۔ اُنہوں نے خالد حسین کا ایک انٹرویو بھی اپنے جریدے میں چھاپا جو بعد ازاں اُنہوں نے ہندی کے مشہور رسالے ''سوریہ انڈیا'' میں بھی چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ بس پھر خالد حسین نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے افسانے لکھنے لگا۔ پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی۔ جو افسانہ وہ پنجابی میں لکھتا، اُس کا اُردو ترجمہ کسی اُردو جریدے کو بھیج دیتا۔ اِسی طرح جو افسانہ وہ اُردو میں لکھتا، اُس کا پنجابی ترجمہ پنجابی میگزین میں چھپنے کے لئے بھیج دیتا۔ یوں خالد حسین کے افسانے پنجابی اور اُردو میں تواتر کے ساتھ چھپنے لگے۔ وہ پنجابی پاٹھکوں میں ایک جانا پہچانا نام بن گیا۔ اُس پر مضامین لکھے جانے لگے۔ ''ناگ منی'' کے علاوہ پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے جرائد نیل منی، سیدھ، ساہت کار، عکس، پنجابی ڈائجسٹ، پریرنا، لو، اکھر، پریت لڑی، پروچن، سمدرشی، ترشنکو اور بے شمار پنجابی میگزینوں میں وہ لگاتار چھپتا رہا۔ پاکستانی پنجاب کے پنجابی جرائد پنج دریا، سورج مُکھی، پنچم، لہراں، انٹرنیشنل سویر، پنج رنگ، وارث شاہ، سنگری، پنجابی ادب، رویل اور کئی دیگر رسالے۔ جبکہ اُردو میں شب خُون، شمع، آجکل، سطُور، الفاظ، اوراق، تحریکِ ادب، لمحے لمحے، ادبِ لطیف، بدلتی دُنیا، سائبان، قومی ڈائجسٹ، شاعر، سب رس، روبی، نگینہ اور کئی دوسرے رسالوں میں اُس کے افسانے چھپتے رہے۔ اُس نے تقریباً تمام گُل ہند اور ہند۔ پاک پنجابی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ ورلڈ پنجابی کانگریس، بابا فرید امن مشن، بابا نانک امن کانفرنس وغیرہ کیلئے وہ آٹھ نو بار پاکستان گیا۔

بقول خالد حسین یہ غالباً 1971ء کے دسمبر مہینے کی بات ہے، جب وہ ایک ادبی کانفرنس میں شمولیت کے لئے جالندھر گیا۔ وہاں اُس نے اپنا پنجابی افسانہ ''دھرتی روندی اے'' پڑھا۔ محفلِ افسانہ کی صدارت مشہور ادیب اور فلم ایکٹر بلراج ساہنی کر رہے تھے۔

جن سے وہ سری نگر اور جموں میں پہلے ہی مِل چُکا تھا۔ افسانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا گیا تھا۔ افسانہ سُننے کے بعد کئی دوستوں نے اپنی رائے دی لیکن بلراج ساہنی صاحب خاموش رہے۔ تقریب ختم ہونے کے بعد بلراج ساہنی جی خالد حسین کو ساتھ لے کر ہوٹل ''سکائی لارک'' میں لے گئے، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کافی منگوائی اور پھر خالد کی کہانی پر بولنے لگے۔ اُنہوں نے کہا۔

''ویسے تو تمہاری کہانی ہر پہلو سے ایک اچھی کوشش کہی جا سکتی ہے لیکن تم نے کہانی میں ایک خاص فرقے کی حالتِ زار کی تصویر دِکھائی ہے۔ یوں یہ کہانی صرف مُسلم طبقے کے ساتھ جُڑ گئی ہے۔ جب کہ ہندوستان میں ہر مذہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جنکی حالت مسلم طبقے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ کیا دوسری اقلیتیں یہاں زیادہ محفوظ ہیں؟ کیا اُن کے ساتھ ظلم روا نہیں رکھا جا رہا؟ کیا دلت (شُودر) عیسائی، آدی واسی اور دیگر غریب طبقوں کو دو وقت کی روٹی میسر ہے۔ اُن کے پاس رہنے کو چھت ہے؟ پہننے کو کپڑا ہے؟ نہیں ــــ بالکل نہیں۔ دُنیا میں دو ہی مذہب ہیں۔ ایک امیری کا اور دوسرا غریبی کا۔ میں مانتا ہوں کہ سیاسی مفاد پرستوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں سے ہتک آمیز سلوک کیا جاتا ہے اور یہ ہر میدان میں پچھڑ رہے ہیں لیکن مسلم سماج یا ہندو سماج کو مرکزی نقطہ بنا کر کہانی لکھنا ایک ادیب کیلئے مناسب نہیں۔ ادب یونیورسل ہونا چاہیئے۔ اُسکی تخلیق میں اتنا دم ہونا چاہیئے کہ فلسطین میں رہنے والا کہانی پڑھ کر اُسے اپنی رُوداد مانے۔ ویت نام والا کہے کہ یہ اُسکا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ غرض دُنیا کے ہر مظلوم کو کہانی میں اپنا چہرہ دِکھائی دینا چاہیئے۔ ایک ادیب کو کسی خاص دھرم، فرقے یا عقیدے سے جُڑ کر کبھی ادب تحریر نہیں کرنا چاہیئے''۔

ممبئی پہنچ کر بلراج ساہنی جی نے خالد حسین کو پنجابی زبان اور ادب کے حوالے سے

تین خطوط لکھے جو اُس کے پاس محفوظ تھے۔ اُن خطوط میں بلراج جی نے اپنا نظریہ بیان کرنے کے علاوہ اچھا ادیب بننے کے لئے بڑھیا مشورے بھی دیئے تھے۔ اُس کے بعد خالد حسین نے کبھی کوئی ایسا افسانہ نہیں لکھا جس میں کسی خاص مذہب، فرقے، ذات برادری کی طرف جھکاؤ ہو۔

1975ء میں خالد حسین پنجابی ساہت سبھا سری نگر کا صدر منتخب ہوا۔ اُس وقت اُس کی عمر تیس سال تھی اور اُس وقت تک خالد حسین کی پنجابی میں پچاس سے زائد کہانیاں چھپ چکی تھیں اور پنجابی ادبی دُنیا، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُسکو سب جانتے تھے۔ صدر بنتے ہی اُس نے فیصلہ لیا کہ سری نگر میں دو روزہ پنجابی ادبی کانفرنس کرائی جائے۔ سینئر ممبران نے اس تجویز سے اختلاف کیا لیکن ہر بھجن سنگھ ساگر اور اوتار سنگھ چندن خالد کے ساتھ جُڑ گئے۔ پھر کانفرنس کے سلسلہ میں کام شُروع ہوا۔ خالد حسین امرتسر، جالندھر اور کئی دوسرے شہروں میں گیا اور کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلیئے ادب نوازوں کو شرکت کا دعوت نامہ دیا۔ روزنامہ ''اجیت'' جالندھر کے مُدیر اعلیٰ ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد نے مالی مدد بھی کی اور پانچ ہزار روپے دیئے نیز گورودوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر کے صدر گورچرن سنگھ ٹوہرہ کے نام مالی امداد کیلیئے خط لکھ کر دیا۔ ٹوہرہ صاحب نے بھی پانچ ہزار روپے دیئے۔ کانفرنس کی تاریخ مقرر کی گئی اور پھر سات۔ آٹھ جولائی 1975 کو سری نگر کے ٹیگور ہال میں دو روزہ پنجابی ادبی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ خالد حسین کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے کانفرنس میں تقریباً اڑھائی سو دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، کالج اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں نے شرکت کی۔ جن میں پروفیسر وشوا ناتھ تیواڑی (کانگریس کے منیش تیواڑی کے والد)، ڈاکٹر عطر سنگھ، پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں، ڈاکٹر ایس، ایس اہلووالیا، پروفیسر ہرنام سنگھ شان، ڈاکٹر گلونت سنگھ، ڈاکٹر سوہن سنگھ شیتل، ڈاکٹر ہر بھجن سنگھ، ڈاکٹر کرنیل سنگھ تھنِد، ڈاکٹر امریک سنگھ پُونی

(آئی، اے، ایس)، ڈاکٹر سادھوسنگھ ہمدرد، ڈاکٹر دھرم پال سِنگل، ڈاکٹر رگھبیر سنگھ سرجنا کے نام اہم ہیں۔ اس کے علاوہ وریام سندھو، جسونت کنول، مختار گل، گُل چوہان ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گل، پرمندر جیت، جسونت سنگھ وِردی، پاش، امیتوج، چندن نیگی، جوگندر کیروں، ہربھجن باجوہ اور بے شمار افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر بھی تشریف لائے۔ کانفرنس کی صدارت وزیراعلیٰ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پنجاب کے چیف منسٹر گیانی ذیل سنگھ نے شرکت فرمائی۔ اُنکے ساتھ پنجابی کے اُستاد شاعر اور سابقہ وزیر اعلیٰ پنجاب گیانی گورمکھ سنگھ مسافر اور پنجاب کے وزیر تعلیم بھی تشریف لائے۔ شیخ محمد عبداللہ کی کابینہ کے سبھی وزراء نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی حالانکہ اُن دِنوں اسمبلی کا سیشن چل رہا تھا۔ جموں کشمیر کے وزیر تعلیم سردار رنگیل سنگھ جی نے بھی سبھی مہمانوں کو امر سنگھ کلب میں عشائیہ دیا جس میں دونوں وزرائے اعلیٰ نے شرکت کی اور جموں وکشمیر اور پنجاب کے باہمی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ نارتھ زون کلچرل سنٹر پٹیالہ اور دیگر تنظیموں کی طرف سے رنگارنگ تمدنی پروگرام پیش کیا گیا۔ اُن دِنوں ملک میں ایمرجنسی لگی ہوئی تھی۔ اور سری نگر میں منعقدہ پنجابی ادبی کانفرنس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے گیانی ذیل سنگھ جی کے دو وزراء نے روزنامہ ''اجیت'' کے چیف ایڈیٹر سادھوسنگھ ہمدرد جی کو یہ تجویز دی کہ کانفرنس کے دوران کیوں نہ ایمرجنسی کے حق میں قرارداد منظور کرالی جائے۔ خالد حسین کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس ادبی کانفرنس کو سیاست کے لئے بھی استعمال کیا جائے گا لیکن اُسے مشہور شاعر ''پاش'' نے بتایا کہ گیانی ذیل کے چمچے ایمرجنسی کے حق میں قرارداد پاس کروانے جارہے ہیں۔ اگر ایسی کوقرارداد لائی گئی تو وہ اُسکی سخت مخالفت کریں گے اور کانفرنس میں کھلبلی مچے گی، اُس کے لئے وہ اور اُسکے ساتھی ادیب ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ خالد حسین نے ساری بات ڈاکٹر عطر سنگھ، ڈاکٹر وشوامتر تیواڑی اور سادھوسنگھ ہمدرد کو بتائی اور یہ بھی کہا کہ شیخ

محمد عبداللہ بھی ایمر جنسی کے سخت خلاف ہیں۔لہذا اگر اس قسم کی قرار داد منظور کرائی گئی تو خالد حسین کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ان سبھی دانشوروں نے انتہائی خوش اسلوبی سے اس معاملہ کو سُلجھایا اور ایمر جنسی والی قرارداد پیش نہیں ہونے دی۔اس کانفرنس کی وجہ سے جموں یونیورسٹی میں بابا فرید چیئر دینے کا اعلان گیانی ذیل سنگھ جی نے کیا۔پنجابی کے مشہور ناول نویس اور ہندی فلم ''پوتر پاپی'' کے لیکھک نانک سنگھ کے بیٹے ڈاکٹر کرتار سنگھ سُوری کو ہیڈ بنایا گیا۔ بعدازاں یہ چیئر پنجابی شعبہ میں تبدیل ہوئی۔گیانی جی نے پنجابی ساہت سبھا سری نگر کو مالی امداد بھی دی۔چندن نیگی کا ادبی سفر بھی اِسی کانفرنس میں کہانی پڑھنے سے شروع ہوا۔اس تاریخی کانفرنس کو ناکام کرنے کیلئے مقامی پنجابی ادبی مافیا اور ساہت سبھا کے پُرانے چوہدریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ سبھا اُنکے ہاتھ سے ہمیشہ کیلئے نکل جائے۔اُنہوں نے تار اور ٹیلیفون کے ذریعے ہمدرؔد صاحب، ڈاکٹر عطر سنگھ اور کئی دوسرے معتبر صحافیوں اور ادیبوں سے کہا کہ کانفرنس ملتوی کردی گئی ہے۔للہذا کوئی بھی سری نگر نہ آئے کیونکہ یہاں حالات خراب ہیں۔ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد نے خالد حسین سے ٹیلیفون پر رابطہ کیا اور پوچھا کہ کیا کانفرنس کینسل کردی گئی ہے۔جب خالد حسین نے کہا کہ بالکل نہیں۔ بلکہ یہ اُنکے مخالفوں کی سازش ہے تو ہمدرد صاحب نے لگاتار چار، پانچ ایڈیٹوریل کانفرنس کے حوالے سے لکھے اور اُس میں شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے کہا۔ کانفرنس کی مخالفت کرنے والوں میں کنول کشمیری، گورچرن سنگھ گُلشن ،سیوا سنگھ اور پریم سنگھ پیش پیش تھے۔اُنھیں اس بات کا دُکھ تھا کہ ایک مُسلا ہمارے بغیر کیسے یہ کانفرنس کراسکتا ہے۔اِن لوگوں کے سارے ہتھکنڈے ناکام ہوئے تو کانفرنس سے ایک دِن پہلے یہ لوگ دفتر میں آکر کہنے لگے ''پچھلی باتوں کو بھلا دو اور ہمیں کانفرنس کی ذمے داری سونپو۔ پروفیسر پریم سنگھ سٹیج سنبھال لے گا۔مہمانوں کے سواگت کے لئے سیوا سنگھ اور سرن سنگھ

ہیں۔تم فِکر نہ کرو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ پنجابی زبان اور ادب کی ترقی ہم سب کا مقصد ہے۔ لہٰذا ہم کام بانٹ لیتے ہیں''۔ خالد حسین نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یہ دوغلا پن چھوڑیں اور شرارتیں کرنا بند کردیں۔ سٹیج ہر بھجن سنگھ ساگر سنبھالے گا جس نے رات دِن کام کیا ہے۔ آپ لوگ صرف کانفرنس میں شرکت کریں۔ یہی کافی ہے''۔ اس کانفرنس کیلئے خالد حسین، اوتار سنگھ چندن اور ہر بھجن سنگھ ساگر گوردواروں، دُوکانوں اور پنجابی گھروں میں چندہ اکٹھا کرتے رہے۔ مہمانوں کو ٹھہرانے کیلئے سری نگر میں مقیم پنجابی بھائیوں سے التجا کی گئی کہ وہ دو دو مہمانوں کو اپنے ہاں ٹھہرائیں۔ الغرض کانفرنس کی کامیابی پر سب خوش تھے اور خالد حسین نے شُکرانے کے نفل پڑھے کہ اللہ نے عزّت رکھ لی۔ لیکن اِس ادبی مافیا کی گھٹیا سوچ کا اندازہ آپ اِس بات سے لگائیں کہ کانفرنس سے متعلق فائلیں، فوٹو البم، حساب کتاب کا رجسٹر، خطوط اور دیگر متعلقہ ریکارڈ ساہت سبھا کے دفتر سے ہی غائب کردیا گیا۔ تاکہ اس تاریخ ساز کانفرنس کی حصولیابی کا سہرا خالد حسین کے سر نہ باندھا جاسکے۔ یہ باتیں سناتے ہوئے خالد حسین اکثر جذباتی ہوجاتا تھا۔

جموں میں رہائش کے دوران خالد حسین اکثر پنجابی لیکھک سبھا جموں کی ادبی مجالس میں حِصہ لیتا۔ ایک بار پروفیسر بھوپندر سنگھ سُودن کے بارے میں بات ہورہی تھی۔ بھوپندر سنگھ سُودن خالد حسین کا دوست تھا اور خالد نے اُس کے پہلے افسانوی مجموعے کا پیش لفظ بھی لکھا تھا۔ خالد حسین نے جب اپنی رائے رکھی تو وہاں بیٹھے سُودن کے ایک نام نہاد حمایتی نے خالد حسین پر کُرسی دے ماری۔ کُرسی خالد کو نہیں لگی لیکن وہاں بیٹھے کسی نے بھی احتجاج نہیں کیا بلکہ سب خاموش رہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ خالد حسین خاموشی سے اُٹھا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ کسی نے اُسے روکا بھی نہیں۔ صرف کہانی کار راجؔ چُھو پال باہر آیا اور معافی مانگنے لگا لیکن معافی تو سبھا کے صدر اور ممبران نے مانگنی چاہیئے تھی پھر اُسکے

بعد خالد حسین نے کبھی لیکھک سبھا کے دفتر میں قدم نہیں رکھا۔فرداً فرداً سبھی اُس کے پاس معافی مانگنے آئے۔ یہاں تک کہ مہندر سنگھ رنجور بھی اُسکے گھر آیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنے کئے پر معافی مانگنے لگا لیکن بحیثیت مجموعی سبھا نے معذرت نہیں کی۔ چنانچہ اُس کے بعد خالد کبھی وہاں نہیں گیا۔ 2010ء میں نئے صدر شمشیر سنگھ چوہالوی نے بحیثیت صدر معافی نامہ لکھ کر دیا اور گذارش کی کہ وہ سبھا کی میٹنگوں میں آئے لیکن وہ نہیں گیا۔البتہ سبھا کا دفتر بنانے کیلئے اُس سے جتنی مدد ہوسکی وہ اُس نے کی۔ پھر اُس نے اپنے دوست ہربھجن سنگھ ساگر، سوشیل شرما اور سرن سنگھ کے ساتھ مِل کر ایک نئی ادبی جماعت بنائی اور نام رکھا ''پنجابی ادبی سنگت'' جس نے جموں میں کئی ادبی پروگرام کرائے۔

یہ شاید 1979ء کی بات ہے کہ خالد حسین نے اپنی نئی پنجابی کہانی ''بیڑے دی لنکا'' پنجابی ساہت سبھا سری نگر کے دفتر میں پڑھی۔ محفلِ افسانہ کی صدارت نامور اُردو شاعر، نقاد اور ادیب جناب علی سردار جعفری کر رہے تھے۔ ساہت سبھا کے مہارتھیوں نے افسانے کی دھجیاں اُڑا دیں اور اُسے افسانہ ماننے سے ہی انکار کردیا۔ جب محفلِ افسانہ کے صدر جناب علی سردار جعفری نے صدارتی کلمات فرمائے تو اُنہوں نے خالد حسین کے افسانہ کی بہت تعریف کی اور افسانے کا تقابلی جائزہ بیدی اور کرشن چندر کی کہانیوں سے کیا۔انہوں نے خالد حسین سے کہا کہ وہ اس افسانے کا اُردو ترجمہ کرے اور اُنھیں دے تاکہ وہ اسے اپنے ماہنامہ ''گفتگو'' میں چھاپ سکیں۔علی سردار جعفری صاحب سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے اور دوسرے دِن اُنکی ممبئی کے لئے فلائٹ تھی۔ خالد حسین نے رات دو بجے تک افسانے کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ پھر کاربن رکھ کر اُسے صاف صاف لکھا۔ اتنے میں صبح ہوگئی تھی۔ اُس نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور سرکٹ ہاؤس چلا گیا۔ جعفری صاحب بریک فاسٹ کر رہے تھے۔ اُنہوں نے خالد حسین کو بھی ناشتے میں شامل کیا۔ پھر اُردو ترجمہ سنا۔ خالد حسین نے

اُن کا شکریہ ادا کیا اور واپس تلسی باغ اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔ دو مہینے بعد خالد حسین کو گفتگو جریدے کی کاپی ڈاک کے ذریعہ ملی جس میں اس کا افسانہ ''بیڈے کی لنکا'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ شمارہ اکتوبر 1979ء کا تھا۔ یہی افسانہ لاہور سے شائع ہونے والی پنجابی میگزین ''لہراں'' میں بھی چھپا تھا اور امرتسر سے نکلنے والے جریدے ''ساہتکار'' میں بھی چھپا تھا۔ پھر فروری 1980ء میں اس کہانی کا انگریزی ترجمہ ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں چھپا۔ جس کا ترجمہ مشہور انگریزی ادیب، صحافی اور السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (ممبئی) کے مُدیر جناب خشونت سنگھ نے کیا تھا اور فٹ نوٹ میں لکھا تھا، ''Courtesy from Guftugoo'' یعنی کہانی پنجابی میں لکھی گئی۔ پھر اُسکا ترجمہ خالد حسین نے اُردو میں کیا اور وہاں سے انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ یہ وہی کہانی ہے جس کو پنجابی ساہت سبھا کے مافیا گروپ نے یکسر مسترد کر دیا تھا۔ یہ کہانی خالد حسین کے دوسرے پنجابی افسانوں مجموعے ''گوری فصل دے سوداگر'' میں درج ہے اور اُردو کے افسانوی مجموعے ''اشتہاروں والی حویلی'' میں شامل ہے۔ خالد حسین کے ایک شرارتی دوست نے نمک مرچ لگا کے یہ کہانی اُستاد محلے کے اُن کرداروں کو سُنائی جن کے اِردگرد کہانی بُنی گئی تھی۔ کیونکہ اُن کے نام افسانے کے کرداروں کے ساتھ ملتے جُلتے تھے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے خالد حسین کے خلاف عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا۔ کُچھ لوگ خالد کے گھر کے باہر گالی گلوچ بھی کرتے۔ آخر محلے کی کُچھ معتبر شخصیات اور خالد حسین کے کچھ دوستوں نے اُن لوگوں کو سمجھا بُجھا کر معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ پنجابی میں خالد حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ 1976ء میں چھپا جس کا عنوان تھا ''تے جہلم وگدا رہیا''۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''گوری فصل دے سوداگر'' 1981ء میں اور پنجابی کہانیوں کی تیسری کتاب ''ڈونگھے پانیاں دا دُکھ'' 1988ء میں چھپی جبکہ کہانیوں کی چوتھی کتاب ''بلدی برف دا سیک'' 2005ء میں پانچویں کتاب

''سُولاں دا سالن''2015ء میں چھپی اور چھٹا پنجابی افسانوی مجموعہ ''عشق ملنگنی''2019ء میں منظر عام پر آیا۔ اِن افسانوی مجموعوں کے علاوہ خالد حسین نے پنجابی میں اپنی سوانح حیات ''ماٹی کُدم کریندی یار'' 2013ء میں چھپوائی۔ غیر مسلم بچوں کیلئے آنحضرتؐ کی بائیوگرافی ''نوری رِشماں'' 2004ء میں۔ مضامین کا مجموعہ ''میرے رنگ دے اکھر'' 2013ء اور ایک ناولٹ ''گواچی جھانجر دی چیک''2010ء میں پبلش کروایا۔

اُردو زبان میں خالد حسین کے چار افسانوی مجموعے چھپ چُکے ہیں۔ جن کے نام ہیں، 1۔ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں (1981ء)، 2۔اشتہاروں والی حویلی (1991ء)، 3۔ستی سر کا سورج (2011ء) اور جنّت گرہن (2021ء)۔ خالد حسین کے کئی افسانوں کا ترجمہ ہندی، بنگالی، ملیالم، تمل، ڈوگری، کشمیری اور انگریزی میں ہو چُکا ہے۔ اُس کی کہانیوں کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر کیرتی کیسر، سردار پنچھی، یوگیتا یادو، دیس راج کالی، اگنی شیکھر وغیرہ نے کیا ہے اور ہندی میں یہ کہانیاں ''بھاشا''، ''سمکالین بھارتی ساہت''، ''دینک جاگرن''، ''دینک بھاسکر''، ''دینک ٹریبون'' اور ''امر اُجالا''، ''پنجاب کیسری'' اور دیگر کئی میگزینوں میں چھپ چُکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ خالد حسین کی کہانیوں کا ہندی انتخاب ''گھر میں ہے بیراگ'' کے نام سے 2017ء میں چھپا تھا جس میں اُس کی 41 کہانیاں درج ہیں اور مترجم کا نام دیپک آرسی ہے۔ خوشونت سنگھ کے علاوہ ڈاکٹر للت گپتا، آدرش اجیت، مشتاق برق، شفیع احمد کے علاوہ دو چار دوسرے لوگوں نے بھی خالد حسین کی کہانیوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ اُس کی ایک کہانی ''لکیر'' پر پہلی پوٹھواری فلم بنی ہے جس نے سلور جوبلی منائی تھی۔ اُس کی دو کہانیوں پر مشتمل ڈرامہ ''عشق ملنگی''، مشہور تھیٹر ڈائریکٹر مشتاق کاک نے ملک کے 12 بڑے شہروں میں اسٹیج پر کھیلا ہے جن میں کلکتہ، میسور، حیدر آباد، میرٹھ، امرتسر، بنگلور، چنئی اور بھوپال قابل ذکر ہیں۔ نئی دہلی میں یہ ڈرامہ نیشنل سکول آف ڈرامہ کی طرف سے

کھیلا گیا۔خالد حسین کا افسانوی سفر تقریباً پچاس سال پر محیط ہے۔ اُس کے بے شمار انٹرویو ہندوستان اور پاکستان کے مشہور ٹیلی ویژن چینلوں اور ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔اُسکے افسانوں پر پنجابی کے نامور تنقید نگاروں نے پیپر لکھے ہیں جن میں ڈاکٹر نرنجن تسنیم، ڈاکٹر ستندر سنگھ نُور، ڈاکٹر منموہن، ڈاکٹر سی۔آر۔ مودگل، ڈاکٹر جگبیر سنگھ، ڈاکٹر جوگندر راہی، ڈاکٹر کرمجیت سنگھ، ڈاکٹر گورپال سنگھ سندھو، ڈاکٹر سُکھدیو سنگھ، ڈاکٹر رو ندر کمار، ڈاکٹر دیویندر کور، ڈاکٹر ہرمندر کور، پرتپال سنگھ بیتابؔ، فخر زماں، پروین ملک، ڈاکٹر سعید بھٹا، نین سُکھ، اقبال قیصرؔ وغیرہ اہم نام ہیں۔ یہ تنقیدی مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں اور کتاب کا نام ہے۔ ''خالد حسین دا کتھا جگت'' خالد حسین کی کئی کہانیاں بی۔ اے اور ایم۔اے (پنجابی) کلاسوں کے نصاب کا حِصہ بنتی رہی ہیں۔تقریباً سبھی یونیورسٹیوں میں اُس پر کام ہوتا رہا ہے۔ ابھی تک اُس پر گیارہ ایم۔فِل اور ایک پی۔ایچ۔ڈی ہو چکی ہے۔ اُردو افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں''، ''اشتہاروں والی حویلی'' اور ''ستی سر کا سورج'' پر جموں یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم فِل ہو چکا ہے جبکہ ''جنّت گرہن'' پر جموں یونیورسٹی کا ایک اسکالر ایم فِل کر رہا ہے۔ وہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی میں پنجابی ایڈوائزری بورڈ کا پانچ سال تک ممبر رہا۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی Standing Committee کا بھی ممبر رہا اور بابا فریدؔ صوفی فاؤنڈیشن سے بھی وابستہ رہا۔ پاکستان اور ہندوستان کے کئی ادبی اداروں کی جانب سے اُسکی عزت افزائی کی گئی۔ ''پریس کلب لاہور'' مسعود کھدر پوش ٹرسٹ لاہور، سٹی زن کونسل میرپور، ورلڈ پنجابی کانگرس لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور وغیرہ اور بھارت میں پنجاب سرکار کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔ (شرومنی پنجابی ساہتکار) سے نوازا جا چکا ہے۔ جس میں خلعت فاخرہ کے علاوہ پانچ لاکھ کی رقم بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ پنجاب سرکار کی طرف سے ''پنجاب رتن'' کا ایوارڈ،

کیندری لیکھک سبھا چندی گڑھ، پنجابی ساہت اکادمی لُدھیانہ، ''قلم'' پھگواڑہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر Outstanding پنجابی رائٹر کا ایوارڈ کے علاوہ کئی دیگر انعامات جن کی لسٹ بڑی لمبی ہے۔ خالد حسین کی کہانیوں کے موضوع، ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ تہذیب وتمدن اور آپسی بھائی چارہ، ملک کی تقسیم کے زخم، جموں وکشمیر کی سیاست، 1990ء کے بعد ریاستی عوام کے مسائل بے بسی اور بے کسی کے حالات، سماج میں عورت کی حالت وغیرہ ہیں۔ خالد حسین کے افسانوں کے بارے میں چند مشہور ناقدین اور ادیبوں کی آرا پیش کر رہا ہوں۔

''خالد حسین کے افسانے وسیع مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی دلیل ہیں۔ اُسکی کہانیوں میں تواریخ، سماجیات اور سیاسیات کا ایک پورا منظرنامہ ملتا ہے''۔ فخر زماں (ناول نگار۔ شاعر) سابقہ چیئرمین پاکستان اکادمی آف لیٹرز

''خالد حسین کے افسانوں میں علامتی لہجہ، الفاظ کی تہذیب اور فنی رموز پر دسترس، اُسکی خصوصیت ہے۔ (ڈاکٹر ستیندر سنگھ نُور، سابقہ نائب صدر، ساہتیہ اکادمی، دِہلی)۔

خالد حسین اپنے تخلیقی عمل میں نہ کسی مذہب سے وابستہ ہوتے ہیں اور نہ کسی ملک سے۔ جغرافیائی حدیں اور سرحدیں اُن کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ (وریام سندھو۔ افسانہ نگار)

خالد حسین اپنے موضوعات کا شعوری انتخاب کرتے ہیں اور گردو پیش کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے افسانہ لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔ (ڈاکٹر حامدی کشمیری (نقاد) سابقہ وائس چانسلر۔ کشمیر یونیورسٹی)

خالد حسین کے افسانوں میں زبان کے استعمال کا کمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُس کے بیشتر افسانے دِلوں کی دُوریاں مٹانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ (ڈاکٹر للت مگوترا۔ افسانہ نگار)

خالد حسین کی کہانیوں میں شبد شکتی، انسان اور انسانیت کے تییں اُسکی ادبی ذمہ داری کا برملا اظہار ملتا ہے۔ وہ مشرقی اور مغربی پنجاب کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ (ڈاکٹر اگنی شیکھر۔ ہندی افسانہ نگار اور شاعر)

خالد کو جب ملتا ہوں تو اُسکا اپناپن، دلچسپ باتیں، لطیفے ایک ایسا عالم طاری کرتے ہیں کہ اپنی دُنیا اور اپنا آپ اچھا لگنے لگتا ہے۔ اُس کے افسانے پڑھتا ہوں تو اُسکی بامحاورہ چٹخاری زبان اور کہانی پن، جاندار کردار اور بیان کا جادُو دِل کو موہ لیتا ہے۔ مجھے وہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان بیٹھا ایک ایسا درویش لگتا ہے جو پانچ دریاؤں کی لہروں کا ترجمہ کر رہا ہے۔ (ڈاکٹر سُرجیت پاتر۔ پنجابی شاعر)

خالد حسین کی کہانیوں میں ایک ایسی دُنیا آباد ہے جو اُسکی نصف صدی کے ذہنی سفر کی غماز ہے۔ وہ ایک سچا ادیب ہے۔ اُس نے بڑی ایمانداری سے دُنیا کو ایسا آئینہ دِکھایا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ (ویدراہیؔ۔ اُردو، ڈوگری افسانہ نگار۔ فلم ساز اور ہدایت کار۔ ممبئی)

خالد حسین کے افسانے بیک وقت مفاہمت اور مزاحمت دونوں کا رشتہ نبھاتے ہیں۔ اُس نے ایمانداری کے ساتھ اپنے ماحول اور معاشرہ کی سچائیوں کو بیان کیا ہے۔ (پروفیسر قدوس جاوید۔ سابقہ صدر، شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی)

خالد حسین صاحب ایک فطری، معتبر اور کُہنہ مشق تخلیق کار ہیں۔ اُنکو اپنے فن پر کامل گرفت اور مہارت حاصل ہے۔ اُنکی کہانیاں مدتوں دِل ودِماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ کہانیوں میں اُردوئے مُعلی کی شیریں اور سادہ زبان ہے۔ پنجابی محاورے اور اُردو کی ضرب المثلیں ہیں جو کہانی کے دسترخوان کو خوش ذائقہ اور خوش رنگ بنادیتی ہیں۔ (سید تقی عابدی (ڈاکٹر)۔ نقاد۔ ٹورنٹو، کنیڈا)

خالد حسین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے دو باتوں کا شدّت سے احساس ہوا۔ پہلی،

اُسکی کہانیوں میں کہانی پن کا مضبوط اظہار اور دوسری اُسکی زبان کی خوبصورتی۔ اُس کا بیانیہ اور منفرد اسلُوب اُس کی خوبی بھی ہے اور شناخت بھی۔ (منموہن (ڈاکٹر) پنجابی نقاد، ناول نگار اور شاعر، دوارکا۔ نئی دہلی)

میں نے بھی اپنے ایک مضمون میں خالد حسین کے فن کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ کہا ہے۔ ''خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کھُردری سطح اور اِردگرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکی کہانیوں میں جہاں حُسن و جمال اور پیار محبت کی نزاکتیں ملتی ہیں وہاں موجودہ پُر آشوب دور کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تصویریں ضرور بدصورت ہیں لیکن خالد حسین اِس بدصورتی کو خوبصورتی میں تبدیل کرنے کا خواہاں ہے۔(نور شاہ۔ افسانہ نگار)

2004ء میں پنجابی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا ایک وفد اُس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ کی سربراہی میں ورلڈ پنجابی کانفرنس میں شمولیت کیلئے لاہور گیا۔ اُس وفد میں جموں و کشمیر کی نمائندگی خالد حسین نے کی تھی۔ خالد حسین کے ساتھ اُسکے دوست پرنسپل اوتار سنگھ سِدھو اور بیبا بلونت شاہ تاج ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ دوسرے دِن کانفرنس پانچ تارہ ہوٹل ''فلیٹی'' کے کانفرنس ہال میں شروع ہوئی۔ اسٹیج پر پاکستانی پنجاب کے وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی، بھارتی پنجاب کے چیف منسٹر کیپٹن امریندر سنگھ، دونوں پنجابوں کے وزرائے تعلیم و ثقافت اور ورلڈ پنجابی کانگرس کے چیئرمین اور سابقہ وزیر جناب فخر زماں بیٹھے تھے جو مشہور ناول نگار اور شاعر ہیں۔ فخر زمان صاحب جب استقبالیہ خطبہ پڑھ رہے تھے تو پرنسپل اوتار سنگھ سِدھو نے ایک پرچی پر لکھا کہ اُسے منٹگمری جانے کی اجازت دی جائے جہاں وہ موضع گریجویٹ چک میں پیدا ہوا تھا وہ وہاں جانا چاہتا ہے تا کہ اپنے گھر کو دیکھے اور وہاں کی مٹی لائے۔ پرچی اُس نے جاکر پرویز الٰہی

صاحب کو دی۔ اُنہوں نے پرچی پڑھی اور اپنے پاس رکھ لی۔ جب وہ صدارتی کلمات کہنے کے لئے اُٹھے تو اُنہوں نے سب سے پہلے اوتار سنگھ سِدھو سے مخاطب ہو کر کہا کہ ,کسی سِدھو صاحب نے مجھے یہ پرچی دی ہے اور منٹگمری جانے کی اجازت مانگی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ لارڈ منٹگمری اور باقی سارے انگریز برصغیر ہندوپاک سے کب کے جا چکے ہیں۔ اسلئے ہم نے یہاں کے رہنے والے ساہی جٹوں کے نام پر منٹگمری کا نام سوہیوال رکھا ہے۔ اُنہوں نے فراخ دِلی کے ساتھ محکمہ سیاحت کے ڈائریکٹر کو حکم دیا کہ وہ انھیں ساہیوال جانے کیلئے سرکاری کار دیں۔ دوسری صبح اوتار سنگھ سِدھو، بیبا بلونت اور خالد حسین ساہیوال کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ سب کو پیاس لگی ہوئی تھی۔ جب کار اوکاڑہ پہونچی تو ڈرائیور سے رُکنے کیلئے کہا گیا۔ وہ تینوں کار سے نیچے اُترے اور ایک پھل فروش سے کینُو کا جُوس پلانے کیلئے کہا۔ وہ جُوس بنانے لگا اور اتنے میں کئی مقامی لوگوں نے اُن کو گھیر لیا۔ وہ سب گرم جوشی سے اوتار سنگھ سِدھو اور بیبا بلونت کو مِل رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہ لوگ پاکستان بننے کے وقت لُدھیانہ، فیروز پور، جالندھر، نکودر وغیرہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں۔ اُنھیں بھی اپنی جنم بُھومی دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ جُوس پینے کے بعد جب اوتار سنگھ پیسے دینے لگا تو پھل والے نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ بیبا بلونت اور سِدھو نے سمجھایا کہ آپ غریب ہو، اس لئے پیسے لے لو۔ مگر وہ نہ مانا۔ خیر جب وہ سب کار میں بیٹھے تو کافی دُور جانے کے بعد خالد حسین نے دیکھا کہ دو لفافے سیٹ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے جن میں ,کنّو تھے۔ پوچھنے پر ڈرائیور نے بتایا کہ ,کنّو کے لفافے اُسی پھل فروش نے رکھے ہیں۔ غریب دِل کے کتنے امیر ہوتے ہیں، یہ لفافے اس کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جب خالد حسین ڈاکٹر اوتار سنگھ سِدھو اور بیبا بلونت ساہیوال ضلع کے موضع گریجویٹ چک پہونچے تو سِدھو کے آبائی گھر کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ آخر گاؤں کی ایک 90 سالہ بُڑھیا نے

سِدھو کے والد گور بخش سنگھ کے گھر کی نشان دہی کی اور کہا کہ اُس نے گور بخشے کو گود میں کھِلایا ہے۔گاؤں میں ایک مسجد اور تین مکان پُختہ تھے جبکہ باقی سارے مکان کچے تھے۔ اُن لوگوں نے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور سب نے اپنے اپنے گھر سے پکا ہوا کھانا لایا اور گاؤں کی چوپال میں سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ بیبا بلونت نے اُس منظر کو اپنے کیمرے میں قید کر لیا اور وہ فوٹو گراف مجھے خالد حسین نے دِکھائے تھے۔ جن میں گاؤں کا پیار جھلکتا تھا۔خالد حسین نے مجھے تفصیل سے اپنے پہلے دورۂ پاکستان کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے بتایا تھا کہ پاکستانی عوام بھارت کے لوگوں کیلئے پیار اور محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جب بھی ہندوستانی ہندُو کٹاس راج کی یاترا کے لئے چکوال جاتے ہیں تو وہاں کے لوگ یاتریوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور جب سکھ بھائی ننکانہ صاحب، پنجہ صاحب اور کرتار پور کے گورودواروں کی یاترا کرنے جاتے ہیں تو پاکستانی عوام اُن کی مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ جب تینوں دوست ساہیوال سے واپس آنے لگے تو ڈرائیور نے کہا کہ یہاں سے پندرہ کلو میٹر دور ہڑپا شہر کے آثار ہیں۔ اگر دیکھنا چاہیں تو وہ اُنھیں وہاں لے جا سکتا ہے۔ خالد حسین نے اُونچی آواز میں کہا۔''ضرور جائیں گے''۔ ڈرائیور اُنکو ہڑپا دکھانے لے گیا، جو موہن جودوڑو اور ہڑپا تہذیب کا حِصہ ہے اور یہ دونوں شہر دراوڑوں اور بعدازاں آریوں نے بسائے تھے۔کئی میلوں پر محیط کھُدائی ہوئی تھی اور جو آثار برآمد ہوئے تھے، اُنکو ایک بڑے میوزیم میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ میوزیم دیکھنے لائق ہے۔ خالد حسین نے بتایا تھا کہ مغربی پنجاب کے کئی تاریخی علاقوں میں ہزاروں سال پُرانی تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ جن میں ملتان، سبی بلوچستان، مہر گڑھ، جہلم، گجرات، چکوال وغیرہ مشہور ہیں۔ انہی علاقوں میں وید لکھے گئے۔ اُپنشد لکھے گئے۔ اسی علاقے میں سکندر اور پورس کی لڑائی ہوئی۔ راولپنڈی سے تیس کلو میٹر دور ٹیکسلا کا تاریخی قصبہ ہے جو کبھی

گندھارا تہذیب کا مرکز تھا۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ پنجاب، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان میں ویدک دھرم، بُدھ مت، جین مت اور اسلامی تہذیب کی نشانیاں بتاتی ہیں کہ بے شک مُلک تقسیم کرلو، زمین بانٹ لو لیکن مشترکہ تہذیب، زبان اور ثقافت کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اُن کو بانٹا نہیں جاسکتا۔ یہ بات ہمارے سیاست دانوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کو سمجھنی چاہیئے۔ ہندوستان اور پاکستان بنیادی طور پر ایک ہی اکائی ہیں۔ لہذا لوگوں کو آپس میں ملنے دیا جائے۔ پاسپورٹ اور ویزا کی بندشیں ختم کی جائیں۔ خاص کر جموں و کشمیر کے عوام کے لئے۔ تاکہ لوگ اپنے خُون کے رشتوں سے مِل سکیں۔ اُوڑی۔ مظفر آباد اور ''چکاں دا باغ'' کی طرح جموں۔ سیالکوٹ، ٹیٹوال۔ شاردا (نیلم ضلع) اور کرگل۔ اسکردُو کے پُرانے راستے دوبارہ بحال کئے جائیں۔ اگر امریکہ اور کنیڈا اور بھارت، نیپال میں پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر سفر کیا جاسکتا ہے تو ہندوستان اور پاکستان میں کیوں نہیں۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ ہمارے صوفیوں اور سنتوں کا کلام ہمیں کبھی جُدا نہیں کرسکتا۔ اصل میں زمین کبھی نہیں تقسیم ہوتی۔ زمین کو تقسیم کرنے والے مرکھپ جاتے ہیں۔ شام دیر گئے جب وہ واپس آئے تو اُنکا انتظار ہو رہا تھا کیونکہ ہندوستانی ڈیلیگیشن کو لیکر قصُور بابا بُلھے شاہ کے مزار پر حاضری دینے جانا تھا اور للیانی کے ''پنجابی کھوج گھر'' میں مشاعرے میں شرکت کرنی تھی۔ جہاں قصُور والوں کی طرف سے عشائیہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ خالد حسین نے بابا بُلھے شاہ کے مزار پر چادر چڑھائی اور اپنے روحانی مُرشد کے قدموں میں کچھ دیر بیٹھ کر دُعائے خیر مانگی۔ رات دیر گئے وہ لوگ واپس لاہور آگئے۔ تیسرے دِن محفل افسانہ اور مشاعرہ تھا۔ محفلِ افسانہ میں خالد حسین نے اپنی کہانی ''حلالہ'' پڑھی جسے پروفیسر جمیل احمد پال نے بعدازاں اپنی میگزین ''سویر انٹرنیشنل'' میں چھاپا۔ اُسی دِن پنجاب رائٹرز گلِڈ لاہور کی طرف سے ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں خالد حسین کے علاوہ چند اور بھارتی ادیبوں

کو مدعو کیا گیا۔ اُس نشست کی صدارت مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار الیاس گھُمن نے کی جبکہ کاروائی کی نظامت راجہ رسالُو نے کیا۔ رات کو ''الحمرہ اڈیٹوریم'' میں پنجابی گائیکی کا لُطف اُٹھایا گیا۔ دونوں پنجابوں کے فنکاروں نے پروگرام پیش کیا۔ ہندوستانی پنجاب سے لوک ناچ کے ماہر پمی بھائی نے ''جھومر'' پیش کیا۔ اقبال باہُو نے سلطان باہُو کا کلام پیش کیا۔ اُستاد حامد علی خان اور شام چوراسیا گھرانے کے شفقت علی خان نے پنجابی گیت پیش کئے۔ پروگرام کے بعد گوال منڈی کی ''فوڈ اسٹریٹ'' میں بھارتی وفد کیلئے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اگلی صبح خالد حسین کے کچھ دوست چند گورودواروں کی زیارت کیلئے چلے گئے اور خالد حسین لاہور کی سیر کو نکلا۔ شالامار باغ دیکھا اور باغ کے بغل میں مشہور پنجابی صوفی شاعر مادھولال شاہ حسین کی مزار پر گیا اور فاتح پڑھی۔ شاہی مسجد کے بغل میں علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی۔ شاہی مسجد میں قرآن کریم کے قدیم اور نادر نسخے دیکھے۔ شاہی قلعہ دیکھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ، مینار پاکستان، ہیرا منڈی اور انارکلی بازار میں گھوما اور پھر داتا گنج بخش کے مزار میں نماز ادا کی اور دُعائے خیر مانگی۔ عالمی پنجابی کانفرنس میں بڑی اہم قراردادیں پاس کی گئیں جن میں اہم یہ تھیں۔ 1۔ دونوں ملکوں کے ادیبوں، فنکاروں اور آرٹسٹوں کو ایک دوسرے ملک میں آنے جانے کیلئے ویزا سسٹم ختم کیا جائے۔ 2۔ پنجابی زبان کے دونوں رسم الخط دونوں ملکوں میں پڑھائے جائیں یعنی گورمُکھی مغربی پنجاب اور شاہ مُکھی مشرقی پنجاب میں پڑھائی جائے۔ 3۔ شادمان چوک کا نام بدل کر بھگت سنگھ چوک رکھا جائے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں بھگت سنگھ اور اُسکے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ 4۔ پنجابی کلچرل گروپ ایک دوسرے ملکوں میں بھیجے جائیں۔ تا کہ پنجابی ورثہ کو سنبھالا جاسکے۔ خالد حسین جتنے دِن لاہور میں رہا، اُس سے ملنے ادیب اور شاعر آتے رہے۔ ''شاہ تاج'' ہوٹل کے جس کمرے میں وہ ٹھہرا تھا وہاں کی ہر شام خوشگوار بن جاتی کیونکہ وہاں

مشہور گلوکار پرویز مہدی سابقہ ممبر اسمبلی اور شاعر اسلم گورداسپوری، ادیب سلیم شہزاد، افسانہ نگار خالد محمود بھٹی جس نے بعد ازاں اپنا ادبی نام تبدیل کر کے ''نین سُکھ'' رکھ لیا ہے، جمیل احمد پال اور رانا شکور وغیرہ آجاتے۔ شفقت علی خان، حامد علی بیلا کا بیٹا اور پرویز مہدی اپنی گائیکی سے سب کو محظوظ کرتے۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد خالد حسین، پرنسپل اوتار سنگھ سدھو اور بیبا بلونت لاہور میں رُک گئے تاکہ لاہور میں عید کی رونقیں دیکھ سکیں۔ لاہور میں خالد حسین کی خوش دامن صاحبہ کی پھوپھی زاد بہن خالہ رضیہ، گلبرگ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی تھیں۔ خالد حسین اور اُس کے دوستوں نے عید کا تہوار اُن کے ساتھ منایا۔ اور یوں یہ یادگاری سفر مکمل ہوا۔

اپنے ادبی سفر کے آغاز میں ریاستی کلچرل اکادمی نے خالد حسین کو پنجاب اور دہلی میں مقیم پنجابی ادبی شخصیتوں سے مُلاقات کرنے اور ملاقاتوں کے بعد اپنے تاثرات اور تجربات تحریری طور پر اکادمی کو پیش کرنے کیلئے کہا۔ جس کے لئے سارا خرچہ اکادمی نے ہی برداشت کیا تھا۔ خالد حسین کے اس سفر کا پہلا پڑاؤ ''پریت نگر'' امرتسر تھا۔ وہاں سے کہانی کار مختار گل کو ساتھ لے کر وہ ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گل اور گُل چوہان (دونوں پنجابی افسانہ نگار) کے پاس امرتسر آیا، اور پھر ان تینوں کو لے کر وہ پٹیالہ کے ایک گاؤں پہونچا جہاں چند پنجابی کہانیوں کا خالق موہر جیت رہتا تھا۔ چاروں نے رات اُس کے ہاں گذاری اور پھر صبح پانچ پیاروں کا یہ ٹولہ دہلی کے لئے روانہ ہوگیا تاکہ محترمہ امرتا پریتم، بی بی اجیت کور اور کرتار سنگھ دُگل وغیرہ کو ملا جاسکے۔ فیصلہ یہ ہوا اپنی اپنی جمع پُونجی کرنیل سنگھ شیر گل کے حوالے کردی جائے۔ خرچے کا حساب کتاب وہی رکھے گا۔ خالد حسین کو چھوڑ کر باقی سب یار بیلی خونخوار شرابی تھے اور انہوں نے چند دِنوں میں ہی ساری جمع رقم شراب کی نذر کردی۔ کرنیل سنگھ نے کہا کہ اُسکے پاس صرف چار سو روپے بچے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عیاشی کو خیرباد کر کے رات گورودوارہ رکاب

گنج میں گذاری جائے جو اُن دِنوں نیا نیا بنا تھا۔ موہُر جیت کو سگریٹ پینے کی لت تھی۔ اُسے سمجھایا گیا کہ وہ گورودوارے میں ایسی کوئی حرکت نہ کرے کہ سب کو خمیازہ بھگتنا پڑے۔ گورودوارے کے سیواداروں نے بڑا لذیذ لنگر پروسا۔ سونے کیلئے نئے بستر دیئے۔ اور خالد حسین سے مودبانہ گذارش کی کہ وہ مریادہ قائم رکھتے ہوئے دُھومر پان (سگریٹ نوشی) کا پریوگ نہ کرے۔ خالد کی یقین دہانی پر دونوں سیوادار چلے گئے۔ رات کے بارہ بجے مُوہر جیت اُٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ خالد حسین نے اُسے سختی سے منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ گورودوارے سے باہر نکلا جائے، اور کسی گھٹیا سے ہوٹل میں رات گذاری جائے۔ وہاں سے یہ پانچ پیارے پیدل چلتے ہوئے پہاڑ گنج کے ایک بیکار سے ہوٹل پہونچے اور رات گذاری۔ موہُر جیت حرامی کی بدولت ساری رات عذاب میں گُذری۔ صبح ناشتہ کیا اور باقی کی رقم بِل چُکانے میں ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گِل کا بڑا بھائی انڈین نیوی کے مرکزی دفتر میں افسر تھا۔ کرنیل نے اُس سے پیسے مانگے اور خالد حسین سمیت سب کو ریل اور بس کا کرایہ دیا۔ ساتھ میں سو سو روپیہ راستے کے خرچے کے لئے دیا تا کہ سبھی خیر و عافیت اپنے اپنے گھر پہونچیں۔ خالد حسین اس سفر میں کسی کو نہ مِل سکا۔ اُس نے دوبارہ پنجاب اور دہلی کا سفر کیا تا کہ ادیبوں اور دانشوروں سے مِل کر رپورٹ اکادمی کے دفتر میں جمع کرا سکے۔

اپنی ادبی آوارہ گردی کا ایک اور قصہ خالد حسین نے مجھے سُنایا تھا وہ یوں تھا کہ ایک بار ادبی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے خالد حسین لُدھیانہ گیا۔ اُس کے ساتھ مختار گل بھی تھا۔ رات گذارنے کیلئے مشہور شاعر سُرجیت پاتر کا انتخاب ہوا جو اُس وقت کرایے کے مکان میں اندرونِ شہر رہتا تھا۔ اور آرٹسٹ عجائب چتر کار کا ہمسایہ تھا۔ سُرجیت پاتر نے پُرتپاک استقبال کیا۔ وہاں پاتر کا ایک اور دوست بھی ٹھہرا تھا۔ چنانچہ خالد حسین کی

آمد کو سلیبریٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈاکٹر سُرجیت پاتر نے اپنے نوکر نیپالی گورکھے سے دوسو روپے مانگے تو اُس نے کہا کہ ''شالا سارا پیسہ تو صاحب آپ نے مجھ سے لے لیا۔ اب ہمارے پاش کُچھ نہیں ہے''۔ اب سُرجیت پاتر اور اُسکے دوست نے چوڑا بازار جانے کیلئے خالد اور مختار کو ساتھ لیا۔ سبھی رکشا میں چوڑا بازار پہونچے۔ خالد حسین اور مختار گل کو کتابوں کی ایک دُکان پر کھڑا کر کے وہ دونوں بازار کے چکر لگانے لگے۔ کچھ دیر کے بعد دونوں واپس آئے۔ وہ بہت خوش تھے۔ اُن کے ہاتھ میں شراب کی ''سونفی'' مارکہ دو بوتلیں اور تلی ہوئی دو کلو مچھلی اور تندُوری نان تھے۔

رکشے سے ہی سبھی واپس سُرجیت پاتر کے ہاں پہونچے۔ خالد حسین کے پوچھنے پر کہ یہ سودا سلف کیسے خریدا؟ پیسے کہاں سے آئے تو وہ کہنے لگے کہ ایک حسینہ سے اُدھار لئے۔ بہانہ یہ بنایا کہ وہ امرتسر میڈیکل کالج میں تیسرے سال کے طالب علم ہیں اور لُدھیانے اپنے بڑے بھائی سے ملنے آئے تھے لیکن وہ گاؤں جا چکا ہے۔ اب اُن کے پاس واپس جانے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ اُنھیں دوسو روپے اُدھار دے دیں۔ امرتسر سے منی آرڈر کے ذریعہ رقم لوٹا دی جائے گی۔ یوں خالد حسین کو سیلی بریٹ کیا گیا۔ اس قسم کی ادبی آوارہ گردی کے کئی قِصّے خالد حسین سے منسوب ہیں، جن کو وہ مزے لے لے کر سُنایا کرتا تھا۔ ان قِصوں سے پتہ چلتا تھا کہ پنجابی ادبی دوستوں کے ساتھ اُس کے رشتے کتنے گہرے تھے جو اُسکی وفات تک قائم رہے۔

جالندھر کی پوسٹنگ کے دوران خالد حسین کا دفتر اور رہائش شاستری چوک میں تھی، جہاں ہند سماچار گروپ کا دفتر، ملاپ، پرتاپ، اجیت، نواں زمانہ اور کئی دیگر اخباروں کے دفاتر ساتھ ساتھ تھے۔ پنجابی اور اُردو کے ادیب اور صحافی تقریباً روزانہ خالد حسین کے پاس آتے۔ سیاست کے علاوہ ادب پر بھی بات چیت ہوتی۔ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کی

طرف سے اطلاعتی مرکز جالندھر کو مبلغ چالیس ہزار روپے بریفنگ گرانٹ کے طور پر ملے تھے تاکہ پی، آر، او اخباروں کے مدیروں اور دیگر صحافیوں کی اس گرانٹ سے آؤ بھگت کر سکے اور وہ جموں و کشمیر کے حالات اور ریاستی حکومت کے بارے میں مثبت (Positive) لکھیں۔ بلاناغہ آنے والوں میں جالندھر ریڈیو کا ڈپٹی ڈائریکٹر اور پنجابی کا منفرد شاعر سوہن سنگھ مشیا بھی تھا جو سیر کرنے کے بہانے ہر صبح خالد حسین کے گھر آتا اور سگریٹ نوشی کرتا۔ چائے کا کپ پیتا اور واپس چلا جاتا۔ سنت سنگھ سیکھوں، سادھو سنگھ ہمدرد، ڈاکٹر عطر سنگھ، کلدیپ سنگھ بیدی، پریم پرکاش کھنوی، کرتار سنگھ دُگل، ڈاکٹر کیرتی کیسر، ڈاکٹر سروج رانی اور کئی دیگر ادیب اور دانشور آتے۔ چائے کے کئی دور چلتے اور شام کو دارُو اور مچھلی سے محفلیں سجتیں۔ جس کی وجہ سے صحافتی حلقوں میں خالد کی قدرومنزلت میں اضافہ ہوا تھا۔ خالد حسین کے مضامین اور ریاست سے متعلق مُثبت خبریں چھپتی رہتیں۔ اپنی محنت، صدِق اور خلُوص کی وجہ سے خالد حسین نے ادبی حلقوں میں بھی اپنی ایک پہچان بنالی تھی۔ وہ زمین سے جُڑا ہوا انسان تھا اور اکثر بابا فریدؔ اور بُلھے شاہ کے اشعار سُناتا جن کو وہ اپنی رُوح کی خوراک کہتا ہے۔

جے تُوں عقل لطیف کالے لِکھ نہ لیکھ
اپنے گریبان میں سرنیواں کر دیکھ
(بابا فریدؔ)

ترجمہ: اگر تُو عقل مند ہے کالے لِکھ نہ لیکھ
اپنے گریبان میں سر جھکا کر دیکھ

اللہ سائیں خالد حسین کی بخشش فرمائے۔

شناسائیاں

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(لالہ موجی رام موج)

جب جالندھر میں خالد حسین کی پوسٹنگ ہوئی تو وہاں پہنچنے کے بعد وہ سب سے پہلے روزنامہ ''نواں زمانہ'' کے دفتر میں گیا، جہاں اس کے ادیب اور صحافی دوست گپ شپ کررہے تھے۔ خالد حسین اُن میں شامل ہوا اور اپنی پوسٹنگ سے متعلق ساری داستان اُن کو سُنائی، چنانچہ اُس نے جالندھر میں اپنی پہلی رات پنجابی ادیب کرشن کمار رتُو کے گھر گذاری جہاں اُس کی بیوی ''سوشیل بھابی'' نے خالد حسین کی خوب آوٴ بھگت کی (کرشن کمار رتُو دُوردرشن جالندھر میں اُن دِنوں پروڈیوسر تھا بعد ازاں وہ دُوردرشن چنڈی گڑھ کا ڈائریکٹر بنا اور اُسی عہدہ سے ریٹائر ہوا) خالد حسین کے آنے کے بعد دوستوں کی محفلیں اور ادبی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ اُن میں میری بھی شرکت ہوتی۔ میرا نام کلدیپ سنگھ بیدی ہے۔ میں پنجابی کا ناول نویس ہوں اور ''ہند سماچار'' گروپ کی طرف سے چھپنے والے پنجابی روزنامہ ''جگ بانی'' کا میگزین ایڈیٹر رہا ہوں۔ ایک دِن میں خالد حسین کو لے کر ڈاکٹر سروج رانی کے گھر گیا تاکہ اُس کے خاوند پرشوتم پاٹھے کی اچانک موت پر تعزیت کی جائے۔ خالد حسین ڈاکٹر سروج رانی کو نہیں جانتا تھا لیکن سروج خالد کو اچھی طرح سے جانتی تھی کیونکہ اُس نے خالد حسین کی کئی کہانیاں پڑھی تھیں۔ ڈاکٹر سروج رانی

سرکاری کالج ہوشیار پور میں فائن آرٹ کی لیکچرار تھی اور وہ اپنے پتی کی موت کی وجہ سے بہت دُکھی تھی۔ اُس کا خاوند انڈین ائرفورس کا پائلٹ تھا اور 1971ء کی ہند پاک جنگ میں ڈھاکہ کے قریب ایک ڈاگ فائٹ میں زخمی ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے اُسے ائرفورس سے ریٹائر کردیا گیا تھا لیکن آئیندہ آسودہ زندگی گذارنے کے لئے اُسے کھیلوں کا سامان بنانے کی فیکٹری لگانے کے لئے پنجاب سرکار نے لائسنس دیا تھا اور وہ ہاکی کا سامان تیار کرتا تھا۔ مشہور عالمی ہاکی کھلاڑی اور ہندوستان کی ہاکی ٹیم کے سابقہ کپتان سُرجیت سنگھ کی مالی مدد کرنے کے لئے ہندوستان اور پاکستان کی ہاکی ٹیموں کا ایک نمائشی میچ ہونے والا تھا جس کے سلسلہ میں ضروری انتظامات کرنے کے لئے وہ جالندھر سے چندی گڑھ سُرجیت سنگھ کے ہمراہ جارہا تھا کہ اُن کی جیپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ دونوں موت کے مونہہ میں چلے گئے تھے۔ اس حادثہ کی وجہ سے ڈاکٹر سروج اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ وہ اپنے سسرالیوں کی طرف سے بھی ذہنی اذیت کا شکار تھی، کیونکہ پرشوتم کی موت پر سرکار کی طرف سے جو بھاری رقم اُس کی بیوی ڈاکٹر سروج کو ملی تھی، اُس پر پرشوتم پاٹھے کے والدین اور بھائی اپنا حق جتا رہے تھے۔ وہ اُسے دھمکیاں بھی دے رہے تھے۔ خالد حسین اور میں نے مل کر سروج کا یہ مسئلہ حل کروا دیا۔ جس کے لئے ڈاکٹر سروج ہماری شکر گذار تھی۔ اِس طرح خالد حسین اور میں سروج کے گھر آنے جانے لگے۔ کئی بار وہ کالج سے آتی بار خالد حسین کے دفتر یا گھر بھی آجاتی وہ بھی ادبی پروگراموں میں حصہ لیتی۔ ڈاکٹر سروج کے والدین میرے اور خالد حسین سے خوش تھے کہ ہماری وجہ سے وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ پرشوتم کی موت کے بعد ڈاکٹر سروج کے ساتھ شاردا رانا نام کی ایک لڑکی بھی رہنے لگی تھی۔ جس نے دُکھ کی گھڑی میں اُس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ شاردا ایک محنتی اور دلیر لڑکی تھی۔ وہ ہماچل کی رہنے والی تھی اور ''ہندی ملاپ' اخبار میں بطور سب

ایڈیٹر کام کر رہی تھی اور ساتھ ہی ایم، اے ہندی کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ خالد حسین جب بھی کوئی نئی کہانی لکھتا تو ہم سب کو سناتا اُس پر بحث ہوتی، خالد سب کے وچار سُنتا۔ اگر اُسے ہم میں سے کسی کی رائے پسند آتی تو وہ کہانی میں ردّ و بدل کرتا۔ ''کوار گندل''، ''کھوکھلا سورج''، ''اشتہاروں والی حویلی'' اور ''گہرے پانیوں کا دکھ'' اُس دور کی کہانیاں ہیں جن کو خالد حسین نے اپنی پنجابی کتاب ''ڈونگھے پانیاں دا دُکھ'' میں شامل کیا تھا۔ خالد حسین اکثر کہتا کہ جالندھر میں پوسٹنگ کے دِن اُس کی زندگی کے انتہائی خوبصورت دِن تھے۔ اُس کے ذہن و دِل کا موسم خوشگوار رہتا، اور اُسے لکھنے کی تحریک ملتی۔ خالد حسین کا دوست سوہن سنگھ میشاؔ جو آل انڈیا ریڈیو جالندھر کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا وہ ہر صبح سیر کے بہانے خالد حسین کے گھر آتا اور سگریٹ نوشی کرتا۔ وہ سگریٹ کی ڈبیاں خرید کر اُس کے گھر میں رکھتا۔ سگریٹ پینے کے بعد چائے کا کپ پیتا اور واپس گھر چلا جاتا۔ اُس کی بیوی کڑ سکھ تھی اور میشاؔ بیوی سے چوری یہ حرکت کرتا تھا۔ ''بلیو سٹار آپریشن کے وقت خالد حسین جالندھر میں ہی مقیم تھا۔ تیرہ دِن کے بعد جب دو تین گھنٹوں کے لئے کرفیو میں ڈھیل دی گئی تو پہلا شخص جو خالد حسین کے گھر آیا۔ وہ سوہن سنگھ میشاؔ تھا۔ جس نے آتے ہی سگریٹ طلب کیا۔ یکے بعد دیگرے اُس نے دو سگریٹ پیئے اور پھر چائے کا کپ۔ گھر میں قدم رکھتے ہی جب خالد حسین نے حال چال پوچھا تو کہنے لگا دستار گری پڑی ہے اور عزّت لٹ چکی ہے اور پھر کہنے لگا کہ چلو بازار کا ایک چکر لگاتے ہیں۔ ہُو کا عالم ہے اور میں انسانوں کو دیکھنے کے لئے ترس گیا ہوں۔ میشاؔ کے پاس فیئٹ کار تھی وہ دونوں چوڑیوں والے بازار کی طرف چل پڑے۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ لوگ پیدل رکشا، سکوٹر اور کاروں میں خریداری کے لئے جا رہے تھے۔ کرفیو کی مدت ختم ہونے جا رہی تھی لہٰذا ہر شخص جلد سے جلد خریداری کر کے گھر لوٹنا چاہتا تھا۔ میشاؔ ہارن بجاتا ہوا

آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ ایک رکشا پُلر کی سائیکل راڈ میشا کی کار سے ٹکرائی اور کار کی باڈی کو معمولی نقصان ہوا۔ ایس ایس میشا نے کار روکی۔ نیچے اُترا اور رکشا پُلر کو تھپڑ رسید کر دیا۔ رکشا پر ایک شرابی مہاجن بیٹھا تھا۔ اُس نے بڑے رعب سے میشا کو روکا اور کہا:

"یہ میرا رکشا چالک ہے۔ اس کو مارنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ یہ لو بیس روپے اور کار کو پینٹ کرا لینا مہاجن نے واسکٹ کی جیب میں سے بیس روپئے کا نوٹ نکالا اور میشا کو دینے لگا۔ نوٹ دیکھ کر میشا آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا۔

"اوے! تم مجھے پیسے دِکھا رہے ہو" لالہ جی نے دوبارہ واسکٹ میں ہاتھ ڈالا اور سو روپئے کا نوٹ نکالا اور کہنے لگا،

"بیس روپئے کم ہیں تو یہ لو سو روپئے۔ اگر یہ بھی کم ہیں تو میں دو سو روپئے دینے کو تیار ہوں۔"

مہاجن کی بات سُن کر میشا آگ بگولا ہو گیا اور چلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اوے حرام زادے! مجھے پیسے دِکھا رہے ہو؟ تم ہمیں پیسوں سے خریدنا چاہتے ہو؟ جاؤ اُس کتی براہمنی (اندرا گاندھی) سے کہہ دو کہ سکھ اِبھی مرے نہیں۔ سِکھ بکنے والی قوم نہیں اور نہ ہی سِکھ قوم بے غیرت ہے۔" خالد حسین نے میشا کو پکڑا اور کار میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگا تو میشا خالد سے بھی اُلجھ پڑا اور کہنے لگا۔

"دُور ہٹ مُسلیا! تم لوگوں نے بھی ہم پر کوئی کم ظلم نہیں کئے ہیں" بڑی مشکل سے خالد حسین نے سوہن سنگھ میشا کو کار میں بٹھایا اور اُس نے کار اسٹارٹ کی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ گھر پہنچتے ہی خالد حسین نے نوکر سے چائے پلانے کے لئے کہا۔ اُس نے سگریٹ کی ڈبیا میشا کے حوالے کی۔ سگریٹ کے چند کش لینے کے بعد اُس کی حالت سُدھری۔ جب طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا تو وہ خالد حسین سے کہنے لگا۔

''مجھے معاف کردو یار۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ یار خالد! میں کبھی گوردوارے نہیں گیا۔ سکھوں پر بنائے گئے لطیفے میں خود مزے لے لے کر سناتا ہوں۔ دھرم کے ساتھ میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے، پھر مجھے کیا ہو گیا تھا۔ شاید جو سنسکار ہمیں اپنے ماں باپ سے ملتے ہیں، اور جس ماحول میں ہمارا بچپن گذرتا ہے، وہ سنسکار ہمارے اندر مرتے دم تک زندہ رہتے ہیں، چاہے ہم کتنا بھی اپنے آپ کو ترقی پسند اور آزاد خیال کہتے رہیں۔''

شاردا رانا کا خیال خالد حسین اپنی چھوٹی بہن کی طرح رکھتا تھا۔ وہ با کردار اور سیلف میڈ لڑکی تھی۔ جب ڈاکٹر سروج رانی کی تبدیلی گورنمنٹ کالج پٹیالہ میں ہوئی تو شاردا نے ''ملاپ'' کی نوکری چھوڑ دی اور سروج کے ساتھ پٹیالہ آ گئی۔ سروج نے انتظامیہ اور صحافتی حلقوں میں اپنے دوستوں کی بدولت شاردا کو ''دینک ٹربیون'' چندی گڑھ میں سب ایڈیٹر کی نوکری دِلوا دی۔ شاردا چیف سب ایڈیٹر بن کر اب ریٹائر ہو چکی ہے۔ اُس نے شادی نہیں کی لیکن گاؤں سے اپنے بہن بھائیوں کو بُلا کر اپنے فلیٹ میں رکھا۔ اُنھیں اعلیٰ تعلیم دِلوائی۔ اُن کو برسرِ روزگار بنایا۔ اُن کے بچوں یعنی اپنے بھتیجے، بھتیجیوں اور بھانجے، بھانجیوں تک کو پڑھایا آج وہ چندی گڑھ میں خوشحال زندگی گذار رہی ہے۔

ڈاکٹر سروج رانی گورنمنٹ کالج پٹیالہ سے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں آ گئی۔ اُس نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کے ہندی پروفیسر ڈاکٹر چمن لال سے شادی کر لی۔ اُن کی ایک لے پالک بیٹی ہے۔ وہ یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ بنی اور بالآخر ریٹائر ہو کر یونیورسٹی سے ملحقہ کالونی میں رہ رہی ہے۔ ڈاکٹر چمن لال کمیونسٹ نظریات کے حامی ہیں۔ وہ پہلے مشہور افسانہ نگار اجیت کور کے داماد تھے۔ اُن کی شادی اجیت کور کی بیٹی ارپنا سے ہوئی تھی جس نے چمن لال سے طلاق لے لی تھی۔ ڈاکٹر سروج ایک عمدہ ادیب اور تنقید نگار ہے۔ اُس کے مضامین انگریزی، ہندی اور پنجابی میں اکثر چھپتے رہتے

ہیں۔ خالد حسین کے افسانوں اور فن کے حوالے سے اُس نے دو تین مضمون لکھے ہیں۔
خالد حسین جب بھی پٹیالہ جاتا تو ڈاکٹر سروج کے ہاں ضرور جاتا۔ رشتوں کی یہ گرم جوشی خالد حسین کا قیمتی سرمایہ تھا۔ اُن دِنوں کچھ ادیب دوستوں نے مل کر ''افسانہ محفل'' یا ''کہانی گوشٹی'' کا ہفتہ وار پروگرام بنایا تھا۔ جس کا عنوان رکھا گیا ''چراغ جلے ساری رات۔'' یہ محفل ہر ہفتے کسی افسانہ نگار کے گھر پر ہوتی۔ جہاں شراب پینے یا پلانے کی سخت مناہی ہوتی۔ رات کا کھانا کھا کر یہ محفل شروع ہوتی۔ جس میں دو افسانے پڑھے جاتے اور اُن پر مفصّل بحث ہوتی۔ خوبیوں اور خاص کر خامیوں کی نشاندہی کی جاتی۔ دو تین بجے تک یہ محفل سرگرم رہتی پھر سبھی سو جاتے اور صبح اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ ایسی محفلوں کا بہت فائدہ ہوتا۔ کہانی کے پلاٹ، اُس کی بُنت، کرافٹ، لفاظی اور فنی لوازمات کے بارے میں مشہور کہانی کار اپنے تجربے سانجھے کرتے۔ الگ الگ زبانوں میں لکھنے والے مشہور افسانہ نگاروں کی تحریروں کے حوالے دیئے جاتے۔ جب تک خالد حسین جالندھر میں رہا، وہ اِن محافل میں حصہ لیتا رہا۔

میرا اور خالد حسین کا دوست کرشن کمار رتُو رومانی سے زیادہ حرامی طبیعت کا مالک تھا۔ ہماری بھابی سوشیل اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کرشن کمار رتُو کی وفادار اور سلیقہ شعار بیوی تھی لیکن کم بخت رتُو دُور درشن میں کام کرنے والی ایک آہو چشم کو دِل دے بیٹھا۔ اور اُس سے خفیہ شادی کر لی۔ جب معاملہ گھر تک پہنچا تو سوشیل بھابی نے صاف کہہ دیا کہ دونوں میں سے ایک۔ یا اُسے چھوڑ دو یا سوشیل کو۔ کرشن کمار رتُو نے سوشیل بھابی کو چھوڑ دیا اور خود دوسری بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ پھر دونوں نے اپنا تبادلہ جے پور کروالیا۔ جہاں کی وہ دوسری بیوی رہنے والی تھی۔ ہمیں اس بات کا بہت دُکھ تھا اور ہمیں بہن سوشیل کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ پھر خالد حسین واپس جموں و کشمیر چلا گیا۔ لیکن تقریباً بیس سال کے بعد

سوشیل اور خالد حسین دوبارہ جالندھر کے قریب نکودر سڑک پر موضع لانبڑا کی ایک پنجابی ادبی تنظیم ستّھ کے انعامی فنکشن میں ملے جہاں خالد حسین کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا تھا اور ''گورونانک چیریٹیبل ٹرسٹ مشن کے سربراہ اور عوامی خدمتگار بابا بُدھ سنگھ'' ڈاہاں کلیراں'' کی بھی عزت افزائی کی گئی تھی۔ سوشیل بہن دنیاوی دھندوں کو چھوڑ کر اس مشن کے ساتھ جڑی تھی اور اُس نے اپنی زندگی فلاحی کاموں کے لئے وقف کردی تھی جو وہ آج بھی کر رہی ہے۔ بابا بُدھ سنگھ کے اکال چلانا کرنے کے باوجود اُن کا مشن عوامی خدمت کر رہا ہے اور آج کل اُس کی روحِ رواں سوشیل بہن ہی ہے اور اُس کا پالک بیٹا ر گھبیر سنگھ اور بہو سب مل کر ایک رفاہی ہسپتال چلا رہے ہیں۔

یہ شاید 1978ء کی بات ہے جب خالد حسین دوردرشن جالندھر کے ایک پروگرام کے لئے جالندھر آیا تھا۔ اُس نے رات ''اجیت بھون'' میں گذاری تھی اور باتوں باتوں میں ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدردؔ نے خالد حسین سے کہا کہ جالندھر کے قریب ایک گاؤں سدھواں ڈونا ہے۔ وہاں کا ایک مسلم لڑکا شادی کے لئے لڑکی تلاش کر رہا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں خالد اُس لڑکے کی مدد کر سکے تو وہ احسان مند ہوگا۔ اُنہوں نے خالد کو بتایا کہ لڑکا بے عیب ہے اور محکمہ تعلیم میں ٹیچر ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ گاؤں میں اُس کی دس ایکڑ زمین ہے اور اپنی کوٹھی ہے۔ اُس لڑکے کی گارنٹی وہ لیں گے۔ اُس کے سبھی رشتہ دار 1947ء کی شورش میں یا تو قتل کر دیئے گئے تھے یا وہ بھاگ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ لڑکے کا نام کنور جیت خان ہے۔ اُس کی دو بہنیں ہیں اور دونوں بیاہی گئی ہیں۔ گاؤں میں یہ واحد مسلم فیملی ہے۔ کیونکہ 1947ء میں گاؤں والوں نے انہیں جانے نہیں دیا تھا بلکہ ان کی حفاظت گاؤں کی مشترکہ ذمے داری تھی۔ وجہ یہ تھی کہ کنور جیت خان کی ماں گاؤں کی واحد دائی تھی۔ اگر یہ لوگ بھی پاکستان چلے جاتے تو گاؤں والوں

کے لئے بہت مشکل پیدا ہو جاتی۔ خالد حسین نے جموں میں اپنی ایک رشتہ دار بہن سے
بات کی جس کی سات بیٹیاں تھیں اور اچھے رشتے نہ ملنے کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتی
تھی۔ وہ اور اُس کا خاوند مسعود بیگ لڑکا دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ خالد حسین اُن کو لے
کر سِدھواں ڈونا'' پہنچا اور کنور جیت کے گھر کا پتہ پوچھنے لگا لیکن کسی کو معلوم نہ تھا۔ جب
خالد حسین نے کہا کہ کیا اس گاؤں میں کوئی مسلمان گھر ہے تو سبھی کہنے لگے کہ ہاں ہماری
بے بے کا گھر ہے۔ پھر خالد نے کہا کہ اُن کو وہاں لے چلو۔ سب نے اُن کا سامان اُٹھایا
اور کنور جیت کے گھر کے باہر آوازیں لگانے لگے۔

''بے بے! آپ کے مہمان آئے ہیں'' پھر اُنہوں نے خود ہی دروازہ کھولا۔
دروازے کے اوپر گورمکھی میں یا اللہ۔ یا رسول لکھا تھا۔ خالد حسین کو یہ پڑھ کر یقین ہو گیا
کہ وہ لوگ صحیح ٹھکانے پر پہنچے ہیں۔ جب وہ لوگ اندر گئے تو ایک بوڑھی عورت نماز پڑھ
رہی تھی۔ وہ سب بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ گاؤں کا ایک لڑکا پانی کے گلاس لے کر آیا۔ اُنہوں
نے پانی پیا۔ اتنے میں وہ عورت نماز سے فارغ ہو کر اُن کے پاس آ گئی، کچھ دیر بعد کنور
جیت بھی گھر کے اندر داخل ہوا۔ کنور جیت کے والد کا نام رحمت خان تھا۔ رات کے کھانے
پر مفصل بات چیت ہوئی اور دونوں گھرانوں نے رشتہ قبول کیا۔ جب خالد حسین نے کنور
جیت کو بتایا کہ تمہارے نام سے اُسے کوئی نہیں جانتا جبکہ اُس کی پہچان تو مسلمان کے طور پر
ہے تو پھر اپنا اسلامی نام کیوں نہیں رکھا۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ نام میری ماں نے رکھا
ہے۔ آپ میرا اسلامی نام رکھ دیں۔ میں یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم میں درستی کروا لوں گا۔ خالد
حسین نے اُس کا نام کنور امتیاز رکھا اور پھر وہ کنور امتیاز خان کے نام سے ہی سرکاری اور ادبی
حلقوں میں مشہور ہوا۔ کنور امتیاز پنجابی کا شاعر تھا اور آرٹسٹ بھی۔ وہ اپنی میگزین بھی
نکالتا تھا۔ خیر اُس کی شادی آپا سکینہ اور بھائی مسعود بیگ کی تیسری بیٹی فریدہ سے ہوئی۔ یہ

شادی انتہائی کامیاب رہی، کنور امتیاز اور فریدہ کی دو اولادیں ہیں۔ ڈاکٹر صنوبر اور شاہباز خان۔ صنوبر نے جموں یونیورسٹی سے پنجابی میں پی ایچ ڈی کی۔ اُس کی شادی جموں میں اپنے خالہ زاد سے ہوئی۔ اُس کے خاوند کا نام راجہ اعجاز چِب ہے اور وہ ریاستی محکمہ پولیس میں انسپکٹر ہے۔ یعنی ایک لڑکی پنجاب میں بیاہی گئی اور دوسری پنجاب سے جموں میں بیاہی گئی۔ شاہباز نے ایم سی اے کیا ہے اور وہ بھی برسرِ روزگار ہے۔ اُس کی شادی مالیرکوٹلہ میں ہوئی ہے۔ صنوبر پنجابی زبان کی کالج لیکچرار ہے۔ اُس کے بھی دو بیٹے ہیں جبکہ شاہباز اور اُس کی بیوی بھی محکمہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہیں اور اُن کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ آج کنور امتیاز وفات پا چکا ہے لیکن اُس کی اولاد آباد ہے، اور یہ سکھی پریوار خالد حسین کیلئے دعائے مغفرت مانگتا رہتا ہے۔

مالیرکوٹلہ خالد حسین کے لئے اُس کا دوسرا گھر تھا۔ 1970ء کے دھاکے میں اُس کی ملاقات سب سے پہلے اُردو اور پنجابی کے کُہنہ مشق شاعر اور عروض کے ماہر خالد کفایت سے ہوئی۔ اُس کے والد کفایت اللہ صاحب ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اقبالیات کے ماہر۔ اُن کی لائبیری میں نایاب کتابیں تھیں جن سے اُردو سکالر فیضیاب ہوتے تھے۔ اُن کے تین بیٹوں میں دو یعنی خالد کفایت اور ڈاکٹر طارق کفایت درس و تدریس سے وابستہ تھے جبکہ تیسرا عامر اپنا کاروبار کرتا تھا۔ ڈاکٹر طارق کفایت پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر تھا جبکہ خالد کفایت ہائی سکول میں پڑھاتا تھا۔ خالد کفایت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی اور اردو ادب میں ماسٹرز کیا تھا اور علی گڑھ کے ہوسٹل میں اُس کا روم میٹ مشہور فلم ایکٹر نصیر الدین شاہ تھا۔ یہ شاید 1974ء کی بات ہے جب خالد حسین امرتسر سے شائع ہونے والے پنجابی جریدے ''ساہتکار'' میں ہر پچھلے شمارہ کا تنقیدی جائزہ لینے کے لئے ''پرکھ پڑچول'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا کرتا تھا۔ خالد حسین نے ایک شمارے

میں خالد کفایت کی پنجابی غزل پڑھی۔ غزل سادہ اور پُر معنی تھی۔ وزن اور بحر یعنی چھندا بندی کے معیار پر پوری اُترتی تھی۔ ہر شعر خوبصورت تھا۔ خالد حسین نے اپنے کالم میں ایڈیٹر گورچرن سنگھ بھوئی سے پوچھ لیا کہ یہ خالد کفیات کیا چیز ہے۔ خالد حسین کا کالم پڑھنے کے بعد خالد کفایت نے لفظوں کا ایک لذیذ پکوان بذریعہ چٹھی خالد حسین کو بھیجا اور بتایا کہ وہ کوئی چیز نہیں بلکہ ''ناچیز'' ہے۔ دونوں دوستی کرنے اور نبھانے کے گُر جانتے تھے، لہٰذا خط وکتابت دوستی میں بدل گئی۔ اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ خالد حسین کے لئے خالد کفایت نے مالیر کوٹلہ میں کئی محفلیں منعقد کیں جن میں خالد حسین آدھی رات تک اپنی کہانیاں سُنایا کرتا۔ جن دِنوں خالد حسین جالندھر میں اپنے سرکاری فرائض انجام دے رہا تھا۔ اُنہی دِنوں خالد کفایت اپنے ایک دوست کو ملانے کے لئے خالد حسین کے دفتر میں آیا۔ اُس شخص کا نام سید بشیر شاہ تھا خالد حسین نے اُس کے بھتیجے کی شادی جموں کے مشہور ٹیلر ماسٹر الیف، ای پال کی پوتی اور اسلم پال کی بیٹی یاسمین سے کرادی۔ اس کامیاب شادی سے دِلشاد اور یاسمین کے تین بچے ہیں۔ دولڑکے اور ایک لڑکی۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اور یاسمین اور دِلشاد دادی، دادا اور نانا نانی بن چکے ہیں۔ اسلم پال کی ایک اور بیٹی نورین کی شادی بھی خالد حسین نے مالیر کوٹلے کے رضوان فاروقی سے کروائی جو پنجاب روڈویز میں ڈویژنل منیجر تھا اور جس کی حال ہی میں موت واقع ہوئی ہے۔ اُس کے بھی دو بیٹے ہیں۔ مشہور اردو شاعر محمد یاسین بیگ مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد امین بیگ مرحوم کی ایک بیٹی کی شادی بھی خالد حسین نے مالیر کوٹلہ کے جاوید قریشی سے کروائی جو چارٹیڈ اکاؤنٹینٹ ہے اور جس کا چھوٹا بھائی ممبئی فلم انڈسٹری کا ایک کامیاب شاعر، گیت کار اور سکرین پلے رائٹر ہے اور جس کا نام ارشاد کامل ہے اور جس کی کامیاب فلموں کی تعداد کافی ہے۔ ''راک سٹار'' اور ''سلطان'' نے ارشاد کامل کے گیتوں کی وجہ سے تمام ریکارڈ توڑے تھے۔ خالد حسین کی

بدولت دلشاد کے چھوٹے بھائی فیصل کی بیوی بھی جموں سے ہی ہے۔ اُس کی دو بیٹیاں ہیں، جبکہ خالد حسین نے اپنے بیٹے ذاکر حسین کے لئے سید بشیر شاہ کی بیٹی فرحت بانو کا انتخاب کیا تھا اور شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ فرحت بانو کے بطن سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، دو سال پہلے فرحت بانو کا کینسر کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔

خالد حسین نے اپنے کئی غیر مسلم دوستوں کے بچوں کے لئے بھی رشتے ڈھونڈ کر دیئے۔ شاید اس نیک سماجی خدمت کا صدقہ تھا کہ اُس کو اپنی بیٹیوں کے لئے بہت اچھے داماد ملے۔ ڈاکٹر سمعیہ تبسم کا خاوند محمد ایوب وانی انجینئر ہے اور ڈاکٹر ھما تبسم کا خاوند بھی ڈاکٹر ہے۔ دونوں کے دو دو بیٹے ہیں اور ماشاء اللہ جوان ہو چکے ہیں۔ بلکہ سمعیہ تبسم کا بیٹا گوہر ایوب بھی شادی شدہ ہے وہ بھی انجینئر ہے اور ماشا اللہ ایک بیٹے کا باپ ہے۔ اُس کے چھوٹے بھائی احمر ایوب نے بی، ٹیک اور ایم، بی، اے کیا ہے۔ شادی کرانے والے وچولے کو اکثر گالیوں کا گلفند کھانا پڑتا ہے لیکن اللہ نے خالد حسین کو عزت بخشی اور اُس کے کرائے ہوئے سبھی رشتے شاد اور آباد ہیں۔ اُس کی وفات پر یہ سب تعزیت کے لئے جموں آئے تھے۔ یہ ہمیشہ اُس کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف
دُنیا سمجھتی رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے
(ضامن جعفری)

کھیل تماشے-I

بڑھا کر ہاتھ ساری حد مِٹا دے، زمینوں کے کشادہ قد مِٹا دے
کبھی بچے کو نقشہ مت دکھانا، نہ جانے کونسی سرحد مِٹا دے
(لیاقت جعفری)

بھارت اور پاکستان کے رشتوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ لوہار کی سانسی کبھی آگ میں ہوتی ہے اور کبھی پانی میں۔ ایسے سیمابی رشتوں کی وجہ سے عوام ہمیشہ دُکھ، درد اور تکلیف کا شکار رہتے ہیں۔ خاص کر پنجاب اور جموں و کشمیر کے لوگ۔ بداعتمادی کے ان رشتوں کے زخموں کو ہمارے لوگوں نے 1947ء سے اپنے تن من پر سہا ہے۔ بھارت اور پاکستان کی منفی سیاست ہمارے ہاتھوں کا چھالا بن چکی ہے۔ نفرت اور ہندو مسلم دشمنی نے 1947ء میں لاکھوں لوگ مروائے۔ 1965ء میں اور 1971ء کی جنگوں میں دونوں ملکوں میں تباہی مچی۔ 1999ء کی کرگل جنگ میں سینکڑوں فوجی جوانوں نے جان گنوائی پھر بھی سیاست دانوں کی عقل ٹھکانے نہیں آئی۔ ان رشتوں میں اب جو معمولی سدھار آیا ہے وہ شاید کبھی نہ آتا اگر 9/11 کے بعد امریکہ افغانستان پر حملہ کر کے بری طرح نہ پھنسا ہوتا۔ طالبان نے امریکہ کی ناک میں دم کر دیا۔ جدید اسلحہ، ہوائی بمباری اور ہزاروں ٹن وزنی بم طالبان کی ہمت عزم اور جنگجوانا صلاحیت کو زیر نہیں کر سکے کیونکہ یہ وہی طالبان تھے جن کی جنگی تربیت امریکہ نے ہی کی تھی۔ اور اُن کے مذہبی جنون کا فائدہ روسی فوج کو افغانستان سے باہر نکالنے کے لئے کیا تھا۔ اُن کو جدید اسلحہ دیا تھا تا کہ وہ روس

جیسی سُپر پاور کے ساتھ لڑسکیں۔ یہ وہی امریکہ تھا جس نے القاعدہ کے چیف اسامہ بن لادن کی حوالگی کا بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا تھا اور طالبان کی حکومت ختم کر کے اپنی کٹھ پتلی حکومت بنائی تھی۔ یہ وہی امریکہ تھا جسے طالبان کے سربراہ مُلّا عمر نے کہا تھا کہ ''یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے کوئی جنگ جیتی نہیں ہے اور ہم نے کوئی جنگ ہاری نہیں ہے افغانستان میں کوئی بیرونی فوج اپنی مرضی سے داخل تو ہوسکتی ہے لیکن واپس اپنی مرضی سے باہر جانہیں سکتی اور ہماری روایت میں مہمان داری ہے، غداری نہیں۔ لہٰذا اسامہ بن لادن کو تمہارے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔ طالبان کی وجہ سے امریکہ کی اقتصادیات ڈانواں ڈول ہورہی تھی۔ طالبان پاکستان کے صوبوں بلوچستان اور خیبر پختون خواہ سے امریکہ اور ناٹو فوجیوں پر مسلسل حملے کرنے لگے۔ امریکہ اور ناٹو فوجیوں کا بہت جانی اور مالی نقصان ہونے لگا۔ امریکہ بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے فوجی ہوائی اڈے طالبان کے خلاف استعمال کرنے لگا۔ ڈرون حملے تقریباً روز کا معمول بن گئے لیکن یہ سب کاروائیاں طالبان کے عزم کو کمزور نہیں کرسکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سرزمین سے ہندوستانی انتظام والے جموں وکشمیر میں ملی ٹینٹ کاروائیاں بھی جاری رہیں۔ پاکستان کشمیر کے نوجوانوں کو اسلحہ چلانے کی تربیت اور پیسہ دے کر کشمیر میں متواتر بھیجتا رہا۔ کشمیر میں ظلم و بربیت کا ننگا ناچ دونوں طرف سے کھیلا جانے لگا۔ پاکستان 1971ء میں ہوئی شکست اور مشرقی پاکستان کا ایک آزاد ملک بنگلہ دیش کی صورت میں عالمِ وجود میں آنے کے لئے بھارت کو ذمے دار سمجھتا ہے اور بدلے کے طور پر سرد جنگ کے اہم ہتھیار گوریلا کاروائیوں کو سبق سکھانے کے لئے استعمال کرتا رہا ہے۔ اِن حالات میں دونوں ملکوں میں فوجی تناؤ بنا رہتا ہے۔ جبکہ امریکہ اس صورتِ حال کو بدلنا چاہتا تھا۔ امریکہ چاہتا تھا کہ پاکستان کے علاقوں سے طالبان اور القاعدہ افغانستان میں

اپنی کارروائیاں نہ کریں۔ اس لئے وہ اپنی فوجیں جموں وکشمیر کی متنازعہ سرحد سے
اُٹھا کر افغانستان کے بارڈر پر تعینات کرے تاکہ طالبان کے حملوں کو روکا جاسکے لیکن
پاکستان اس کے لئے تیار نہیں تھا جب تک کہ امریکہ اُسے یہ گارنٹی نہ دے کہ ہندوستان
جموں وکشمیر کی سرحد پر امن قائم رکھے گا اور مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے امریکہ ثالثی
کرے گا۔ طالبان کے خلاف جنگ جیتنے کے لئے امریکہ ہر حالت میں پاکستان کی مدد
چاہتا تھا۔ لہٰذا امریکی دباؤ کے تحت کرگل جنگ ختم ہوئی۔ پھر دونوں ملکوں کے درمیان
بات چیت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ پہلے بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخلوط سرکار کے وزیر اعظم
اٹل بہاری واجپائی اور پاکستان سے فوجی سربراہ جنرل مشرف کے بیچ، بعدازاں جنرل
مشرف اور وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے درمیان۔ اس بات چیت میں ٹریک ٹُو ڈپلومیسی
کا بھی اہم رول تھا اور امریکہ بھی درِ پردہ حالات بہتر بنانے کے لئے سرگرم تھا۔ نتیجہ یہ نکلا
کہ دونوں ملکوں کے لیڈران امن اور شانتی کی باتیں کرنے لگے۔ آگرہ کی تلخ یادوں کو دفن
کرتے ہوئے زیتون کی شاخیں لہرانے لگے۔ جبکہ آگرہ میں دونوں ملک ایک سمجھوتے پر
پہنچ چکے تھے اور دستخط کرنے کی تقریب کے لئے کرسیاں بھی سج چکی تھیں کہ سمجھوتے کی
کاپی کوئی چیل جھپٹا مار کر لے اُڑی اور مشرف صاحب غصے میں واپس اسلام آباد چلے گئے
لیکن اب کی بار ایسا نہیں ہو رہا تھا بلکہ اٹل بہاری واجپائی کا وہ جُملہ بار بار دُہرایا جا رہا تھا
جو اُنہوں نے اسلام آباد کے عشائیہ میں کہا تھا کہ دوست تو بدلے جاسکتے ہیں لیکن ہمسائے
نہیں۔ بات چیت چل نکلی تو پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ ریاست جموں وکشمیر کی متنازع سرحد
کے دونوں اطراف بس سروس چلائی جائے پاسپورٹ اور ویزے کی بجائے پرمٹ سسٹم
رائج کیا جائے۔ ایک سمجھوتہ ہوا جس کی رُو سے سری نگر مظفر آباد کے لئے بس سروس شروع
کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اُن لوگوں سے درخواستیں طلب کی گئیں جن کے رشتے دار سرحد کے

دونوں طرف رہتے ہوں۔ میرے والد خالد حسین کے ایک برخوردار اور اُردو شاعری کی معتبر آواز ڈاکٹر لیاقت جعفری نے پونچھ سے باغ اور راوٗلاکوٹ جانے کے لئے درخواست دی تھی اور پرمٹ فارم بھر کرسی، آئی، ڈی کے دفتر میں جمع کروادیا تھا۔ اُس کے سگے چچا اور پھوپھی شاید راوٗلاکوٹ اور باغ میں رہتے تھے جن کو ملنے کے لئے اُس نے پرمٹ فارم پُر کیا تھا۔ بس سروس چلانے کی تاریخ 7راپریل 2005ء مقرر ہوئی تھی۔ ایک بس مظفر آباد سے سرینگر آنی تھی اور دوسری سرینگر سے مظفر آباد جانی تھی۔ ریاستی سرکار نے بس سروس کا نام ''کاروانِ امن'' رکھا تھا۔ ابھی فارم بھرنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ماں کی بیماری کی وجہ سے لیاقت جعفری نے پاکستانی انتظام والے کشمیر میں جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ پھر اُس نے مجھ سے رابطہ قائم کر کے پوچھا کہ کیا خالد حسین صاحب اپنے رشتے داروں کو ملنے میر پور جانا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ فوراً جموں کے سی، آئی، ڈی محکمہ سے پرمٹ فارم حاصل کریں اور اُسے پُر کر کے ایس، ایس، پی نثار منہاس کے حوالے کریں جو اُس وقت سی، آئی، ڈی میں تھے۔ میرے ابُو تیار ہو گئے۔ اُنھوں نے دو فارم لیکر پُر کئے۔ اپنا اور ہماری والدہ نسیم فردوس کا۔ پھر ہم دونوں نثار منہاس صاحب کے دفتر گئے۔ اُن سے ملے اور فارم اُن کے سپرد کئے۔ 15 دن کے بعد دونوں اطراف جانے اور آنے والے مسافروں کی لسٹ معہ موبائل نمبر اخباروں میں شائع کی گئی۔ میرے ابُو اور والدہ کے نام فہرست میں شامل تھے۔ ایک دن صبح ہم ناشتہ کر رہے تھے اور میں ابُو کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ اُن کا موبائل بجنے لگا۔ ایک انجان نمبر سے کال آرہی تھی۔ ابُو نے موبائل اٹھایا اور ہیلو کہا تو دوسری طرف سے کشمیری لہجے میں ایک شخص اردو میں مخاطب تھا اور ابُو کو مظفر آباد جانے سے روک رہا تھا۔ پھر دونوں میں تُرش کلامی ہونے لگی۔ ابُو کہہ رہے تھے۔

''ہم دنوں میاں بیوی ہندوستان اور پاکستان کی سرکاروں کی رضامندی سے مظفر آباد جارہے ہیں۔ ہمیں وہاں جانے کے لئے باقاعدہ پرمٹ جاری ہوا ہے، اور دونوں حکومتوں کا یہ فیصلہ قابل تعریف ہے جس کی وجہ سے تقریباً 60 سال کے بعد سرحد کے آر پار رہنے والے رشتے دار ایک دوسرے کو مل سکیں گے۔ اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟...........کیا کہا۔''بس چلنے سے آپ کی تحریک کو نقصان پہنچے گا'' ....ایسی تحریک کا بند ہونا ہی بہتر ہے جس کا آر پار بس چلنے کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے۔'' یہ فون کال کسی ملی ٹینٹ تنظیم کے رُکن کی طرف سے آئی تھی اور اُس نے ابُّو کو دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ اگر اُن کی بات نہیں مانی گئی تو ابُّو اپنی اُلٹی گنتی شروع کر دیں۔ اس پر ابُّو نے جواب دیا تھا۔

''اگر تم لوگوں کی گولی سے میری موت لکھی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکتی اور اگر اللہ سائیں نے میری زندگی لکھی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے مار نہیں سکتی۔''

یہ فون کال لندن سے آئی تھی۔ ابُّو نے جموں و کشمیر کے انسپکٹر جنرل پولیس (سی، آئی، ڈی) شری اشوک بھان کے نام ایک خط لکھا جس میں فون کال کا نمبر اور ملی ٹینٹ سے ہوئی بات چیت کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ بھان صاحب نے ابُّو کے موبائل نمبر پر ہوئی بات چیت کی ریکارڈنگ متعلقہ ٹیلی کام ادارے سے منگوائی اور وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید صاحب کو سنائی۔ وزیر اعلیٰ نے دوسرے روز وہ ریکارڈنگ اسمبلی میں ممبران کو سنائی اور ملی ٹینٹوں کے خلاف دو چار بیان بھی داغ دیئے جب ٹیلی ویژن چینل والوں کو پتہ چلا تو سارے ابُّو کا انٹرویو لینے دوڑ پڑے۔ شاید ہی کوئی نیشنل چینل بچا ہو، جس نے اس واقع کو کوّرنہ کیا ہو اور ابُّو کا انٹرویو نہ لیا ہو، یہاں تک کہ بی، بی، سی ریڈیو، الجزیرہ اور امریکی ٹیلی ویژن والوں نے بھی اس خبر کو نشر کیا اور دکھایا۔ ابُّو کا کہنا تھا کہ وہ مظفر آباد ضرور جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ 4/اپریل کی شام بخشی نگر جموں سے جگدیش

راج ٹنڈن ابُّو سے ملنے کے لئے آئے اور کہنے لگے کہ اُن کا ایک بھائی اور دو چچازاد بھائی ''ہٹیاں دوپٹہ'' میں رہتے ہیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ اُن کا پتہ لگوائیں اور میری فون پر اُن سے بات کرائیں۔ میں مرنے سے پہلے اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ''ہٹیاں دوپٹہ'' کے رہنے والے ہیں۔ میرے پتاجی لالہ ہری چند وہاں کے ایک بڑے دکاندار تھے۔ اُن کی دوستی وہاں کے مسلم نمبردار سے بہت گہری تھی۔ خاندانی تعلقات تھے۔ نمبردار کے بیٹے کی شادی تھی اور ہم سب اُس کی خوشیوں میں شامل ہونے کے لئے اُس کے گھر گئے تھے کہ اُسی رات قبائلی حملہ ہوا اور بلوائی مارکاٹ کرنے لگے۔ میرے پتاجی، ماتاجی، چاچاجی، چاچی اور میرا بھائی بستی رام ٹنڈن نمبردار کے گھر سے افراتفری میں نکلے۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی اور دونوں چچازاد بہت چھوٹے تھے، لہٰذا نمبردار نے کہا کہ آپ جائیں۔ یہ بچے میرے پاس رہیں گے۔ حالات دیکھ کر میں انہیں آپ کے پاس لے کر آؤں گا یا بھجوادوں گا۔ جب ہم اپنے گھر پہنچے تو مکان جل رہا تھا اور دوکان لوٹ لی گئی تھی۔ چنانچہ ہم بھاگتے بھاگتے حاجی پیر کے راستے پونچھ آگئے اور اس طرح میرے بھائی ''ہٹیاں دوپٹہ'' میں ہی رہ گئے۔ نمبردار نے اُنہیں پالا پوسا اور اپنے ہی خاندان میں اُن کی شادیاں کیں۔ ہماری دُکانیں اور زمینیں اُن کے نام واگذار کروائیں۔ اب وہ مسلمان بن چکے ہیں۔ پھر جگدیش راج ٹنڈن نے ایک کاغذ پر اُن کے ہندو نام اور مسلم نام دونوں لکھ کر دیئے اور اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا اور کہا کہ مظفرآباد پہنچ کر ابُّو اُن کا کام ضرور کریں اور اُن کے بھائیوں کے ساتھ بات کروائیں۔ 5/اپریل 2005ء کو ابُّو، امّی اور میں سرینگر کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں ہم ابُّو کے دوست اور وزیر خوارک انکل تاج محی الدین صاحب کے گھر ٹھہرے۔ 6/اپریل 2005ء کو ہم صبح ریاستی سیاحتی مرکز (Toursit Reception Centre) سرینگر گئے۔ وہاں ابُّو اور امّی کو

شناختی کارڈ دیئے گئے۔ سیاحتی مرکز میں مظفرآباد جانے والے 26 مسافر ٹھہرے تھے۔
شناختی کارڈ وصول کرنے کے بعد ہم کھانا کھانے انکل بشیر ڈار اور آنٹی جبین کے گھر
گئے۔ کھانے کے بعد ابُّو نے جبین آنٹی کو ٹیلی ویژن آن کرنے کے لئے کہا۔ جوں ہی ٹیلی
ویژن آن ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ٹورسٹ ریسپشن سنٹر جل رہا ہے اور آگ کے شعلے نکل
رہے ہیں۔ تقریباً سارے چینل اسے دہشت گردی کی کارروائی بتا رہے تھے۔ ٹی، وی
اینکر بتا رہے تھے کہ دو اُگروادی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سیاحتی مرکز کے اندر گھس آئے
اور انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ وہاں تعینات فوجی جوانوں نے
جوابی فائرنگ کی۔ وہ دونوں اُگروادی سیاحتی مرکز کی عمارت میں چھپے تھے۔ ہمارے
بہادر جوانوں نے دونوں اُگروادیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے لیکن گولی باری
میں سیاحتی مرکز کو آگ لگ گئی۔ اینکر بتا رہے تھے کہ سیاحتی مرکز کی ایک ملازم بھی زخمی
ہوئی ہے۔ ابُّو حیران تھے کہ جب وہ لوگ سیاحتی مرکز کے اندر گئے تھے تو تین جگہ اُن کی
تلاشی لی گئی تھی اور مین گیٹ کے علاوہ باقی دونوں جگہوں پر بھی بڑے بڑے کیلوں والے
بیری کیٹ لگائے گئے تھے۔ پھر تینوں جگہوں کے بیری کیٹ اِن اُگروادیوں نے کس
طرح موٹر بائیک پر عبور کئے اور اندر جا کر کارروائی کی۔ اس واقع کی تحقیقات کبھی نہیں
ہوئی اور نہ ہی اُگروایوں کی لاشیں دکھائی گئیں۔ سیاحتی مرکز کو جلتا دیکھ کر میری امّی بے
ہوش ہو گئیں اور اُنہوں نے مظفرآباد جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اتنے میں میری بہن
ڈاکٹر ہُما تبسم اور جیجا ڈاکٹر عشرت چوہدری بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ بھی ابُّو کو کہنے لگے کہ وہ نہ
جائیں، لیکن ابُّو بضد تھے کہ وہ ضرور جائیں گے البتہ بولے کہ اپنی ماں کو لے جاؤ۔ سرینگر
کے سیاحتی مرکز کو آگ لگنے کی وجہ سے پاکستانی کشمیر جانے والے مسافروں کو ڈل جھیل
میں بنے سنتور ہوٹل میں منتقل کیا گیا۔ جہاں سے 9 لوگ بھاگ گئے جو باقی رہ گئے، انسپکٹر

جنرل پولیس کشمیر جاوید مخدومی صاحب اُن کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور سفر خرچ کے لئے
دس دس ہزار روپئے ہر فرد کو دے رہے تھے۔ اُن کی حفاظت کے لئے پولیس کا ایک
خصوصی دستہ بھی تعینات کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ ریاستی سرکار کو یہ ڈر تھا کہ اگر ان میں سے
مزید کوئی بھاگ گیا تو جگ ہنسائی اور شرمندگی ہوگی کیونکہ 7/اپریل کو پردھان منتری
ڈاکٹر منموہن سنگھ، یو، پی، اے کی چیئر پرسن شریمتی سونیا گاندی، وزیر خارجہ نٹور سنگھ، غلام
نبی آزاد اور کچھ دیگر مرکزی لیڈر مظفر آباد جانے والی بس، ''کاروانِ امن'' کو ہری جھنڈی
دکھا کر روانہ کرنے والے تھے۔ 7/اپریل 2005ء کی صبح ایک ڈی، ایس، پی ابّو
اور امّی'' کو لینے کے لئے تاج انکل کے گھر آیا۔ وہ اپنی سرکاری جیپ لے کر آیا تھا
دو سپاہیوں نے ابّو اور امّی کا سامان جیپ میں رکھا۔ ابّو نے امّی سے کچھ نہیں کہا لیکن امّی
چپ چاپ ابّو کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سبھی مسافر سنتور ہوٹل
سے امر سنگھ کلب سے متصل کرکٹ گراؤنڈ میں لائے گئے۔ ابّو اور امّی بھی لولیس کی جیپسی
میں کرکٹ اسٹیڈیم پہنچے۔ بس کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ریاستی سرکار کی ساری انتظامیہ
چیف سکریٹری ڈاکٹر سدھیر سنگھ بلوریہ صاحب کی سربراہی میں موجود تھی۔ سب سے پہلے
جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید اپنی دُختر محبوبہ مفتی کے ساتھ پہنچے جو پی ڈی پی کی
صدر تھیں۔ وہ پردھان منتری کے استقبال کیلئے کھڑے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر منموہن
سنگھ، شریمتی سونیا گاندھی، نٹور سنگھ، غلام نبی آزاد، منی شنکر ایئر وغیرہ کرکٹ گراؤنڈ میں
تشریف لائے۔ پردھان منتری نے سبھی مسافروں کو ایک ایک یادگاری مومنٹو دیا اور
خصوصی ٹوپی پیش کی۔ مسافروں کو بس میں بٹھایا گیا۔ وزیر اعظم نے کاروانِ امن کو ہری
جھنڈی دِکھائی، اور بس مظفر آباد کے لئے روانہ ہوگئی۔ ابّو اُس وقت حیران رہ گئے جب
اُنہوں نے محترمہ محبوبہ مفتی کو بھی بس میں سوار ہوتے دیکھا۔ وہ سیدھی ابّو کے پاس آکر

بیٹھ گئیں۔ اور کہنے لگیں کہ سب مسافروں کی ذمے داری اب اُن کے سپرد کی جاتی ہے۔
اس بس سروس کے خلاف حریت کانفرنس نے ہڑتال کی کال دی تھی جس کی وجہ سے سڑکیں ویران تھیں، قصبوں میں کوئی دُکان کھلی نہیں تھی۔ صرف سیکورٹی فورس اور پولیس کی گشت دکھائی دے رہی تھی۔ جب بس پٹن قصبے سے گذری تو دو رائفل گرنیڈ بظاہر بس پر پھینکے گئے لیکن وہ بس سے تقریباً دو تین سو فٹ دُور دھان کے کھیت میں پھٹے۔ سرینگر میں سیاحتی مرکز کو آگ لگانا اور رائفل گرینیڈ پھینکنے کا مقصد مظفر آباد جانے والے مسافروں کو ڈرانا تھا۔ اِن دونوں حادثوں کو عام لوگ خفیہ ایجنسیوں کی کارستانی بتا رہے تھے کیونکہ دونوں ملکوں میں حالات سازگار ہو جانے سے اور کشمیر کے مسئلے کا کوئی معقول حل نکلنے سے سب سے زیادہ نقصان دونوں کی خفیہ ایجنسیوں کو ہی ہوگا۔ جنہیں ہر سال کروڑوں روپے کی گرانٹ آگ لگانے اور آگ بجھانے کے لئے دی جاتی ہے تاکہ مسئلہ کشمیر کی ہانڈی ہمیشہ اُبلتی رہے۔ میں اپنی کار میں ''کاروانِ امن'' بس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اُوڑی کے ہیڈکواٹر سلام آباد میں مسافروں کے لئے حکومت کی طرف سے کشمیری وازان کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوپہر کے وقت کئی ٹیلی ویژن چینلوں کے رپورٹر مسافروں کے انٹرویو لینے لگے۔ میری امّی نے بھی دو ایک رپورٹروں کو انٹرویو دیا۔ کھانے کے بعد بس کمان پُل کی طرف چل پڑی جسے بھارتی فوج نے ''امن سیتو'' کا نام دیا تھا۔ کمان پُل کے پاس حکام نے سامان کی چیکنگ کی اور پھر سامان مزدوروں کے ذریعے کمان پُل کے درمیان تک لے جایا گیا۔ کمان پُل کے پاس بھارتی فوج نے سائبان نصب کیا ہوا تھا جو مسافروں کے استقبال کے لئے لگایا گیا تھا۔ یہاں اُوڑی بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈئر عطا حسنین (جو بعد میں لیفٹینینٹ جنرل بنے اور سرینگر میں 15 کور کے جنرل رہے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں) نے مسافروں کی چائے سے تواضع کی۔ محبوبہ مفتی صاحبہ نے چائے پی

اور پھر بریگیڈئر حسنین کے ساتھ کمان پل کے درمیان تک گئیں۔ اُس کے بعد سبھی مسافر کمان پل کے پار چلے گئے جہاں پاکستانی انتظام والے کشمیر کی طرف سے بس تیار کھڑی تھی اور مظفر آباد ڈویژن کے ڈویژنل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مسافروں کا استقبال کرنے آئے تھے۔ کمان پُل کا آدھا حصہ پاکستانی فوج کے قبضہ میں ہے اور آدھا ہندستانی فوج کے۔ ہم اسے نو مین لینڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب تک سبھی مسافر بس میں نہ بیٹھے، محبوبہ مفتی، ان کو پُل سے دیکھتی رہیں اور پھر پاکستانی انتظام والے کشمیر سے مسافروں کا قافلہ جب کمان پُل پر پہنچا تو بریگیڈئر عطا حسنین اور محبوبہ مفتی نے اُن کا سواگت کیا اور اُن کو ''کاروانِ امن'' والی بس میں سرینگر کے لئے روانہ کیا۔ میں یعنی اپنے ابُو خالد حسین کا چھوٹا بیٹا یاسر عمران تین گھنٹے کی مسافت کے بعد واپس سرینگر آ گیا، محترمہ محبوبہ مفتی بہت خوش تھیں کیونکہ اُن کے والد اور وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید کا ''ہیلنگ ٹچ'' کا فارمولہ اور نظریہ کامیاب ہوتا دِکھائی دے رہا تھا۔

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رُکنا اچھا
سوچیے، آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا
(عرفان صدقی)

کھیل تماشے II

اگرچہ ختم تھے رشتے پڑوسیوں والے
ہمارے درمیاں ہمسائیگی بچی ہوئی تھی
(لیاقت جعفری)

جب بس کمان پُل سے چکوٹی پہنچی، جو پُل سے دوکلومیٹر کی دُوری پر ہے، تو پاکستانی انتظام والے کشمیر کے وزیراعظم سردار سکندر حیات خان اور اُن کی کابینہ کے ساتھیوں نے بھارتی کشمیر سے آنے والے مسافروں کا استقبال کیا۔ سبھی مسافروں کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ چائے پلائی گئی۔ پاکستان کے کسٹم حکام نے بغیر جانچ کئے مسافروں کا سامان بس میں رکھوایا اور بس مظفرآباد کی طرف چل پڑی۔ اس بس میں وادیٔ کشمیر سے صرف ایک کشمیری جوڑا تھا جبکہ باقی سب ضلع پونچھ اور راجوری سے تعلق رکھتے تھے۔ اور پوٹھواری بولنے والے لوگ تھے۔ جموں سے پنجابی بولنے والا جوڑا خالد حسین اور اُن کی اہلیہ اور ہماری ماموں زاد بہن نسیم فردوس کا تھا۔ میرا نام عاشق سلہریا ہے اور میں اپنے بڑے بھائی تصور سلہریا کے ساتھ اُن کو لینے کے لئے چکوٹی آیا تھا لیکن سیکورٹی وجوہات کی بنا پر انتظامیہ نے فیصلہ لیا تھا کہ سبھی مسافر بس میں ہی مظفرآباد تک جائیں گے۔ وہیں سے وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی بھی بس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ہم بھی جدّی پشتی جموں کے محلہ اُستاد غوث محمد خان کے رہنے والے ہیں جہاں ہمارا آبائی مکان ابھی بھی موجود ہے۔ میرے والد نصیرالدین سلہریا اور ماں وزیر بیگم 1947ء کی شورش میں

جموں سے سیالکوٹ آ گئے تھے اور پھر وہاں سے میر پور میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔
ہماری والدہ ضلع اُدھمپور کے موضع دھونہ لاٹی کی رہنے والی تھی اور جنگلات کے ٹھیکیدار عبداللہ ملک کی بیٹی تھی۔ اُس کی ایک بہن دھونہ لاٹی میں ہی راج محمد گرداور کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ ہمارے تین ماموں تھے۔ محمد ابراہیم ملک، رحمت ملک اور محمد سعید اللہ ملک۔ نسیم فردوس، سعید اللہ ملک اور ہماری مامی وزیر بیگم کی بیٹی ہے۔ ہمارا ایک بڑا بھائی نعیم سلہریا اور چھوٹی بہن نگہت لندن میں رہتے ہیں اور دوسرا بھائی قمر الدین سلہریا، پیرس میں اپنے عیال کے ساتھ رہتا ہے۔ ہماری ایک بہن ڈاکٹر پروین، اور اُن کا خاوند ڈاکٹر کرنل عنایت حسین راولپنڈی کے قصبے چکلالہ میں رہتے ہیں۔

چکوٹی سے لیکر مظفر آباد تک ساری سڑک کو محرابوں سے سجایا گیا تھا۔ جگہ جگہ مقامی لوگ بس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ چکوٹی سے بس جب 'چناری' پہنچی تو وہاں لوگوں نے مہمان مسافروں کو دودھ پلایا۔ پھر جب بس ''آمرا ساون'' پہنچی تو لوگوں نے مٹھائیوں سے تواضع کی۔ سارے راستے جہلم دریا سڑک کے ساتھ ساتھ بہتا رہا ''گُچھاں سیداں' سے ایک راستہ لیپا وادی کو جاتا ہے جو وہاں سے ڈیڑھ سو کلو میٹر دور ہے۔ پھر بس، ہٹیاں والا، سرن گگڑ واڑا، چھٹیاں ٹنگی، گھڑی دوپٹہ، مجوہی، ٹھٹھا اور تنبولی سے گذرتی ہوئی تقریباً پانچ بجے مظفر آباد پہنچی۔ سب مسافروں کو مظفر آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ رات کے کھانے کی دعوت وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کی طرف سے دی گئی تھی، جس میں پاکستانی کشمیر کے صدر جنرل انور خان، وزرا اور مظفر آباد کے اعلیٰ افسر و معزز شہری شامل ہوئے۔ کھانے سے پہلے تقریریں ہوئیں۔ بحیثیت گروپ لیڈر ہمارے بہنوئی خالد حسین نے وزیر اعظم سردار سکندر حیات صاحب کا مہمان نوازی اور پُر تکلف دعوت کے لئے شکریہ ادا کیا۔ کھانے کی میز پر خالد حسین نے جگدیش لال ٹنڈن کے بھائیوں کا ذکر کیا اور کاغذ پر

ان کے نام اور جگدیش لال کا موبائل نمبر لکھ کر دیا تا کہ اُن کو تلاش کیا جاسکے۔ سکندر حیات صاحب نے یقین دلایا کہ وہ جگدیش لال ٹنڈن کے بھائیوں کا پتہ لگائیں گے اور اُن کی بات چیت بھی ٹنڈن صاحب سے کرائیں گے۔ پھر وہ خالد حسین سے پوچھنے لگے کہ لالہ تیرتھ رام، آملہ نہیں آئے؟ وہ بھی تو آنے والے تھے۔ خالد حسین نے جواب دیا کہ اُنھیں اِس کا کوئی علم نہیں۔ پھر وہ کہنے لگے کہ اُن کو واپس جا کر بتا دیں کہ وہ جب بھی آنا چاہیں وہ آسکتے ہیں۔ وہ ہمارے سرکاری مہمان ہوں گے۔ اُس کے بعد ہمارے بہنوئی نے وزیر اعظم کو اُن کی بھتیجی مہناز کا ایک خط دیا جو جموں میں بیاہی گئی ہے اور خالد حسین کے دوست یاسین بیگ کی بہو ہے۔ خط پڑھ کر وہ بولے کہ یہ بچی میرے کزن کی بیٹی ہے لیکن رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے رشتوں کی جانکاری نہیں رہی ہے۔ میری اہلیہ اس بچی کو پھوپھی لگتی ہے یہ بچی منجا کوٹ کی ہے جو ہمارا ابھی آبائی گاؤں ہے۔ دوسری صبح پاکستانی انتظام والے جموں وکشمیر کے سابقہ وزیر اعظم اور مسلم کانفرنس کے صدر (مجاہد اول) سردار عبدالقیوم خان کی طرف سے ناشتے کی دعوت تھی۔ جس میں بھارتی کشمیر سے آنے والے مسافر اور آزاد کشمیر کے صدر، وزیر اعظم، دیگر وزرا اور سردار عبدالقیوم کے صاحبزادے سردار عتیق خان نے شرکت کی جو بعد ازاں وہاں کے وزیر اعظم بھی رہے۔ ان سب کے علاوہ حریت کانفرنس (مظفر آباد) کے صدر وغیرہ بھی ناشتے میں شامل ہوئے۔ وہاں بھی تقریریں ہوئیں اور پھر جموں وکشمیر سے آئے ہوئے مسافروں کے گروپ لیڈر اور ہمارے بہنوئی خالد حسین کو خطاب کرنے کے لئے کہا گیا۔ بھائی جان نے اپنی تقریر میں بھارت اور پاکستان کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں کے سربراہوں نے یہ قابل تعریف کام کر کے دنیا کو پیغام دیا ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان میں امن چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کو بات چیت کے ذریعے اپنے دیرینہ مسئلے حل کرنے چاہیں کیونکہ امن، شانتی،

پیار اور محبت کے لئے بات چیت ہی واحد راستہ ہے جس سے بدگمانیاں دور ہوں گی۔ خالد حسین نے گذارش کی کہ سری نگر مظفر آباد کے علاوہ پونچھ، راولاکوٹ، اکھنور۔ بھمبر، کوٹلی۔ نوشہرہ، کرگل۔ اسکرڈو اور جموں، سیالکوٹ کے راستے بھی کھولنے چاہیں اور آنے جانے والوں کیلئے صرف شناختی کارڈ کو ہی پرمٹ یا ویزا سمجھا جائے۔ ریاست کے دونوں حصّوں کے طلباء کو تعلیم کے لئے سرحد کی دونوں جانب آنے جانے کی اجازت دی جائے۔ کاروبار شروع کیا جائے۔ تاکہ ریاست کی معیشت مضبوط ہو۔ وہاں دیوار پر دو بینر لگے تھے، جن پر لکھا تھا کہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' اور ''کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے''۔ اُن کو دیکھ کر خالد حسین نے کہا کہ کشمیر نہ تو کسی کی شہ رگ ہے اور نہ ہی اٹوٹ انگ۔ کیونکہ 1947ء سے لیکر آج تک اس شہ رگ سے خون کی اتنی ندیاں بہہ چکی ہیں کہ رگ دکھائی ہی نہیں دیتی اور ہمارا ایک ایک انگ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہم لوگ اپنے اپنے علاقوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے کام کریں۔ ریاست کے تمام لوگوں کو اپنے اپنے گھر اور علاقے دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ مذہبی مقامات پر جانے کی آزادی دی جائے۔ دونوں ملکوں میں اعتماد بحال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔

خالد حسین کے بعد سردار عبدالقیوم خان نے خطاب کیا اور کہا کہ ''وہ خالد صاحب کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے اُنہوں نے قربانیاں دیں ہیں اور انشاء اللہ وہ اپنے مقصد میں ایک دِن کامیاب ہوں گے۔ لیکن چونکہ یہ ہمارے مہمان ہیں اس لئے ان کی شاید اپنی مجبوریاں ہوں گی''۔ خالد حسین جواب دنیا چاہتے تھے لیکن صدارتی خُطبے کے بعد بولنا پروٹوکول کے خلاف تھا۔ ناشتے کے بعد سبھی اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔ ہم دونوں بھائی باجی نسیم اور بھائی خالد حسین کو لیکر راولپنڈی کی طرف چل پڑے۔ کوہالہ پُل تک ریاست جموں وکشمیر کی حد تھی۔ اُس کے بعد ضلع راولپنڈی

شروع ہوتا ہے کوہالہ تک دریائے جہلم سڑک کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ جہلم دریا کا دوسرا کنارا خیبر پختون خواہ صوبے کی ہزارہ ڈویژن کے ساتھ ملتا ہے۔ کوہالہ سے ہم ''چھانگا گلی''، ''کوہ مری'' اور ''گھوڑا گلی'' سے گذرتے ہوئے پاکستان کی راجدھانی اسلام آباد کے اندر سے گذر کر راولپنڈی اور پھر چکلالہ بہن ڈاکٹر پروین کے ہاں پہنچے۔ رات ہم سب ڈاکٹر کرنل عنایت حسین کے دولت خانے پر ٹھہرے۔ دوسرا اور تیسرا دِن بھی ہم نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہی گذارا۔ باجی پروین، خالد بھائی اور باجی نسیم کو لیکر راولپنڈی گھمانے کے لئے لے گئیں۔ خالد صاحب نے پاکستانی پرانی فلموں کے گیتوں کی سی ڈی خریدیں۔ پھر بحریہ ٹاؤن شپ کا دورہ کیا جو بہت ہی خوبصورت کالونی بنی ہے۔ ڈاکٹر عنایت حسین صاحب فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں جبکہ باجی پروین گھر کو سنبھالتی ہے۔ رات کھانے پر خالد بھائی اور باجی نسیم کے ساتھ ہم سب اسلام آباد میں خالد صاحب کے سمبندھی فاروق بیگ کے بھائی محسن بیگ کے ہاں گئے۔ تیسرے روز کرنل عنایت صاحب کے دوست ایک ریٹائرڈ بریگیڈئر خالد حسین سے ملنے آئے۔ اُن کے ساتھ خالد بھائی کی بڑی لمبی بات چیت ہوئی۔ مسئلہ کشمیر زیرِ بحث آیا۔ 1947ء کی تقسیم کے حوالے سے باتیں ہوئیں۔ بھائی خالد کا کہنا تھا کہ کشمیر کے بارے میں پاکستانی عوام کا نظریہ حقیقت پر کم اور جذبات کے ساتھ زیادہ جڑا ہے۔ یہاں لوگوں کے دل اور دماغ پر کشمیر ہی سوار ہے جو صحیح اپروچ نہیں ہے۔ کیونکہ کشمیر کی زبان، رہن سہن، لباس، تمدن کچھ بھی پاکستان کے کسی صوبے کے ساتھ نہیں ملتا ماسوائے مذہب کے۔ وادیٔ کشمیر کا صرف ایک ضلع مظفر آباد جو دوتہائی پاکستان کے زیر قبضہ ہے جب کہ باقی سارا علاقہ جموں صوبے سے تعلق رکھتا ہے یعنی میرپور، کوٹلی، باغ، پلندری، حویلی، پونچھ، راولاکوٹ وغیرہ سب جموں صوبے کے علاقے ہیں جہاں پوٹھواری یا پہاڑی اور گوجری بولی جاتی ہے۔ نیلم، کیرن

اور شاردا کبھی مظفر آباد ضلع کے حصّے تھے لیکن اب نیلم ضلع کے علاقے ہیں اور یہاں بھی پہاڑی بولی جاتی ہے۔ جموں صوبے میں پیر پنچال کے ساتھ ملتے کچھ علاقے ضرور کشمیری بولتے علاقے ہیں لیکن باقی سارا جموں صوبہ زبان، لباس، نسل، رہن سہن اور کھان پان کے اعتبار سے مغربی پنجاب کے ساتھ ملتا ہے۔ اگر ریاست کو 1947ء والی پوزیشن پر لایا جائے تو کشمیری بولنے والے لوگوں کی گنتی اس وقت صرف 60لاکھ ہوگی جبکہ باقی سارا علاقہ پنجابی گھرانے کی بولیاں، ڈوگری، پہاڑی اور گوجری بولنے والا ہوگا، جس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ ہوگی۔ پھر گلگت، بلتستان، کرگل اور لداخ کی تقریباً پچیس لاکھ آبادی بھی ہے۔ یعنی اُس صورت میں کشمیری بولنے والی آبادی، کبھی بھی اقتدار میں نہیں آئے گی۔ ان حقائق کی طرف بھی سیاسی لیڈروں اور حریت والوں کو دیکھنا ہوگا۔

خالد بھائی نے اُنھیں کہا کہ اُن کی نظر میں کشمیر مسئلے کا حل یہ ہے کہ جو علاقہ پاکستان کے پاس ہے وہ اُن کو مبارک ہو اور جو بھارت کے پاس ہے وہ اُس کو۔ موجودہ سرحد میں معمولی ایڈجسمنٹ کی ضرورت پڑے تو وہ کی جائے اور ہمیشہ کے لئے یہ مسئلہ حل کرلیا جائے اور لائن آف ایکچول کنٹرول کو انٹرنیشنل بارڈر بنادیا جائے۔ خالد حسین نے بتایا کہ اُنھوں نے کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''بدلتی دُنیا'' کو 2006ء میں جو انٹرویو دیا تھا۔ اُس میں بھی یہی حل تجویز کیا تھا۔ اور آج مشرف اور اٹل بہاری واجپائی اور پھر ڈاکٹر منموہن سنگھ کے درمیان کشمیر مسئلے کا حل بھی اسی بنیاد پر ہونے کی اُمید ہے جس کے لئے سید علی شاہ گیلانی کے علاوہ باقی سب حریت لیڈر متفق ہیں۔ باقی کشمیر میں پھیلی بے چینی، بداعتمادی اور زیادتیوں کے بارے میں بھارت سرکار کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اور لوگوں کو اندرونی خودمختاری دینی چاہیے۔ جو الحاق نامہ کی بنیاد ہے''۔

10/ اپریل کو ہم باجی نسیم اور خالد بھائی کو لیکر میرپور کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے

میں ہم ''مندرا''، گجر خان، اور ''سوہاوا'' کے شہروں سے گذرتے ہوئے مشہور اُردو شاعر اور فلم ساز وہدایت کار گلزار آ کے شہر دینہ پہنچے۔ دینہ، جی، ٹی روڈ (گرینڈ ٹرنک روڈ، جو شیر شاہ سوری نے کلکتہ سے پشاور تک بنائی تھی اور آج بھی قابلِ استعمال ہے۔) پر واقع ایک بڑا قصبہ ہے اور پنجاب کے ضلع جہلم کا حصہ ہے۔ یہاں سے ایک راستہ جہلم شہر کو جاتا ہے جبکہ دوسرا راستہ منگلا اور میرپور کو۔ دینہ سے منگلا 20 کلومیٹر اور میرپور 30 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ تربیلا ڈیم کے بعد دریائے جہلم پر پاکستان کا سب سے بڑا بجلی پیدا کرنے والا ڈیم منگلا کے نام سے منسوب ہے، جبھی اس کا نام منگلا ڈیم ہے۔ اس ڈیم کی جھیل میں میرپور کا 90 فیصد پرانا شہر ڈوب گیا تھا جبکہ نیا شہر تھوڑا دور پہاڑی پر بسایا گیا ہے۔ یہ شہر اپنے خوبصورت مکانوں، چوڑی سڑکوں اور خوشحالی کی وجہ سے آزاد کشمیر کا بڑا پُر رونق شہر ہے، اور اپنی قدرتی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ بھائی خالد بھارتی کشمیر سے آنے والے مسافروں کے گروپ لیڈر تھے۔ اس لئے میرپور ڈویژن کے ڈویژنل کمشنر جناب سلیم بسمل کو اُن کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ عاشق سلہریا تو کاروبار کرتا ہے لیکن میں یعنی تصور سلہریا آزاد کشمیر کے محکمہ School Text Board میں 20 گریڈ کا افسر ہوں۔ لہٰذا جناب سلیم بسمل نے مجھے ہی بھائی خالد حسین اور دیگر مہمانوں کا نوڈل افسر لگا دیا تھا۔ سلیم بسمل صاحب کے والدین 1965 کی ہند پاک جنگ کے دوران ضلع پونچھ کے موضع کُنیاں سے ہجرت کر کے پاکستانی انتظام والے کشمیر میں آ گئے تھے۔ بسمل صاحب نے پانچویں جماعت کُنیاں کے پرائمری سکول سے پاس کی تھی باقی کی تعلیم اُنہوں نے میرپور اور اسلام آباد میں حاصل کی۔ بہر حال میرپور پہنچتے ہی ایڈوکیٹ محمد شریف طارق (جو 1965ء کے بعد راجوری سے میرپور آ گئے تھے) مرحوم اُن سے ملنے آئے پھر وہ خالد بھائی کو لیکر آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس عبدالمجید ملک صاحب کے

دولت خانہ پر گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں میرپور بار کے صدر ریاض انقلابی، اردو روزنامہ "خبریں" کے مقامی مدیر چغتائی صاحب اور صحافی الطاف حمید راؤ بھی آ گئے۔ اُن سب نے خالد بھائی کو خوش آمدید کہا اور شام کو ایک مقامی ہوٹل میں میرپور سٹی زن کونسل کی طرف سے دیئے جانے والے استقبالیہ میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ شام پانچ بجے کے قریب وہ مجھے لینے آئے اور ایک ہوٹل کے کشادہ ہال میں لے گئے جہاں تقریباً دو سو افراد جمع تھے۔ جسٹس مجید ملک صاحب کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی۔ ایڈوکیٹ محمد شریف طارق، چغتائی صاحب اور ریاض انقلابی صاحب نے تقاریر کیں اور مسئلہ کشمیر بارے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ڈاکٹر منموہن سنگھ اور جنرل پرویز مشرف کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے تقسیم ہند کے بعد پہلی بار یہ موقع فراہم کیا کہ کئی دہائیوں کے بعد لوگ اپنے رشتے داروں کو مل رہے ہیں۔ کئی مقررین نے ریاست جموں و کشمیر کی مکمل آزادی کی بات کی اور کچھ نے پاکستان میں شامل ہونے کا ذکر کیا۔ جب بھائی خالد کو اپنے خیالات رکھنے کیلئے کہا گیا تو اُنہوں نے سب سے پہلے "دشمنی" کے عنوان سے اپنا ایک افسانچہ پڑھا۔ جس میں ہندوستان اور پاکستان کی نفرت کو محبت میں بدلنے کی بات کہی گئی تھی۔ پھر اُنہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان کے پاس جموں، کشمیر اور لداخ کا جو علاقہ ہے اُسے وہ ہرگز چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ چاہے امریکہ، روس یا دیگر عالمی طاقتیں کتنا بھی دباؤ ڈالیں اور ریاست کے جو علاقے پاکستان کے پاس ہیں وہ ان کو بھی لینا نہیں چاہتا حالانکہ بھارت نے دو بار اپنی پارلیمنٹ میں اس امر کی قراردادیں منظور کی ہیں کہ پوری ریاست اُس کا اٹوٹ انگ ہے، جیسے پاکستان ریاست کو اپنی شہ رگ کہتا ہے لیکن یہ سب سیاسی مجبوریاں ہیں کیونکہ مسئلہ کشمیر دونوں ملکوں کے سیاست دانوں کا اقتدار میں آنے کے لئے ایک جذباتی مگر مضبوط ہتھیار ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر کے مدعے پر تین

بار جنگ ہوئی لیکن 1965ء اور 1971ء کی جنگ میں جیتے ہوئے علاقے ایک دوسرے کو واپس کرنے پڑے۔ لہٰذا موجودہ سرحد کو انٹرنیشنل بارڈر میں تبدیل کیا جائے اور حالات خوشگوار بنائے جائیں۔ معصوم بچوں کو مذہبی زنجیروں میں قید کرنے اور اُنھیں عسکری تربیت دینے کے بجائے اُن کے ہاتھوں میں کتابیں دی جائیں۔ نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان آئیں۔ انجینئرنگ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اداروں میں پڑھائی کرنے آئیں۔ اسی طرح ہمارے نوجوان بھی آپ کے ہاں آئیں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دونوں ملکوں نے یہ بس سروس شروع کی ہے جبکہ اِن کو کرگل، اسکردو، جموں سیالکوٹ اور دیگر راہداریاں بھی کھولنی چاہئیں۔ خالد بھائی کے بعد جسٹس مجید ملک صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ خالد حسین صاحب ہمارے مہمان ہیں۔ اِنہوں نے جو کچھ کہا وہ اُن کے ذاتی خیالات ہیں اور اُن کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ پاکستانی انتظام والے جموں و کشمیر کے دس اضلاع ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ نیلم، حویلی، مظفر آباد، سدھنوتی، ہٹیاں بالا، پونچھ (راولاکوٹ) باغ، کوٹلی، بھمبر اور میر پور جبکہ گلگت بلتستان (اسکردو، ہُنزہ، پشن، کلاش، گلگت، چترال وغیرہ) پاکستان کے انتظامیہ کنٹرول میں ہیں۔ یہ علاقے 1947ء سے پہلے ریاست جموں و کشمیر کے حصے تھے لیکن انگریز سرکار نے یہاں اپنی علمداری اس لئے رکھی تھی کہ یہ علاقے جغرافیائی لحاظ سے بہت ہی اہم تھے کیونکہ گلگت بلتستان کی سرحد چین، روس، افغانستان اور سنٹرل ایشیاء کے کئی علاقوں کے ساتھ ملتی تھیں اور انگریز اِن علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتا تھا تاکہ روس اور چین پر نظر رکھی جاسکے۔ گلگت سے جو راستہ چین کے صوبے سنگیانگ اور وسط ایشیاء کے ملک کرغستان کو جاتا ہے، اُس کی کچھ تفصیل یوں ہے۔ گلگت سے ہنزہ، وہاں سے جھیل عطا آباد، پھر سوست، خنجراب درہ (جو پاک چین بارڈر ہے) تاشقرگان اور پھر کاشغر۔ وہاں

سے ایک راستہ بذریعہ ارکشتان، اوس (جلال آباد) کوجاتا ہے جو کہ چین اور کرغستان کی سرحد پر ہے اور دوسرا رستہ قراغستان کوجاتا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گلگت بلتستان انگریز سرکار کے لئے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ اسکردو کے پار کرگل اور دراس اور دوسری طرف لداخ کا علاقہ ہے جو 1947ء کے بعد سے بھارت کے پاس ہے۔ 1947ء سے قبل وسط ایشیا کے ملکوں کے ساتھ جو تجارت ہوتی تھی وہ شاہرائے کرُاکرم کے انہی علاقوں سے ہوتی تھی جسے ریشم سڑک یا سلک روڈ بھی کہاجاتا تھا۔ گُریز کے راستے یہ سڑک وادیٔ کشمیر کو ملاتی تھی۔ آج چین اور پاکستان کا اہم پروجیکٹ ''چین پاکستان اقتصادی راہ داری China Pakistan Economic Corridors'' چین اور گلگت سے ہوتی ہوئی بلوچستان اور صوبے کی بندرگاہ گوادر تک جاتی ہے۔ گلگت کا علاقہ انگریز سرکار نے ہندوستان سے نکل جانے کے کچھ دیر پہلے مہاراجہ ہری سنگھ کوسونپا تھا جو اس کی حفاظت نہ کرسکا اور اُس کا گورنر گھنسارا سنگھ اور فوجی کمانڈر کرنل عبدالمجید دُرانی گرفتار ہوگئے جنہیں گلگت سکاؤٹ کے سپاہیوں نے مقامی لوگوں کی مدد سے شکست دے کر پکڑ لیا تھا۔

11/اپریل 2005ء کو میرپور ڈویژن کے کمشنر سلیم بسمل اور ڈپٹی کمشنر میرپور نے رات کھانے کی دعوت پر مدعو کیا۔ اس سرکاری دعوت میں میرپور ڈویژن کے سارے ڈپٹی کمشنر اور شہر کے چند معزز افراد کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ خالد بھائی نے دعوت قبول کی اور سلیم بسمل صاحب سے گذارش کی کہ وہ کھڑی شریف جانا چاہتے ہیں، اس کی اجازت دی جائے تاکہ مشہور پنجابی صوفی شاعر میاں محمد بخش کی درگاہ پر حاضری دی جاسکے۔ صبح خواجہ سلیم بسمل صاحب نے کھڑی جانے کے لئے سرکاری کار بھیج دی۔ میں باجی نسیم اور بھائی خالد کو لیکر کھڑی شریف پہنچا جو میرپور سے 13 کلومیٹر دور ہے۔ یہاں خالد

بھائی نے صوفی منش شاعر اور درویش میاں محمد بخش کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ فاتحہ پڑھی۔ اُن کے مرشد دمڑی والے پیر کے مزار پر بھی حاضری دی، جن کی درگاہ بھی اُسی احاطہ میں ہے۔ سنگ مرمر سے بنی دونوں درگاہیں اور صحن انتہائی خوبصورت ہیں۔ یہاں روزانہ لنگر زائرین کے لئے بنتا ہے۔ ہم نے بھی لنگر میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ حکومت کی طرف سے تعینات منیجر نے خالد حسین کو میاں محمد بخش کی شہرہ آفاق تخلیق ''سیف الملوک'' کا نسخہ پیش کیا۔ میاں صاحب کی درگاہ کے چاروں اطراف حکمت و دانش سے بھرپور ان کے اشعار لکھے ہیں تا کہ زائرین اور صوفی ادب کے شائقین اُنھیں پڑھ سکیں۔ بعدازاں ہم نے منگلا ڈیم کی سیر کی۔ کشتی رانی کی۔ ڈیم پر کام چل رہا تھا اور چینی انجینئر باندھ کو اُونچا کر رہے تھے۔ یوں ہم چار بجے تک واپس میرپور پہنچ گئے۔ شام کو ایک کشمیری نوجوان نثار احمد بھائی خالد کو ملنے کے لئے آیا۔ وہ بارہ مولہ کا رہنے والا تھا اور 1990ء میں مجاہدین کی کسی تنظیم میں شامل ہو کر اسلحہ چلانے کی تربیت لینے کیلئے سرحد پار آ گیا تھا لیکن وہ واپس نہیں گیا کیونکہ اُس کے والدین نے اُسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ واپس نہ آئے۔ ورنہ فوج، سیکورٹی فورس یا مقامی پولیس اُسے مار ڈالے گی۔ لہٰذا اُس نے میرپور میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور شادی بھی کر لی تھی۔ اُس کے دو بچے بھی تھے لیکن اب اُسے اپنے وطن، والدین اور بھائی بہنوں کی یاد ستا رہی تھی اور وہ واپس بارہ مولہ لوٹنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ خالد بھائی کی مدد مانگ رہا تھا لیکن اُنھوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس معاملہ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ بعد دوپہر ایڈوکیٹ شریف طارق مرحوم کے ہاں چائے پینے چلے گئے۔ وہاں بھی کشمیر کی سیاست ہی حاوی رہی۔ کشمیریوں کی زبوں حالی کے لئے شریف طارق صاحب بھارتی سرکار اور فوج کو ذمے دار ٹھہرا رہے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ ہندوستانی فوج اور دیگر سیکورٹی ایجنسیوں نے وہاں ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ عصمت دری کے واقعات معمول

بن چکے ہیں۔ کشمیریوں کی جائیداد جلائی جارہی ہے۔ جبکہ خالد حسین کا کہنا تھا کہ کشمیر ایک مسئلہ ضرور ہے اور اسے صرف بات چیت سے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر کی وجہ سے تین جنگیں لڑی گئیں لیکن آخر میز پر بیٹھ کر اور بات چیت کے ذریعہ ہی امن قائم ہوا، لیکن ہندوستانی فوج 1990ء سے پہلے تو بیرکوں میں تھی اُسے دہشت گردی کو ختم کرنے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کی غرض سے بیرکوں سے باہر نکالا گیا اور جب فوج بیرکوں سے باہر آئی تو پھر اُس نے وہی کیا اور کر رہی ہے جو مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں پاک فوج نے کیا یا جو آج قانون کی حکمرانی قائم کرنے اور دہشت گردی کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لئے پاک فوج وزیرستان، صوات اور فاٹا میں کر رہی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ بھارتی فوج کئی بار ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال کرتی ہے اور اکثر ہیومنٹ رائٹس اور دوسرے بین الاقوامی ادارے اُس کے سخت نکتہ چینی بھی کرتے ہیں لیکن سیاسی اور عکسری زیادتیوں کا خمیازہ ہر جگہ خلقتِ خدا کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ فلسطین میں دیکھیں، شام اور عراق میں دیکھیں جہاں بڑی طاقتوں نے قہر برپا کیا ہوا ہے اور پھر وہی انسانی حقوق کی پامالی اور جمہوریت کی دُہائی دیتی رہتی ہیں۔ یہ دوغلہ پن آج کی ڈپومیسی کا المیہ ہے۔

رات ضلع انتظامیہ کی طرف سے دیئے گئے عشائیہ میں بھائی خالد حسین کے ساتھ، باجی نسیم، میری اور عاشق سلہریا کی فیملی بھی شامل ہوئی۔ میر پور ڈویژن کے سبھی ڈپٹی کمشنرز، جسٹس عبدالمجید ملک ایڈوکیٹ شریف طارق مرحوم، میر پور بار کونسل کے صدر ایڈوکیٹ ریاض انقلابی، ایڈوکیٹ منیر احمد اور میڈیا کے کچھ نمائندے بھی مدعو تھے۔ یہاں زیادہ تر ہندوستانی انتظام والے جموں وکشمیر کی انتظامیہ، منصوبہ بندی، صحت عامہ، تعلیم اور دیگر امور پر بات چیت ہوئی۔ خالد حسین بھائی نے اپنے تجربے سانجھے کئے، اور کئی غلط

فہمیاں دور کیں۔ 12/اپریل 2005ء کو میر پور پریس کلب کی طرف سے رکھے گئے ظہرانے میں بھائی خالد اور باجی نسیم نے شرکت کی۔اخبار روزنامہ ''مشرق''، ''جنگ'' اور ''خبریں'' کے مقامی مُدیران اور رپورٹروں نے خالد حسین کے انٹرویو لئے۔بھائی خالد نے بتایا کہ اُن کے جموں وکشمیر والے حصّے میں تعلیمی معیار بہت عمدہ ہے۔چھ یونیورسٹیوں کی کارکردگی یعنی، جموں، سرینگر، کٹڑہ، راجوری کے علاوہ اگر کلچر یونیورسٹی سرینگر اور جموں، اسلامیہ یونیورسٹی اونتی پورہ، سنٹرل یونیورسٹی جموں اور سنٹرل یونیورسٹی سری نگر کے علاوہ ہر ضلع میں میڈیکل کالج، ڈنٹل کالج اور انجینئرنگ کالجوں کے بارے میں تفصیل سے جانکاری دی۔اس کے علاوہ پانی، بجلی اور سڑکوں کی سہولیات کی تفصیل بتائی، لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں بھائی خالد حسین نے کہا کہ جموں وکشمیر میں 90 فیصد لڑکیاں پڑھی لکھی ہیں۔ہزاروں کی تعداد میں خواتین ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر، پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔اسی شام میر پور کی بار کونسل نے چائے پر مدعو کیا تھا۔وہاں بھی بھارت اور پاکستان کے رشتوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔1947ء اور 1965ء میں جموں، پونچھ اور راجوری سے ہجرت کر کے آئے ہوئے کئی لوگ بھائی خالد حسین کو ملنے کے لئے آئے۔وہ لوگ اپنے گھروں، محلوں اور رشتہ داروں سے متعلق معلومات حاصل کرتے رہے۔

اگلی صبح بھائی خالد حسین، باجی نسیم، عاشق بھائی اور میں راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئے اور باجی پروین کے ہاں ٹھہرے۔رات کے کھانے پر سبھی اسلام آباد میں محسن بیگ صاحب کے ہاں گئے۔بھائی خالد حسین کے سمبندھی فاروق بیگ جموں میں ریاستی کلچر اکادمی میں بحیثیت چیف لائبریرین ریٹائرڈ ہوئے۔اُن کے دو بڑے بھائی محمد یاسین بیگ مرحوم ریاستی انتظامیہ میں ڈپٹی کمشنر اور سیکریٹری رہے۔وہ اُردو کے بہت اچھے شاعر بھی

تھے اور بھائی خالد کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔ دوسرے بھائی محمد امین بیگ مرحوم بھی ریاستی انتظامیہ میں ضلعی سطح کے افسر تھے۔ جبکہ چار بھائی اور ایک بہن پاکستان میں رہتے ہیں۔ خالد بھائی کے چھوٹے بیٹے یاسر عمران کی شادی فاروق بیگ کی دُختر ثنا فاروق کے ساتھ ہوئی ہے۔ فاروق بیگ کے بعد پاکستان میں اُس سے چھوٹے بھائی کا نام جمیل بیگ ہے جو اسلام آباد میں رہتا ہے۔ اُس کے بعد محمود بیگ ہے جو مسقط میں مقیم ہے۔ پھر محبوب بیگ ہے اور سب سے چھوٹا محسن بیگ ہے جو پیشے سے صحافی ہے اور پاکستان کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اور اسلام آباد میں رہتا ہے۔

ان کی ایک بیوہ بہن جمیلہ اور اُس کی دو بیٹیاں اور بیٹا بھائی محسن بیگ کے ساتھ رہتے ہیں۔ محسن بیگ صاحب نے اپنی بہن اور اُس کے بچوں کی پرورش خلوص اور محبت سے کی اور اپنی ذمے داری کو بخوبی نبھایا۔ اُن کو پڑھایا اور روزگار کے قابل بنایا۔ تینوں بچوں کی شادیاں اچھے گھرانوں میں کرائیں۔ بہن جمیلہ ایک جہاندیدہ خاتون تھی اور بھائی محسن بیگ کے گھر کا نظم ونسق اُس کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ کینسر کی وجہ سے فوت ہوگئی۔ اللہ اُسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ خالد بھائی کی وہ بہت عزت کرتی تھی اور بیگ فیملی کا ہی ایک رُکن سمجھتی تھی۔ یہ سب بھائی اور اُن کی اولادیں ماشاءاللہ خوشحال زندگی گذار رہے ہیں۔ ہم سب نے اسلام آباد کی سیر کی۔ شکر پڑیاں اور فصیل مسجد کو دیکھا۔ خالد بھائی اکادمی آف لیٹرز کے دختر گئے۔ وہاں، پنجابی کے افسانہ نگار ملک مہر علی سے ملے اُنہوں نے کتابوں کا ایک سیٹ دیا جو پاکستان اکادمی آف لیٹرز کی مطبوعہ تھیں۔ اسلام آباد کی سیر کرنے کے بعد بھائی خالد حسین کا کہنا تھا کہ اسلام آباد یقینا ایشیا کا سب سے خوبصورت شہر ہے دوسری صبح باجی نسیم اور باجی پروین شاپنگ کے لئے راولپنڈی چلی گئیں اور میں بھائی خالد حسین کو لیکر ٹیکسلا چلا گیا جو راولپنڈی سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ

پر ہے اور قدیم گندھارا تہذیب کا دارالخلافہ تھا۔ ٹیکسلا سے ''سِکھوں کا مشہور تیرتھ استھان گورودوارہ ''پنجہ صاحب'' صرف 15 کلومیٹر دور حسن ابدال قصبے میں واقع ہے۔ ہم پہلے گورودوارہ پنجہ صاحب کی زیارت کو گئے۔ وہاں حاضری دی اور پھر واپس ٹیکسلا آ گئے اور گندھارا تہذیب کے آثار دیکھنے چلے گئے جو چند کلومیٹر دور تھے۔ وہاں ہم نے قدیم زمانے کی مشہور یونیورسٹی کے آثار دیکھے جہاں ملک بھر سے نوجوان تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ کھنڈرات میں بازار، محلات، سورج مندر، عورتوں کے زیورات، بڑے بڑے مرتبان، برتن، سِکّے، کھیتی باڑی کے اوزار اور بے شمار نادر اشیائے صرف دیکھیں۔ ان سب قیمتی چیزوں کو یکجا کر کے میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ میوزیم میں ایک دیوار کا حِصّہ بھی رکھا گیا ہے جس میں تین ہزار سال پُرانی اینٹیں اور پتھروں کا استعمال ہوا ہے۔ یہ دیوار اُس وقت کی ترجمانی کرتی ہے۔ میوزیم میں مہاتما بُدھ کی بیش قیمت مورتیاں ہیں۔ جن میں زیادہ تر پتھر سے تراشی ہوئی ہیں لیکن کچھ پیتل کی بھی ہیں۔ اُس وقت کی رائج پالی زبان اور رسم الخط میں بھوج پتروں، پیتل اور تانبے کی پلیٹوں پر لکھی تحریریں موجود ہیں۔ عورتوں کے گہنے بالکل آج کے رواج کے مطابق ہیں۔ میوزیم کے باہر ٹیکسلا سے متعلق معلوماتی کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ ٹیکسلا میں ہی پاکستان آرڈیننس فیکٹری بھی ہے جہاں ''الخالد'' اور ''الجرار'' جنگی ٹینک بننے کے علاوہ چھوٹی توپیں اور دوسرا فوجی اسلحہ تیار ہوتا ہے۔ اور جہاں چین اور پاکستان کی مشترکہ ہنرمندی سے تیار کیا گیا جنگی طیارہ جے، ایف۔ 17 تھنڈر پاکستان نے اپنے ہوائی بیڑے میں شامل کیا ہے۔ بھائی خالد نے گندھارا تہذیب سے متعلق دو کتابیں خریدیں اور پھر ہم واپس چکلالہ باجی پروین کے ہاں آ گئے۔

15/اپریل 2005ء کو بھائی خالد حسین، باجی نسیم اور میں ''ڈیوو بس سروس (Deowoo Bus Service) کی ائرکنڈیشن بس میں بیٹھ کر لاہور آ گئے۔ یہ بس بہت

عمدہ سروس دیتی ہے۔ بس میں ایک لیڈی بس ہوسٹس، سواریوں کو کولڈ ڈرنکس اور سنیکس سے تواضع کرتی ہے یہ بس ''موٹروے'' پر چلتی ہے جو لاہور سے پشاور اور کراچی تک جاتی ہے اور جسے شمالی کوریا کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ چھ لین کی اس سڑک کے دونوں طرف خاردار تاریں لگی ہیں تاکہ جانور یا آدمی سڑک پر نہ چل سکے۔ ''موٹروے'' پر گاڑیوں کی رفتار 120 کلومیٹر فی گھنٹہ سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ جس بس میں ہم بیٹھے تھے اُس نے لاہور تک 400 کلومیٹر کا سفر چار گھنٹے میں پورا کیا جس میں چائے پانی پینے کے لئے آدھے گھنٹے کا سٹاپ بھی تھا۔ لاہور میں ہم باجی نسیم فردوس کی خالہ رضیہ کے ہاں ٹھہرے جن کی کوٹھی گلبرگ سیکٹر III میں ہے۔ خالہ رضیہ نے باجی نسیم اور بھائی خالد حسین کے آنے کی اطلاع لاہور میں قیام پذیر جموں باسی عزیروں اور قرابت داروں کو پہلے سے دے رکھی تھی اور پھر شام ہوتے ہوتے وہاں جموں والوں کا ایک میلہ لگ گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو 1947ء کے قتلِ عام کے بعد جموں شہر اور دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اور الگ الگ شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔ بھائی خالد حسین اور باجی نسیم کو ملنے والے زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ تھے، جن کی عمریں 70 سال سے 80 سال کے درمیان تھیں۔ وہ سب جموں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کوئی پوچھتا کہ ''پُرانی منڈی'' اور ''سراجاں دی ڈھکی'' اب کیسی ہے۔ 'محلہ پیر مٹھا'، 'دلپتیاں محلہ'، 'افغان محلہ'، 'تالاب کھٹیکاں'، اور 'اُستاد محلے' کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اپنے گھروں کے بارے میں۔ اُن سیاہ دِنوں کی باتیں ہونے لگیں جب اُنھیں لاشوں پر سے گذر کر اپنی جان بچانے کے لئے سیالکوٹ آنا پڑا جو اُن کا اُس وقت پہلا پڑاؤ تھا۔ کچھ بزرگ، بیساکھی کے میلے، دسہرے، دیوالی اور لوہڑی کے میلوں کے بارے میں پوچھنے لگے کہ کیا اب بھی یہ میلے لگتے ہیں۔ سبھی بزرگ عورتیں اور مرد بھائی خالد سے کہہ رہے تھے کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار جموں جانا چاہتے ہیں

تا کہ اپنے گھروں اور اپنی مٹی کو چوم سکیں۔ وہ بھائی خالد سے کہنے لگے کہ وہ اُن کو جموں لے جائے۔ باجی نسیم نے جواباً کہا کہ وہ پاسپورٹ بنوائیں اور ویزا لیکر واگہ بارڈر تک آئیں۔ وہاں سے وہ خود اُنھیں جموں لائیں گے اور اپنا ذاتی مہمان بنائیں گے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور وہ بزرگ جموں دیکھنے کی حسرت لئے اس دُنیا سے چل بسے۔ 16 / اپریل کو باجی نسیم اپنے کزن زاہد قریشی، اُن کی اہلیہ کے ساتھ لاہور دیکھنے چلی گئی۔ میں اور بھائی خالد بھی اُن کے ساتھ تھے۔ پرُانا لاہور اور نیا لاہور دونوں انتہائی خوبصورت ہیں اور لاہور کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا''۔ باجی نسیم نے لاہور کی سیر کرنے کے بعد کہا تھا کہ ''یوں سمجھیں کہ وہ آج ہی پیدا ہوئی ہے اور خالد حسین ایک سال کے ہو چکے ہیں کیونکہ وہ پچھلے سال لاہور آ چکے تھے عالمی پنجابی کانفرنس میں حِصہ لینے کے لئے۔ پرُانے لاہور میں مزنگ، رام دئی ہسپتال، سرگنگا رام ہسپتال، دیال سنگھ کالج، باغِ جناح، لکشمی چوک، پوسٹ آفس جنرل، پنجاب یونیورسٹی کا اورینٹل کالج، داتا گنج بخش کا مزار، شاہی قلعہ، علاقہ اقبال کا مزار، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی، شادمان چوک، الحمرہ آڈیٹوریم، انارکلی بازار، جہانگیر کا مقبرہ، سائیں میاں میر اور صوفی شاعر شاہ حسین کی درگاہیں دیکھیں۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج اور کینگ ایڈورڈ میڈیکل کالج اور کئی فلم اسٹیڈیو، قومی سطح کے اخبارات کے دفاتر اور ٹیلی ویژن سنٹرز، مینارِ پاکستان، قدافی کرکٹ اسٹیڈیم وغیرہ کئی مشہور جگہوں پر گئے۔ جب کہ نئے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی، گلبرگ، ڈیفنس، ماڈل ٹاؤن، اقبال ٹاؤن، بحریہ ٹاؤن اور بے شمار نئی کالونیاں چوڑی سڑکیں، پانچ ستارا ہوٹل، دیدہ زیب عمارتیں، مال غرض ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا شہر لاہور دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ لاہور، لاہور ہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بھائی خالد اور میں بارویں عالمی پنجابی کانفرنس میں

شمولیت کے لئے پانچ ستارہ ہوٹل، ایمبسڈر، گئے۔ جو ڈیوس روڈ پر واقع ہے۔ وقت پر ویزا نہ ملنے کی وجہ سے ہندوستان سے کوئی بھی پنجابی ادیب عالمی کانفرنس میں حصہ لینے نہیں پہنچ سکا تھا۔ صرف بھارت سے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین سردار ترلوچن سنگھ اور کچھ پنجابی سکھ یاتری ہال میں بیٹھے تھے۔ جبکہ پورے پاکستان سے پنجابی ادیب، شاعر، آرٹسٹ اور دانشور بحیثیت ڈیلی گیٹ کانفرنس میں شامل تھے۔ امریکہ، انگلینڈ، جرمنی اور کینیڈا سے بھی ڈیلی گیٹ پہنچے تھے۔ منتظمین کی طرف سے بھائی خالد حسین کو ''ایمبسڈر'' ہوٹل کے کمرہ نمبر 9 میں ٹھہرایا گیا اور میں اُن کے ساتھ تھا۔

یہ عالمی پنجابی کانفرنس بھی ورلڈ پنجابی کانگریس کے چیئرمین اور مشہور ناول نگار فخر زماں صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ رات کو ''الحمرہ'' میں گیت سنگیت کا پروگرام تھا۔ جس میں پاکستانی پنجابی کے فنکاروں نے اپنی خوبصورت گائیکی کا رنگ جمایا۔ 17/اپریل 2005ء کو کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح سابق صدر پاکستان اور سابقہ چیف جسٹس پاکستان جناب رفیق تارڑ نے کیا۔ سب سے پہلے مشہور پنجابی شاعر مرحوم اعزاز احمد آذر کا لکھا اور مرحوم اُستاد شوکت علی کا گایا ہوا گیت پیش کیا گیا۔ جس میں دونوں پنجابوں میں بھائی چارہ اور ہند۔ پاک دوستی اور سرحدیں نرم کرنے کا ذِکر تھا۔ کانفرنس میں کئی پیپر پڑھے گئے اور پنجابی زبان وادب سے متعلق پاکستان میں پیش آنے والی مشکلات کو موضوع بنایا گیا تھا۔ پنجابی کو پرائمری سطح سے میٹرک تک سکولوں میں پڑھانے کی مانگ کی گئی تھی۔ 18/اپریل 2005ء پہلے سیشن میں بھائی خالد حسین کے پنجابی افسانوں کے مجموعے 'بلدی برف دا سیک'' (شاہ مکھی رسم الخط میں) کی رسم رونمائی ہوئی۔ یہ کتاب بعد ازاں چتیا پرکاشن لدھیانہ کے مالک اور خالد بھائی کے دوست ستیش گلاٹی نے گورومکھی میں شائع کی۔ اُس سیشن کی صدارت پاکستانی پنجاب کے وزیر تعلیم نے کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت

ہندوستان کے اقلیتی کمیشن کے چیئر میں سردار ترلوچن سنگھ نے اور تیسری نشست کی صدارت بھائی خالد حسین نے کی۔ کچھ قرار دادیں پاس کی گئیں جن میں دونوں ملکوں میں آنے جانے کی کھلی اجازت اور پاسپورٹ اور ویزا ختم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ نیز شادمان چوک کا نام بدل کر بھگت سنگھ چوک رکھنے کی مانگ کی گئی تھی۔ شام پانچ بجے پبلشر امجد سلیم اور مشہور پنجابی شاعر افضل ساحرؔ بھائی خالد کو لیکر ٹیمپل روڈ میں ''سانجھ'' کے دفتر لے گئے جہاں تقریباً تیس نوجوان ادیب اور شاعر جمع ہوئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پنجابی کے پروفیسر اور مشہور نقاد اور سرائیکی ادیب پروفیسر سعید بٹھا نے بھائی خالد حسین کا تفصیلی تعارف کرایا۔ افضل ساحرؔ نے ''بلدی برف دا سیک'' کتاب سے خالد حسین کی طرف سے لکھا ہوا مضمون ''کہے حسین فقیر سائیں دا'' پڑھ کر سُنایا۔ یہاں خالد بھائی نے اپنی نئی کہانی ''اِک مرے بندے دی کہانی'' پڑھ کر سنائی۔ نوجوان پنجابی ادیبوں، شاعروں اور سکالروں سے بات چیت کی۔ اُنہوں نے بھی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ بھائی خالد حسین بہت خوش تھے۔ اُن سب سے مِل کر۔ اُن کے چہرے پر رونق صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رات کو پھر تمدنی پروگرام الحمرہ میں تھا۔ جہاں شوکت علی ریشماں، ثُریا خانم، اقبال باہُو اور اُستاد حامد علی خان کے علاوہ ''فیویژن گروپ'' نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ 18/اپریل کو بھائی خالد حسین ایمبیسڈر'' ہوٹل سے خالہ رضیہ کے گھر گلبرگ میں آ گئے۔ دِن کو باجی نسیم کے موسیرے بھائی زاہد قریشی کے دفتر گئے جہاں اُن کی ملاقات زائد بھائی کے بزنس پارٹنر بھٹی صاحب سے ہوئی۔ اُن کے ساتھ دونوں ملکوں کی سیاست پر بات چیت ہوئی۔ دوپہر کا کھانا بھائی جاوید بٹ کے گھر کھایا۔ وہ بھی کشمیری النسل ہیں اور جموں سے ہجرت کر کے لاہور میں بس گئے تھے۔ اُن کی بھتیجی مریم، زاہد بھائی کی بہو ہے۔ زاہدؔ بھائی کی اہلیہ بہن گوگی بھی باجی نسیم کی خالہ زاد بہن ہے کیونکہ زاہد بھائی کی

ماں اور گوگی بہن کی ماں، دونوں سگی بہنیں تھیں۔ خالہ رضیہ کا بڑا بیٹا شاہد قریشی امریکہ میں رہتا ہے۔ دوسرا بیٹا طارق قریشی گلمرگ میں ہی رہتا ہے۔ اگلی صبح یعنی 19 راپریل کو بھائی خالد حسین، باجی نسیم فردوس اور میں لاہور سے گجرات کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ''مرید کے''، ''کالا شاہ کاکو''، ''کھڑک پنڈ داس''، ''گوجرانوالہ اور ایمن آباد کے شہر دیکھتے ہوئے ہم گجرات بھائی خالد حسین کے دوست ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کے ہاں ٹھہرے۔ وہ یوں تو امراض جلد کے ڈاکٹر ہیں لیکن پنجابی ادب سے جنون کی حد تک دلچسپی رکھتے ہیں۔ گاتے بھی خوب ہیں۔ اُن کی کئی کیسٹیں بنی ہیں۔ اُنہوں نے خالد بھائی کو اپنی نئی کیسٹ ''کچ دا گلاس'' پیش کی۔ کچ دا گلاس خالد حسین کے دوست ڈاکٹر سرُجیت پاتر کا لکھا ہوا گیت ہے جس کو گایا اور کمپوز بھی ڈاکٹر اظہر محمود نے ہی کیا تھا۔ میڈیکل سائنس سے تعلق رکھنے والے اور گجرات ڈسٹرکٹ ہسپتال کے سپرُنٹنڈنٹ ڈاکٹر اظہر محمود نے پنجابی میں پی ایچ، ڈی کی ہے۔

20 راپریل کی صبح ڈاکٹر اظہر محمود خالد بھائی خالد حسین کو لیکر پنجابی کے نامور شاعر اور نقاد پروفیسر شریف کنجاہی مرحوم کے گھر گئے جہاں اُنہوں نے ناشتہ کیا اور دونوں ملکوں کے پنجابی ادب پر گفتگو کی۔ پھر ڈاکٹر صاحب ہمیں تحصیل ''چیلیاں والا' کے اُس تاریخی میدان لے گئے جہاں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ بعد دوپہر ہم راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ''لالہ موسیٰ'، 'سرائے عالمگیر'، 'جہلم'، 'چکوال'، مندرا کے شہروں کو دیکھتے ہوئے باجی پروین کے ہاں چکلالہ پہنچے۔ رات اُن کے ہاں گذار کر اگلے دِن مظفر آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں بھائی خالد حسین کے لئے حکومت کی طرف سے ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں وزیر اعظم سکندر حیات خان کے سیاسی مُشیر سردار فاروق حیدر خان (جو موجودہ وزیر اعظم ہیں) خالد بھائی سے ملنے آئے اور اُنہوں

نے بتایا کہ جگدیش راج ٹنڈن کے بھائیوں کا پتہ چل گیا تھا اور وزیر اعظم صاحب نے خود اُن کی بات چیت ٹنڈن صاحب سے جموں میں کرائی ہے۔ وزیر اعظم صاحب کا فرمانا ہے کہ اگر جگدیش راج ٹنڈن آزاد کشمیر اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لئے آنا چاہتے ہیں تو وہ پرمٹ فارم بھریں۔ اُن کی حکومت 'انکو کلیرنس دے دے گی۔ 21/اپریل 2005ء کو میونسپل کارپوریشن مظفر آباد کی طرف سے بھارتی کشمیر کے مسافروں کو ناشتہ اور ظہرانہ کھلایا گیا۔ مظفر آباد ڈویژن کے کمشنر نے بھائی خالد کو چاندی کی ایک یادگاری شیلڈ دی۔ بعد دوپہر باجی نسیم بھائی خالد حسین اور میں مرزا غلام رسول بیگ سے ملنے اُن کے گھر گئے جو دریائے کشن گنگا (نیلم) کے کنارے تعمیر ہوا تھا۔ یہ مکان دومیل (جہاں نیلم اور جہلم ملتے ہیں) کے بالکل قریب تھا۔ غلام رسول بیگ بھائی خالد حسین کے سمبندھی فاروق بیگ کا تایازاد بھائی تھا جو 1947ء کی شورش میں جموں سے بھاگ کر مظفر آباد میں آباد ہو گیا تھا۔ اُسے ملنے کی تاکید فاروق بیگ کے بڑے بھائی یاسین بیگ مرحوم نے کی تھی۔ بھائی غلام رسول بیگ بیمار تھا لیکن جب اُنھیں بتایا گیا کہ جموں سے مہمان آئے ہیں تو وہ بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ وہ جموں میں اپنے دوستوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ رشتے داروں کا حال احوال پوچھنے لگا۔ مشہور ڈوگری شاعر دینو بھائی پنت کے بارے میں اور اپنے بچپن کے دوست ذوالفقار جعفری کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اُس نے دینو بھائی پنت کی مشہور ڈوگری نظم سنائی۔ بعد ازاں پوچھنے لگا کہ جموں میں کوئی خالد حسین رہتا ہے۔ وہ ریڈیو کشمیر جموں سے کہانیاں پڑھتا ہے اور اُسے خالد صاحب کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اُن کو سلام کہیئے گا۔ جب بھائی خالد حسین نے بتایا کہ جس خالد کی آپ بات کر رہے ہیں وہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے تو وہ خالد بھائی کے گلے لگ گیا اور ہاتھ چومنے لگا۔ ملاقات بہت دلچسپ رہی۔ 22/اپریل کو ہندوستانی انتظام والے کشمیر

کے مسافروں کی واپسی تھی اور حکام ضروری انتظام کررہے تھے۔ بھائی خالد حسین کو مجاہد اول کہے جانے والے آزاد کشمیر کے سابقہ وزیر اعظم اور مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے ناشتہ پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ ہم اُن کے ہاں گئے۔ وہاں وہ بھائی خالد حسین سے مخاطب ہوئے۔

''میں اب عمر کے اُس حصے میں داخل ہو چکا ہوں جہاں کسی بھی وقت زندگی کا چراغ گل ہوسکتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کشمیر کے مسئلے کا حل اُن کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے ہوجائے۔ ہندوستان اور پاکستان کی سرکاریں اِس مسئلہ کا جو بھی متفقہ حل تلاش کرتی ہیں، مجھے اور میری پارٹی کو وہ منظور ہوگا۔ میرا یہ پیغام آپ کشمیر کے لیڈروں کو ضرور دیں۔''

اُن کی باتیں سُن کر بھائی خالد حسین نے کہا کہ اُن کا کسی کشمیری لیڈر خصوصاً حریت والوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ البتہ وہ آپ کا پیغام جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید صاحب تک پہنچادیں گے۔ 11 بجے مسافروں کی بس چکوٹی اور کمان پُل کے لئے روانہ ہوئی، مظفر آباد کی انتظامیہ، میونسپل کارپوریشن کے صدر اور دیگر معزز شخصیات نے بھائی خالد حسین اور دیگر مسافروں کو الوداع کہا۔ بس میں بھائی خالد کے ساتھ مظفر آباد کے نوجوان ڈپٹی کمشنر چوہدری عبداللطیف بھی کمان پُل تک آئے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو بریگیڈئر عطا حسنین نے بہت خوبصورت اور پیارے سے ڈپٹی کمشنر کو چائے پی کر جانے کے لئے کہا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کمان پُل کے پار لے آئے جہاں بھارتی فوج نے مہمانوں کے لئے چائے کا بندوبست کیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر مظفر آباد چائے پی کر واپس چکوٹی کی طرف چلے گئے۔ بریگیڈئر عطا حسنین اُسے پُل پار تک چھوڑنے گئے۔ میں یعنی تصور حسین سلہریا بھی

مظفر آباد واپس آ گیا اور دوسرے دِن اپنے دُفتر (Text Book Deptt.) میں حاضر ہوگیا۔ کچھ دِنوں بعد بھائی خالد حسین کا جموں سے فون آیا اور اُنہوں نے بتایا کہ کمان پُل سے اُن کا قافلہ ''کاروانِ امن'' بس میں اُوڑی پہنچا جہاں اُن کے لئے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا اور شام سات بجے وہ سرینگر پہنچ گئے تھے۔ کشمیر کے اُس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس جناب جاوید مخدومی نے اُنھیں سرینگر کے پولیس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور دوسرے دن وہ جموں کے لئے روانہ ہوکر 6 بجے شام اپنے گھر پہنچ گئے تھے۔

چار پانچ دنوں کے بعد پھر اُنہوں نے فون کیا اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد بتایا کہ وہ وزیراعلیٰ مفتی محمد سعید سے ملے اور اُن کو پاکستانی انتظام والے کشمیر کے دورہ کی تفصیل سنائی۔ اور سردار قیوم خان صاحب سے ملاقات کا بتایا اور اُن کا پیغام بھی دیا۔ پھر اُنہوں نے جگدیش راج ٹنڈن کے ساتھ فون پر بات کی تو وہ فوراً خالد بھائی سے ملنے اُن کے گھر آگئے۔ ٹنڈن صاحب بہت خوش تھے۔ ان کے بھائی تو فوت ہو چکے تھے لیکن بھتیجے، بھتیجیوں اور اُن کے بچوں کے ساتھ بات چیت ہوئی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ اُن کے رشتے دار بہت امیر ہیں۔ کچھ بیرونِ ملک، انگلینڈ، امریکہ اور فرانس میں رہتے ہیں اور کچھ اسلام آباد لاہور اور کراچی میں مقیم ہیں۔ پھر ٹنڈن صاحب نے بھائی خالد حسین سے گذارش کی کہ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اُن کی مدد کی جائے۔ بھائی خالد نے جگدیش راج ٹنڈن، اُن کے بیٹے اور بھائی بستی رام کے پرمٹ بنوانے میں اُن کی بھرپور مدد کی۔ تین مہینے کے بعد بھائی خالد حسین کا پھر فون آیا اور اُنہوں نے بتایا کہ جگدیش راج ٹنڈن اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ اپنے آبائی وطن ''ہٹیاں دوپٹہ رشتے داروں سے ملنے گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پورے پاکستان سے اُن کے رشتے دار اُنھیں ملنے آئے تھے۔ پورے قصبہ کو جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا اور سب کو کھانے کی دعوت پر بلایا

گیا تھا۔ جشن کا سا سماں تھا، لیکن دوسرے دِن یعنی 8/ اکتوبر 2005 کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے خوفناک زلزلہ آیا جس میں بالاکوٹ اور مظفر آباد کا 90 فیصد حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ مکانات زمین بوس ہو گئے تھے سڑکوں کا نام و نشان مٹ گیا تھا ایک لاکھ سے زائد انسان موت کا شکار ہو گئے تھے۔ بستی رام اپنے ہی آبائی مکان کے نیچے دب کر مر گیا تھا جگدیش راج اور اُس کا بیٹا زخمی ہو گئے تھے۔ مقامی لوگوں نے اُنھیں بچایا اور بستی رام کا کِریا کرم کیا۔ جگدیش راج اور اُس کے بیٹے کو ہیلی کاپٹر کے ذریعہ اسلام آباد کے ملٹری ہسپتال میں علاج کے لئے رکھا گیا دو مہینے کے بعد اُن کو بذریعہ ہیلی کاپٹر واہگہ بارڈر لایا گیا اور لواحقین کے حوالے کیا گیا۔ جگدیش راج ٹنڈن اُس کا بیٹا مکمل صحت یاب ہو چکے ہیں۔ جگدیش راج کی آپ بیتی سے ہی متاثر ہو کر بھائی خالد حسین نے ''لکیر'' نام سے ایک کہانی لکھی تھی جس پر بعد ازاں پوٹھواری کی پہلی فلم بنائی گئی۔ منظر نامہ علی عدالت نے لکھا تو ہدایات شِو دت مرحوم نے دیں۔ اس فلم نے سلور جوبلی منائی اور جموں و کشمیر کے سبھی پوٹھواری یا پہاڑی بولنے والے علاقوں میں دِکھائی گئی۔

انسان میں حیوان یہاں بھی وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی وہاں بھی
ہندو بھی سکوں سے ہے، مسلماں بھی سکوں سے
انسان پریشاں یہاں بھی وہاں بھی

(ندا فاضلی)

کل یُگ کے فرشتے

اِک تم کہ تم کو فکرِ نشیب وفراز ہے
اِک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے
(کیفی اعظمی)

1985ء میں جب خالد حسین کو جالندھر سے تبدیل کر کے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ سے اٹیچ کیا گیا تو اُس نے چیف سیکریٹری صاحب کو درخواست دی اور عرض گذاری کہ اُسے اپنے آبائی محکمے میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ خالد حسین کو اُس کے پُرانے محکمے 'دیہی ترقی' میں بھیج دیا گیا تا کہ اُس کی اگلی پوسٹنگ ہو۔ کافی عرصہ انتظار کرنے اور بار بار التماس کرنے کے باوجود اُس کو اپنے گریڈ کے مطابق عہدہ دینے سے کمشنر صاحب انکار کرتے رہے۔ اُن کا اعتراض تھا کہ دو سال پہلے تک خالد حسین بلاک ڈیولپمنٹ افسر تھا اور سب سے جونیئر۔ اب تمام سینئر بلاک افسروں کی حق تلفی کر کے اُسے کیسے ضلعی سطحی کا افسر بنایا جائے جبکہ خالد حسین کا اصرار تھا کہ اُسے سرکار نے ضلعی سطح کا گریڈ دے کر جالندھر بھیجا تھا لہٰذا اُسے نئے گریڈ کے مطابق عہدہ دیا جائے جسکا وہ حق دار ہے۔ خالد کبھی کمشنر کے سامنے تو کبھی متعلقہ وزیر کے آگے پیش ہوتا اور حق مانگتا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں تقریباً دو مہینے گذر گئے تھے۔ ایک دِن جب وہ مایوسی کے عالم میں متعلقہ وزیر کی کوٹھی کے لان میں بیٹھا تھا تو اُس کا دیرینہ واقف کار چپڑاسی عبدالرحمن اُسے ملا، جس نے مرزا افضل بیگ کے دورِ اقتدار میں خالد حسین کے ساتھ کام کیا تھا اور جواب وزیر موصوف کا

جمعدار تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ''کب تک جوتیاں توڑتے رہو گے۔ یہاں ایسے کام نہیں ہوتا۔ تم ایسا کرو کہ کل شام چھ بجے صاحب کی کوٹھی پر آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا اور صاحب سے خود ملاؤں گا۔ پھر دیکھنا تمہارا کام کیسے نہیں ہوتا۔ ہاں! آتی بار صاحب کے لئے مٹھائی کے طور پر دس ہزار روپئے ضرور لیتے آتا۔'' جب خالد حسین گھر لوٹا تو بڑا پریشان تھا۔ اُس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی پھر دس ہزار روپے کہاں سے لاتا۔ اسی اثنا میں اُس کے بچپن کا دوست اور ایکسائز ٹیکسیشن افسر ناصر حسین قریشی خالد حسین کو ملنے کے لئے آیا۔ ناصر قریشی نے خالد کے چہرے کو غور سے دیکھا تو سمجھ گیا کہ تو بڑا اچڑھا ہوا ہے۔ مایوسی اور پریشانی کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اُس نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے تو خالد حسین کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ کہنے لگا۔

یار! کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ پچھلے دو مہینوں سے اپنی پوسٹنگ کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ کبھی کمشنر کے پاس تو کبھی منتری کے پاس جا جا کر میرے جُوتے گِھس گئے ہیں لیکن کوئی سُنتا ہی نہیں۔ گُل شاہ کی حکومت ہے اور ہر وزیر اپنا مونہہ کھول کر بیٹھا ہے۔ بغیر پیسے کے کوئی کام ہونا ناممکن ہے۔ اب کل وزیر موصوف کا جمعدار مجھے کہنے لگا کہ اگر پوسٹنگ کرانی ہے تو دس ہزار روپئے لیکر کل شام وزیر صاحب کی کوٹھی پر آ جاؤ۔ وہ مجھے صاحب سے ملائے گا اور تمہارا کام ہو جائے گا۔ اب میں پریشان ہوں کہ دس ہزار روپئے کہاں سے لاؤں۔''

خالد حسین کی حالتِ زار دیکھ کر ناصر حسین قریشی اُٹھا اور کہنے لگا،

تم فکر نہ کرو۔ ابھی تمہارا دوست زندہ ہے۔ میں ابھی گھر سے رقم لے کر آتا ہوں۔ تم کل منتری کے پاس جاؤ گے۔ اور اپنی پوسٹنگ کرا کے آؤ گے۔''

''اگر کام نہ ہوا تو میں تمہاری رقم کیسے واپس کروں گا۔''

''رقم جائے باڑھ میں۔ تم اپنی پوسٹنگ کراؤ۔ میں کبھی اپنی رقم کا تقاضا نہیں کروں گا۔''

چنانچہ دوسرے روز وقتِ مقررہ پر خالد حسین وزیر کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ عبدالرحمن اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ خالد نے رقم عبدالرحمن کے حوالے کی۔ وہ خالد حسین کو وزیر صاحب کے بیڈ روم میں لے گیا جہاں وزیر محترم ایک ہاتھ سے نمکین چائے نوش فرما رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ٹانگ کی کھجلی کھُجا رہے تھے۔ عبدالرحمن بڑی بے تکلفی سے اپنے صاحب سے مخاطب ہوا۔

''اس کا نام خالد حسین ہے۔ یہ نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ کا پی، اے رہا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کام کیا ہے۔ بیگ صاحب کے بُرے دِنوں میں اِس نے اُن کی بہت خدمت کی تھی۔ خالد حسین چڑھتے سورج کو نہیں بلکہ ڈوبتے سورج کو سلام کرتا ہے اور تب تک اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتا جب تک کہ اُس کی سانسوں کی ڈور نہیں ٹوٹتی۔ یہ آپ کی بھی خدمت کرے گا۔ کرسی ہمیشہ نہیں رہتی آج خالد حسین کے کام آؤ۔ کل یہ تمہارے کام آئے گا۔ اس کو ڈسٹرکٹ پنچایت افسر، اے، سی، ڈی یا پروجیکٹ افسر ڈسٹرکٹ رورل ڈیولپمنٹ ایجنسی بناؤ، اور یہ لو۔ مٹھائی۔ اِس غریب کے پاس آپ کو دینے کے لئے اور پیسے نہیں ہیں۔ جب کمائے گا تو سب سے پہلے آپ کی خدمت کرے گا۔''

دس ہزار کی رقم عبدالرحمن نے وزیر صاحب کے ہاتھ میں دی۔ صاحب نے دونوں کی تواضع نمکین چائے اور کشمیری کلچے سے کی۔ اور یقین دلایا کہ چند روز کے اندر اندر خالد حسین کا آرڈر جاری ہوجائے گا۔ خالد حسین نے گھر آکر ساری بات ناصر حسین قریشی اور مجھے بتائی۔ میں بھی اُس کے بچپن کا لنگوٹیا یار ہوں اور ہمیشہ اُس کے سامانِ حرب کا مہلک ہتھیار رہا ہوں اور میرا نام محمد اشرف خان ہے۔ میں حسبی نسبی افغانی پٹھان ہوں۔ ہمارے اجداد ڈوگرہ مہاراجوں کی فوج میں سپاہی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگجوانہ صلاحیتیں میرے خُون میں رچی بسی ہیں۔ اِسی وجہ سے میں لڑکپن اور جوانی کی معرکہ آرائیوں میں خالد حسین کے ہراول دِستے کا سالار رہا کرتا تھا۔ خیر میں تو بات اپنے یار کی کر رہا تھا لیکن اپنا تعارف کرانا بھی لازمی تھا۔ دو چار دِن، دو چار ہفتوں کی مسافت بھی طے کر گئے تھے لیکن پوسٹنگ کا حکم نامہ جاری نہیں ہوا۔ اتنے میں دربامُوٗ ہوگیا اور دفاتر جموں سے سرینگر منتقل ہوگئے۔ خالد حسین، ناصر قریشی کو ساتھ لیکر سری نگر پہنچ گیا۔ ایک دن وہ اپنے ایک دوست شجیع احمد کے اصرار پر رات گذارنے کے لئے اس کے گھر گلاب باغ گیا۔ صبح جب وہ سڑک پر بس کا انتظار کر رہا تھا تو وہاں سے ایک سرکاری کار گذری جو گاندربل سے آرہی تھی۔ تھوڑا سا آگے چل کر کار رُک گئی اور ڈرائیور اُسے پیچھے کی طرف موڑنے لگا۔ کار خالد حسین کے پاس آکر رک گئی۔ کار میں وہی وزیر صاحب بیٹھے تھے۔ جنہوں نے خالد کی پوسٹنگ کرنی تھی۔ یہ پوچھنے پر کہ وہ سڑک پر کیوں کھڑا ہے تو خالد حسین نے وزیر صاحب سے کہا کہ وہ بس کا انتظار کر رہا ہے تا کہ سیکریٹریٹ جاسکے۔ وزیر موصوف نے اُسے کار میں بٹھالیا۔ راستے میں دونوں باتیں کرنے لگے۔ منسٹر صاحب کہنے لگے۔

"تمہارے کام میں میرا کمشنر اڑچن ڈال رہا ہے۔ وہ تمہیں کیڈر پوسٹ دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔ جبکہ میں نے مِسل پر لکھ دیا

ہے کہ خالد کو ڈسٹرکٹ پنچایت افسر لگایا جائے۔ اس پر خالد حسین
نے کہا ''آپ کس قسم کے منسٹر ہیں کہ ایک کمشنر آپ کا حکم نہیں مان
رہا۔ میں جب بیگ صاحب کا پی، اے تھا تو سبھی کمشنر سیکریٹری اُن
سے تھر تھر کانپتے تھے۔ کسی کی کیا مجال جو اُن کی حکم عدولی کرے۔
چیف سیکریٹری اکثر احتراماً اُن کے کمرے کا دروازہ خود کھولتا تھا۔
جبکہ آپ لوگوں کی کوئی بات تک نہیں سنتا۔ سیکریٹری یا کمشنر بنیادی
طور پر ایک مشیر یا بڑا کلرک ہوتا ہے۔ جس کا کام صرف رائے دینا
ہوتا ہے۔ وزیر کے فیصلے کی حکم عدولی کرنا نہیں۔''

خالد حسین کی باتیں سن کر وزیر صاحب خاموش ہو گئے تھے لیکن اُن کا چہرہ غُصے سے
لال ہو چکا تھا۔ سیکرٹریٹ پہنچتے ہی اُنہوں نے محکمہ دیہی ترقی کے کمشنر کو بلایا اور بڑے رعب
سے کہا کہ وہ خالد حسین کا آرڈر کیوں نہیں نکال رہے۔ کمشنر صاحب نے پھر اپنی بات
دُہرائی کہ وہ خالد حسین کو کیڈر پوسٹ پر نہیں لگا سکتے۔ البتہ نان کیڈر پوسٹ پر لگانے کو تیار
ہیں۔ وزیر صاحب نے کہا تو پھر اُسے پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی اے لگائیں۔ کمشنر
صاحب اُس پر تیار ہو گئے اور کہا کہ وہ فائل منظوری کے لئے ابھی آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔
وزیر موصوف نے پرپوزل منظور کیا اور مِسل واپس کمشنر کو بھیج دیں۔ چنانچہ اُسی روز خالد
حسین کا آرڈر بحیثیت پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی، اے پونچھ جاری ہوا۔ ابھی پونچھ میں
تعینات ہوئے اُسے ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ منتری صاحب نے اُسے فوراً جموں
بُلایا۔ دوسرے دِن جموں میں وہ اُن کی سرکاری کوٹھی پر پہنچا تو وزیر صاحب نے اُس کے
ہاتھ میں پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی اے ڈوڈہ کا آرڈر تھما دیا۔ جب خالد حسین نے
ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے۔

''اوے ڈوگرے ڈنگر! پونچھ میں صرف پانچ بلاک ہیں جبکہ ڈوڈہ میں 14 بلاک ہیں۔ جاؤ، فوراً جا کر جائن کرو۔ اپنے لئے بھی روٹیاں بناؤ اور میرے لئے بھی۔ بعد ازاں عبدالرحمن جمعدار سے خالد حسین کو معلوم ہوا کہ وزیر صاحب نے امر سنگھ نام کے ایک افسر سے پونچھ پوسٹنگ کے لئے اتنی زیادہ مٹھائی وصول کی تھی کہ خالد حسین کا پونچھ سے جانا یقینی تھا۔

خالد حسین نے مجھے ایک اور وزیر شاہ صاحب کے آشیرواد اور پرشاد کی کہانی بھی سنائی تھی جو میں قارئین کی دلچسپی کے لئے بیان کرنے جا رہا ہوں۔ ہوا یوں کہ جموں وکشمیر میں چھ سال تک لگاتار گورنر راج اور صدر راج کے بعد مرکزی سرکار نے فیصلہ کیا کہ ریاست میں انتخابات کرائے جائیں۔ خالد حسین اُس وقت ڈپٹی ڈائریکٹر اسسٹنٹ جموں تعینات تھا۔ ایک دن اُس کے پاس ضلع ڈوڈہ کے ڈپٹی کمشنر سدھنشو پانڈے (آئی، اے، ایس) آئے اور کہنے لگے کہ الیکشن ہونے جا رہے ہیں اور خالد حسین کی ضلع ڈوڈہ میں اشّد ضرورت ہے کیونکہ وہ ایک تجربہ کار افسر ہے اور ضلع ڈوڈہ میں بطور ریٹرنگ افسر 1987ء میں الیکشن کروا چکا ہے۔ لہٰذا اُس کی پھر ضرورت ہے۔ اُنہوں نے خالد حسین سے وعدہ کیا کہ انتخابات کے بعد اُسے مند پسند پوسٹینگ دی جائے گی۔ چنانچہ 1996ء میں الیکشن ہوئے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ صاحب تیسری بار اقتدار میں آ گئے لیکن خالد حسین کی پوسٹنگ میں تاخیر ہوتی گئی۔ پانڈے صاحب مرکز میں چلے گئے اور کمشنر یُوگھوش انتقال کر گئے تھے لہٰذا خالد سے کیا گیا وعدہ وفا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے اپنی پوسٹنگ کے لئے بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک دِن خالد حسین کے پاس اُس کا ایک پنجابی ادیب دوست دلیپ سنگھ آیا جو پراپرٹی ڈیلر تھا۔ اُس نے خالد سے کہا کہ تالاب تلو میں ایک آشرم ہے۔ وہاں پولیس اور انتظامیہ کے بڑے بڑے افسران سوامی جی کے پروجن سُننے اور اُن کا آشیرواد لینے آتے رہتے ہیں۔ چھوٹی بڑی عدالتوں کے جج صاحبان اور سیاست دان بھی

آتے ہیں اور اپنی مُرادیں پاتے ہیں۔ سوامی جی کے پاس شاہ صاحب نام کا ایک وزیر ہر اتوار کو سوامی جی کے پروچن سُننے کے ساتھ ساتھ آشیرواد اور پرشاد لینے آتا ہے۔ اصل میں پرشاد کے ٹوکرے میں رنگدار کاغذوں کی تہہ کے نیچے بھاری رقم ہوتی ہے جو سوامی جی لوگوں کے کام کروانے کے عوض لیتے ہیں اور اپنی کمیشن کاٹ کر باقی رقم وزیر صاحب کو پرشاد کے ٹوکرے میں رکھ کر دے دیتے ہیں کسی کو شک بھی نہیں ہوتا اور لوگ وزیر موصوف کی سوامی بھگتی اور سیکولر ذہن کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ وہ خالد حسین کو سوامی سے ملانے تالاب تلو کے آشرم لے گیا۔ اُس نے سوامی جی سے کہا کہ ''یہ میرا دوست ہے اور ڈائریکٹر لوکل باڈیز جموں لگنا چاہتا ہے۔ آپ اس کا کام کرا دیں۔ جو خدمت ہوگی وہ کر دیں گے۔'' خالد حسین کو باہر بٹھا کر سوامی جی دلیپ سنگھ کو اپنے کمرے میں لے گئے اور جب اُس نے یقین دلایا کہ فکر والی کوئی بات نہیں خالد حسین کسی سے کچھ نہیں کہے گا تو اُنہوں نے کہا کہ وہ اتوار کے روز خالد حسین کو لیکر آشرم آ جائے۔ ساتھ میں ایڈوانس کے طور پر 50 ہزار روپئے بھی لائے۔ مقررہ دِن پر دلیپ سنگھ خالد حسین کو لیکر آشرم پہنچا اور رقم سوامی جی کے حوالے کی، تو انہوں نے کہا کہ انتظار کریں۔ تین بجے منتری جی آئیں گے تو سفارش کروں گا، پر یہ کس پوسٹ پر لگنا چاہتا ہے، تو دلیپ سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

''سواجی جی! منتری جی کے محکمے میں ڈائریکٹر لوکل باڈیز جموں کی آسامی خالی ہے۔ خالد حسین وہاں لگنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ کام ہو جائے گا'' اور پھر دونوں کو انتظار کرنے کیلئے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ پورے تین بجے کیبنٹ منتری شاہ صاحب کی کار آشرم گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ سوامی جی نے منتری جی کا سواگت کیا اور اُن کو لیکر ایک خصوصی کمرے میں لے گئے۔ پھر سوامی جی ایک ایک کر کے اسامیوں کو بُلانے لگے۔ جب خالد حسین کو بُلایا گیا اور وہ کمرے کے اندر داخل ہوا تو وزیر موصوف خالد کو دیکھ کر اپنی

کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سوامی جی سے کہنے لگے کہ آپ نے کِس بلا کو بُلایا ہے۔اس کے پیسے واپس کریں۔آپ نہیں جانتے کہ یہ مجھے ہر جگہ بدنام کردے گا۔اس کے بے شمار صحافی دوست ہیں۔پھر وہ خالد حسین سے مخاطب ہوئے اور بولے کہ اُس کا کام ہوجائے گا لیکن خدا کے واسطے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ 5 بجے کے قریب سوامی جی کا ایک سیوادار پرشاد کا ٹوکرا لیکر کمرے سے نکلا ٹوکرا بالکل اُسی طرح سجایا گیا تھا جس طرح سے دلیپ سنگھ نے خالد کو بتایا تھا۔سیودار نے پرشاد والے ٹوکرے کو کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ ٹوکرے کو سیٹ سے گرنے نہ دے۔ کیونکہ اُس میں لکشمی دیوی بھی تھی اور اُس کا پرشاد بھی۔

اب خالد حسین اس انتظار میں تھا کہ کب ڈائریکٹر لوکل باڈیز کا آرڈر نکلتا ہے اور وہ نئی پوسٹ پر حاضر ہوتا ہے۔ایک ہفتے کے بعد گورنمنٹ آرڈر نکلا لیکن کسی اور کا۔خالد حسین کا نہیں۔ خالد حسین نے دلیپ سنگھ کو فون کیا اور کہا کہ سوامی جی سے اُس کے پیسے واپس دِلائے جائیں۔ دلیپ سنگھ اور خالد حسین دونوں آشرم پہنچے اور رقم واپسی کا تقاضا کرنے لگے۔ چار پانچ چکر لگانے کے بعد سوامی نے چالیس ہزار روپئے واپس کردیئے اور دس ہزار روپئے آشرم کے چندے کے طور پر رکھ لئے۔ خالد حسین نے شکر کیا کہ گنگا گئی ہڈیاں واپس مِل گئیں۔کچھ دیر بعد یہ قصہ خالد حسین نے اپنی ایک دوست پروفیسر انجلی ٹھُسو کو سنایا تو وہ آگ بگولا ہوکر سوامی کو گالیاں دینے لگی اور کہنے لگی کہ سوامی کے بھیس میں وہ پکا حرامی ہے۔اُس نے میری بُوا کو پچھلے سولہ سال سے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہے اور اُس کی شادی نہیں ہونے دی۔وہ آج بھی آشرم میں رہتی ہے اور اُسے شردھالو ماتا جی کہہ کر بُلاتے ہیں کیونکہ آشرم کا سارا نظم ونسق اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد خالد حسین کو انشورنس، جی پی فنڈ اور گریجوٹی کا کافی پیسہ ملا۔تو

اُس نے بٹھنڈی میں ایک پراپرٹی ڈیلر اشوک کمار گپتا سے ایک مکان کا سودا کیا جس کا ڈھانچہ تو مکمل تھا لیکن پلستر اور کھڑکیاں اور دروازوں کا کام چل رہا تھا۔ مکان کا سودا 30 لاکھ میں طے ہوا۔ اُس نے خالد حسین سے کہا کہ اگر وہ آدمی رقم ایڈوانس میں دے دیں تو وہ دو مہینوں کے اندر اندر مکان کا قبضہ دے دے گا خالد حسین نے اُسے تین قسطوں میں چیکوں کے ذریعے 18 لکھ روپئے دیئے اور باقاعدہ دستخط شدہ ہنڈیاں حاصل کیں اور الگ سے اسٹامپ پیپر پر بھی رسید لی۔ اِسی طرح اپنے دوست سردار عجب سنگھ کے ساتھ مل کر گوگو کالونی ہمہامہ سرینگر میں ایک کنال کا پلاٹ 28 لاکھ میں خریدا۔ آدمی رقم خالد حسین نے ادا کی اور آدھی عجب سنگھ وزیر نے۔ سرینگر والا پلاٹ کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی گوگو کے چیئر مین نذیر احمد ڈار سے خریدا گیا۔ رجسٹری کرانے کیلیئے کاغذات مکمل کر لئے گئے۔ فریقین نے اسٹامپ پیپر پر دستخط کر دیئے ایک کنال پلاٹ کا نمبر 251 تھا۔ لیکن حزب المجاہدین کے نوجوان کمانڈر برہان وانی کی ٹاسک فورس کے ہاتھوں ہلاکت کی وجہ سے وادیٔ کشمیر میں حالات خراب ہو گئے۔ لوگ سڑکوں پر آ گئے۔ کرفیو لگ گیا اُن حالات میں عجیب سنگھ اور خالد حسین جموں آ گئے۔ سات آٹھ مہینے کے بعد جب خالد حسین سرینگر گیا تو پتہ چلا کہ اُن کا پلاٹ کسی اور کو بیچ دیا گیا ہے اور اُنھیں دوسرا پلاٹ دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اسی دوران عجب سنگھ کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر جیل بھیج دیا گیا۔ تین سال کے بعد عدالت کا فیصلہ آیا۔ عجب سنگھ بری ہو گیا۔ نذیر احمد ڈار نہ تو زمین کا پلاٹ دے رہا تھا اور نہ ہی رقم واپس کر رہا تھا۔ جب ہم سرینگر جاتے تو وہ غائب ہو جاتا۔ اس نے نہ جانے کتنے لوگوں کو دھوکہ دیا تھا۔ عجب سنگھ نے پولیس کے ایک واقف کار آئی، جی، پی سے بات کی۔ اُس نے نذیر احمد ڈار کو تھانے میں بند کرایا۔ اُس کی سکارپیو ضبط کر لی۔ اس طرح عجب سنگھ نے اپنی رقم نذیر احمد ڈار اُس سے نکلوالی۔ اب خالد حسین پھنس گیا۔ تمام کوششیں رائیگاں ہو گئیں۔

آخر یہ معاملہ خالد کی وفات کے بعد ختم ہو گیا۔ جبکہ جموں والے مکان کے لئے اشوک کمار گپتا کو دی گئی رقم میں سے دس لاکھ کی وصولی تو ہو گئی جبکہ باقی کی رقم ڈوب گئی۔

محمد اسلم قریشی (ریٹائرڈ آئی، اے، ایس) خالد حسین کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں نے میٹرک لگ بھگ ساتھ ساتھ کی تھی۔ وہ لجسلیٹو کونسل میں کلرک بھرتی ہو گیا اور خالد محکمہ دیہات سُدھار میں۔ خالد حسین نے دورانِ کلرک ادیب فاضل کا امتحان پاس کر لیا اور بی، اے کی تیاری کرنے لگا تو ایک دن اُسے اسلم قریشی نے کہا کہ وہ بھی آگے پڑھنا چاہتا ہے۔ خالد حسین نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ بھی ادیب کامل یا فاضل کا امتحان دے کر پھر بی، اے پاس کر لے تا کہ ترقی کے راستے کھل جائیں۔ سو محمد اسلم قریشی نے نہ فقط بی، اے کا امتحان پاس کیا بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی اور پھر قسمت کے دھنی اس دوست نے کشمیر ایڈ منسٹریٹو سروس کا امتحان بھی پاس کر لیا اور بہت سے اہم عہدوں پر کام کیا۔ ایک بار وہ خالد سے کہنے لگا کہ اُس کے چھوٹے بھائی محمد افضل قریشی کو بلاک افسر بنانے میں خالد اُس کی مدد کرے۔ خالد حسین اُس کو لیکر متعلقہ وزیر صاحب کے پاس لے گیا۔ باتوں باتوں میں وزیر صاحب نے جموں کے سدھرا علاقے میں زمین خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسلم اور خالد نے اس کے لئے سِدھرا میں دو کنال زمین منتخب کی۔ وزیر صاحب نے چالیس ہزار کی رقم زمین خریدنے کے لئے دی۔ دو کنال اراضی بیس ہزار روپئے فی کنال کے حساب سے خریدی گئی۔ اُنہی دِنوں گل شاہ کی حکومت مرکزی سرکار نے ختم کر دی اور منتری جی اپنی رقم واپس مانگنے لگے۔ چنانچہ اُن کو رقم واپس کر دی گئی۔ اسلم نے بیس ہزار اور خالد حسین نے بیس ہزار روپئے دے کر دو کنال زمین خود خرید لی۔ یعنی ایک ایک کنال دونوں نے خریدی۔ اقرار بیعہ ناصر حسین قریشی کے والد جیون بخش قریشی کے نام لکھا گیا کیونکہ وہ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ پھر خالد اسلم قریشی سے اپنی ایک کنال

زمین کے کاغذ اپنے نام لکھوانے کے لئے کہتا رہا اور وہ وقت مانگتا رہا۔ کیونکہ دونوں کی پوسٹنگ الگ الگ ضلعوں میں ہوتی رہی۔ پھر یوں ہوا کہ زمینوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ روز بروز قیمتوں میں اُچھال آتا گیا۔ لوگوں کی طبیعت خراب ہوتی ہے لیکن اسلم قریشی کی نیت خراب ہوگئی۔ اور وہ کہنے لگا کہ وہ اب بارہ مرلے زمین دینے کو تیار ہے۔ خالد نے کہا چلو بارہ مرلے ہی اُس کے نام کروا کر زمین کا قبضہ دو، لیکن اس نے وہ بھی نہیں کیا۔ پھر بھی خالد حسین نے اُس کے ساتھ کبھی تعلقات خراب نہیں کئے۔ وہ اُسے ہمیشہ گرم جوشی سے ملتا رہا۔ دُعا گو ہوں کہ زندگی کے آخری سفر میں وہی زمین اُس کا دائمی مسکن بنے۔

خالد حسین کے سسُر کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی سعید اللہ ملک کے ہاں صرف دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ نسیم فردوس، جو میری بھابھی ہیں۔ جبکہ تسنیم کوثر جو جاوید خان نامی شخص سے بیاہی گئی ہے۔ خالد حسین کی ساس اور سسر نے اپنے بھائی کا بیٹا محمد اسلم گود لے لیا۔ محمد اسلم خالد کی خوش دامن صاحبہ کے بھائی کا بیٹا تھا جبکہ اُس کی ماں خالد کے سسر کی بہن تھی۔ محمد اسلم کو بڑے نازوں سے پالا گیا۔ اُس کی شادی کی۔ سعید اللہ ملک صاحب نے اپنی ساری جائیداد برابر تین حصوں میں دونوں بیٹیوں اور محمد اسلم کے نام کر دی اور بہنوں نے اپنا حصہ بھائی محمد اسلم کی سپرد داری میں دے دیا تا کہ وہ اس کا استعمال کر سکے۔ محمد اسلم کا سب سے چھوٹا بیٹا سلیمان پڑھنے میں کمزور تھا تو خالد حسین اُسے جموں لے آیا اور اپنے بیٹے یاسر عمران کے کاروبار میں اُس کو شامل کیا یعنی چار آنے کا حصہ دار اُسے بھی بنا دیا۔ اس کے علاوہ ہر مہینے پانچ ہزار کی رقم بطور تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ سلیمان اور یاسر دونوں نمازی تھے۔ یاسر نے سلیمان پر پورا اعتماد کیا اور دُکان کا حساب کتاب سلیمان کے سپرد کر دیا جبکہ وہ اپنا زیادہ وقت فلاحی کاموں میں لگانے لگا۔ سلیمان نمازوں کی آڑ میں مکاری کرنے لگا اور دُوکان کو لوٹتا رہا۔ اس کی بے ایمانی اور بد دیانتی کا علم تب ہوا جب انکم ٹیکس وکیل نے بتایا کہ

حساب کتاب میں بہت زیادہ گھپلا ہے۔ یا تو بنک میں 25 لاکھ روپیہ جمع ہونے چاہیں یا اتنی رقم کا مال دُکان میں ہونا چاہئے جبکہ دُکان میں تقریباً چار پانچ لاکھ روپئے کا مال نکلا۔ خالد حسین نے دکان بند کردی اور حساب کتاب کے رجسٹر ضبط کر کے اُن کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ سلیمان بھاگ گیا۔ وہ دو سال سے یاسر عمران کو چونا لگا رہا تھا لیکن اُسے کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ اُدھار وصولی کی رقم بھی ہضم کر گیا۔ کل ملا کر شیطان خصلت سلیمان نے 30 لاکھ کا غبن کیا اور بھاگ گیا۔ رشتے داری کی وجہ سے خالد حسین نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی۔ محمد اسلم بھی شرمندہ تھا۔ اس قسم کے کچھ اور مالی نقصان بھی خالد حسین نے برداشت کئے لیکن کبھی پریشان نہیں ہوا۔ شور ہنگامہ نہیں کیا بلکہ رضائے الٰہی سمجھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں دیکھی۔

مٹھی باندھ آیا بندہ، ہاتھ پسارے جاتا ہے
نہ کچھ لایا نہ کچھ لے گا، ناحق کیوں پچھتاتا ہے
(پلٹو صاحب)

دِل کا حال سنے دِل والا

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
آندھی میں بھی جس پیڑ کو ہلتے نہیں دیکھا

(پروین شاکر)

خالد حسین نے گوجر نگر میں نیا مکان بنایا اور 1987ء میں وہ وہاں رہنے کے لئے چلا گیا۔اُس مکان میں منتقل ہونے کے بعد خالد حسین اور اُس کی بیگم نسیم فردوس ایک عجیب سی بے چینی اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔اُن کے چہروں پر خوشی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔وہ مضطرب اور رنجیدہ رہنے لگے۔پھر یکِ بہ دیگرے ایسے واقعات ہوئے کہ مسلسل تین سال اُنہوں نے سکھ کا سانس نہیں لیا۔وہ اچھے بھلے اُستاد محلے میں رہتے تھے جہاں اُن کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گذری تھی۔جہاں اُن کی بارات چڑھی تھی۔جہاں اُن کے ہمسائے ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی تھے۔جن کے ساتھ خالد حسین کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔اُس مشترکہ کلچر میں اُن کے بچے پل رہے تھے، لکھ پڑھ رہے تھے لیکن بڑا مکان بنانے کے جنون نے خالد صاحب کو گوجر نگر میں لا پھینکا۔گوجر نگر ایک نئی مسلم کالونی تھی جس میں کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا' والا معاملہ تھا۔پونچھ، راجوری، ڈوڈہ، بھدرواہ، کشتواڑ، بانہال اور کشمیر وادی کے لوگوں نے اس نئی کالونی میں مکان بنائے تھے۔ان میں سے کچھ تو مستقل طور پر گوجر نگر میں رہتے تھے لیکن اکثر سردیوں کے تین چار مہینے گذار کر واپس چلے جاتے۔گوجر نگر میں خالد حسین کے بڑے بیٹے ذاکر حسین نے

اپنے کئی ہم عمر لڑکوں کے ساتھ راہ ورسم بڑھائی تھی۔ یہ سب لڑکے بھلیس سے آئے اور گوجر نگر میں رہائش پذیر ایک دائمی اور جنونی بنیاد پرست مسلمان کے چنگل میں پھنس گئے۔ جو اُنھیں صلیبی جنگوں میں جنگجوؤں اور مجاہدوں کے کارنامے سناتا۔ اسلام کی سربلندی کیلئے خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد کی بہادری کے قصے سناتا۔ عملی جہاد کے لئے اُکساتا۔ انھیں مسجد میں لے جاتا اور اُنھیں بنیاد پرست بنانے کے حربے استعمال کرتا۔ من گھڑت حدیثیں سناتا۔ صحابہ کی باتیں کرتا۔ غرض اُس کا مقصد ان معصوم لڑکوں کو دھرم زنجیریں پہنا کر اسلام کے مجاہد بنانا تھا اور دہشت گردی کی آگ میں جھونکنا تھا۔ حالانکہ وہ محکمہ پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر کام کررہا تھا۔ خالد حسین کا بیٹا ذاکر حسین بھی کاکا حسین کی وساطت سے وہاں جانے لگا اور پنج گانہ نماز ادا کرنے لگا۔ اُس کی ماں خوش تھی کہ اُس کا بچہ حالانکہ دسویں جماعت میں پڑھتا ہے لیکن نیک سیرت ہے اور نماز کا پابند ہے۔ مگر اُس کو کیا معلوم کہ یہ آنے والے ایک بڑے طوفان کی علامتیں تھیں۔ جب خالد صاحب کی بیٹی ڈاکٹر سمعیہ تبسم کی شادی ہوئی تو ان لڑکوں نے ڈٹ کر کام کیا اور پورے گوجر نگر میں نام کمایا۔ گوجر نگر والے مکان میں عجیب وغریب حادثے ہونے لگے۔ بچوں اور بیگم خالد کو کبھی ڈراؤنے خواب آتے تو کبھی کمروں کے باہر برآمدے میں تازہ خون کے قطرے فرش پر پڑے ملتے۔ ایک بار خالد حسین کی بیگم کہنے لگیں کہ ''واپس اُستاد محلے چلیں، یہاں کوئی آفت آنے والی ہے۔ مجھے عجیب اور حیرت انگیز خواب آتے ہیں۔'' خالد صاحب اُن کی بات کو مذاق میں لے اُڑتے۔ 1988 میں زبردست سیلاب آیا۔ دریائے توی کا پانی پُل کے اوپر سے بہنے لگا۔ خالد صاحب نے چونکہ اپنا مکان توی ندی کے کنارے بنایا تھا۔ لہٰذا سیلابی پانی میں اُن کا پورا مکان ڈوب گیا۔ بڑا نقصان ہوا۔ عقل مند لوگوں کی یہ بات کہ ''دریائے کے کنارے اور پہاڑ کی ڈھلان یا نشیب میں کبھی مکان مت

بناؤ'' بھی خالد صاحب کے پلّے نہیں پڑی۔ بلکہ اُنہوں نے سیلاب کے بعد مکان کی دوسری منزل بھی بنا ڈالی۔ دوسرے سال برسات میں پھر سیلاب آیا۔لیکن پانی پہلی منزل میں چار فٹ تک ہی پہنچا۔ پھر ایک اور حادثہ پیش آیا، ذاکر حسین کا ہم نام اور اُن کا گھریلو معاون، بجلی کی ہائیٹیشن وائر سے چپک گیا اور مرتے مرتے بچا۔ اس کو فوراً ہسپتال منتقل کیا گیا۔ دو مہینے اُس کا علاج چلتا رہا۔ وہ بچ گیا۔ ابھی اس سانحہ سے باہر نکلے بھی نہ تھے کہ خالد حسین کو پیغام ملا کہ ذاکر حسین میٹرک کے امتحان کا آخری پرچہ دینے کے بعد گھر نہیں لوٹا اور اس کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا۔ خالد حسین اُس وقت پونچھ میں اے، سی ڈی تعینات تھے۔ دوڑے دوڑے جموں پہنچے اور ذاکر کو تلاش کرنے لگے۔ اُس کے دوستوں سے پوچھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے یا پھر جان بُوجھ کر اُن سے چھپایا جا رہا تھا۔ وہ دن کشمیر کی سیاست کے سیاہ دِن تھے۔ سیاسی اور مذہبی ماحول نہایت گرد آلود تھا۔ 1990ء کے اوائل میں مرکزی سرکار نے جگموہن جی کو ریاست کا گورنر بنا کر بھیجا اور وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ جگموہن جیسے شخص سے 1984ء میں وہ گہرا زخم کھا چکے تھے۔ مجاہدین یا ملی ٹینٹوں کی کارروائیاں زوروں پر تھیں۔ کشمیری آزادی کے لئے جلوس نکال رہے تھے جن میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ایک منصوبے کے تحت مسجدوں سے کشمیری پنڈتوں کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور ان کو ٹارگٹ بنا کر قتل کیا جانے لگا تھا۔ ملی ٹینٹ ان مسلمانوں کو بھی قتل کر رہے تھے جو بھارتی ایجنسیوں کے لئے کام کرتے تھے۔ دہشت گردوں نے سب سے پہلے اُن کشمیری پنڈتوں کو نشانہ بنایا جو بھارت کی خفیہ ایجنسیوں میں ملازم تھے یا جو آر، آر، ایس کے ورکر تھے۔ اُس پنڈت جج کو بھی قتل کر دیا جس نے ''جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے بانی محمد مقبول بٹ کو پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ خالد صاحب کے دوست ایڈوکیٹ کشمیری لال بٹ

کے والد کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔

انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بس ہو چکے تھے۔ اسی ماحول میں گورنر جگموہن کو دوسری بار تعینات کیا گیا تھا۔ گورنر راج لگتے ہی کشمیری پنڈتوں کی ہجرت وسیع پیانے پر شروع ہوئی۔ موت سے ڈرتے اور زندگی کے لئے پناہ ڈھونڈنے کیلئے گورنر جگموہن نے اُن کا حوصلہ بڑھایا اور سرکاری ٹرانسپورٹ مہیا کرائی اور وہ وادیٔ کشمیر کی معتدل، ٹھنڈی اور صحت بخش ہواؤں کو چھوڑ کر جموں، اُودھم پور اور دہلی کی سنگلاخ زمینوں پر شرنارتھی بن گئے جہاں وہ سانپ اور بچھوؤں کے ڈسنے سے مرنے لگے اور ناقابل برداشت گرمی سے بے ہوش ہونے لگے۔ وہ ریفوجی کیمپوں میں رہنے کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونے لگے۔ کشمیری پنڈت جو صدیوں سے اپنے مسلم بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے جو آپس میں گھی شکر تھے۔ جنکی نسل ایک تھی جن کی زبان اور کلچر مشترکہ تھا، جو کشمیر کے پشتینی باشندے تھے، اُنھیں کشمیر چھوڑنا پڑا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ 7 لاکھ فوج 3 لاکھ پیراملٹری فورس اور مقامی پولیس کے ہوتے ہوئے بھی تین لاکھ سے زیادہ کشمیری پنڈت کشمیر سے ہجرت کر گئے۔ اس ہجرت میں اگر سرکاری رضامندی شامل نہ ہوتی تو جواہر ٹنل سے آگے کسی کو نہ جانے دیا جاتا بلکہ قاضی گنڈ کی سینکڑوں کنال اراضی پر اُن کے کلسٹر بنائے جاتے۔ فوج اُن کو پورا تحفظ دیتی۔ دُنیا کے تمام خطوں میں جہاں طرفین میں جنگ چل رہی ہو یا کسی ملک میں خانہ جنگی ہو تو لوگ جان بچانے کے لئے پُر امن علاقوں کو ہجرت کر جاتے ہیں اور حکومتیں اُن کو نہ فقط تحفظ دیتی ہیں بلکہ اُنھیں ضروریات زندگی بھی مہیا کراتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب مشرقی پاکستان میں فوج اور مقامی آزادی پسند لوگوں کے درمیان مسلح جدوجہد چل رہی تھی تو تقریباً ڈیڑھ کروڑ لوگوں کو بھارت نے اپنے ملک میں پناہ دی تھی اور ان کو ہر سہولت بہم پہنچائی تھی۔ اسی طرح جب روس نے

افغانستان پر قبضہ کرلیا اور افغانیوں نے ان کے ساتھ کھلی جنگ لڑی تھی تو 40 لاکھ لوگ پاکستان میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ جنگی حفاظت پاکستان نے امریکہ کی مالی مدد سے کی تھی۔ سریا، عراق، یمن، فلسطین، ویت نام کے علاوہ میانمار (برما) سے ہجرت کرنے والے روہنگیا مسلمانوں کو بنگلہ دیش اور بھارت میں پناہ ملی ہوئی ہے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ بھارت تین چار لاکھ کشمیری پنڈتوں کو اُن کی اپنی زمین پر تحفظ نہیں دے سکا۔ آنے والے تاریخ داں اس پر ضرور سوال اٹھائیں گے۔ میری نظر میں کشمیری پنڈت دہشت اور سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کتنی بد قسمتی کی بات تھی کہ پنڈت برادری اپنے گھر بار، کھیت کھلیان، میوے کے باغات سب چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنے کیلئے مجبور ہو گئے۔ سرکار کی نااہلی کی وجہ سے اُنھیں یہ سب برداشت کرنا پڑا۔

اُس صورتِ حال کیلئے پاکستان کی فوجی قیادت کی حکمت عملی، تربیت یافتہ مسلح ملی ٹینٹوں کو ریاست میں بھیجنا، مقامی نوجوانوں کے مذہبی جذبات بڑھکا کر اُنھیں 15 یا 20 دِن کی ٹریننگ اور ہتھیار دے کر کشمیر میں افراتفری پھیلانے کا کام سونپنا اور بھارتی فوج کا حالات پر قابو نہ پانا، اہم وجوہات ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

کشمیری پنڈتوں کے جانے کے بعد گورنر جگموہن کے لئے میدان کھلا تھا۔ اُس نے جلسے اور جلوسوں پر گولیاں برسانے کا حکم دیا۔ صرف ایک مہینے میں تقریباً پانچ سو نہتے کشمیری مسلمان اِن جلسوں اور جلوسوں میں مارے گئے۔ فوج، سنٹرل ریزور پولیس اور دیگر سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں نے لوگوں کی نفرت اور غُصے کو مزید بڑھکایا۔ اُن کی ہمدردیاں ملی ٹینٹوں کے تئیں بڑھنے لگیں۔ وہ اُنھیں ہیرو سمجھنے لگے۔ گاؤ کدل، بجبہاڑہ، سوپور، پٹن اور بڈگام کے جلوسوں میں شرکت کرنے والے نہتے لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ یہاں تک کہ میر واعظ مولوی فاروق کے جنازے کے جلوس پر بارڈر سیکورٹی

فورس اور سی، آر، پی، ایف کے جوانوں نے فائرنگ کرنے کی حماقت کی۔ حالانکہ مولوی فاروق کو ملی ٹینٹوں نے ہندوستانی ایجنٹ ہونے کے شک میں مار دیا تھا۔ ان کا قاتل آج بھی سنٹرل جیل سرینگر میں بند ہے۔ لیکن اس واقعے کی وجہ سے لوگوں نے مولوی فاروق کے قتل کے لئے بھی گورنر جگموہن اور سیکورٹی کے جوانوں کو ذمے دار قرار دیا۔ کشمیر میں عوامی بغاوت کو دبانے کے لئے فوج نے کئی غیر انسانی کام کئے۔ جن میں عورتوں کی عصمت دری بھی شامل ہے۔ جس کا ثبوت کُنن پوش پورہ کا سانحہ ہے جہاں تلاشی مہم کی آڑ میں 50 سے زائد عورتوں کی عصمت کو تار تار کر دیا گیا۔ فوج نے 22 عورتوں کے ساتھ ہوئی زیادتی کو تسلیم کیا اور فوجی مجرموں کا کورٹ مارشل بھی کیا۔ ملی ٹینوں کی زیادتیاں بھی کم نہیں تھیں۔ وہ بے گناہ ہندوؤں کو قتل کرنے لگے، بھارت نواز مسلمانوں کو مارنے لگے۔ اُن کا اغوا کرنے لگے۔ غرض کشمیری عوام دو دھاری تلوار کا شکار ہوئے۔ بین الاقوامی سطح پر کشمیر کیحالات پر جب آوازیں اُٹھنے لگیں اور کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی پر لعن طعن ہونے لگی تو گورنر جگموہن کو واپس دہلی بُلالیا گیا اور اُس کی جگہ 'را' کے سابقہ سربراہ گریش سکسینہ کو گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ جس نے اپنی حکمت علی اور تجربہ کاری سے ملی ٹینسی پر بہت حد تک روک لگائی۔

1990ء میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا وادی کشمیر میں بہت زیادہ اثر تھا۔ وہ اپنی سرگرمیوں کو جموں خطہ تک بڑھانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے جموں صوبہ کے مسلم اکثریتی علاقوں میں جے، کے، ایل، ایف کے مراکز بنا لئے تھے جو وہاں کاروائیاں کر رہے تھے لیکن جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں میں بھی وہ اپنا جال بچھانا چاہتے تھے جس کے لئے اُنہوں نے جموں کے ایک جوشیلے نوجوان کا کا حسین کو چُنا۔ اُسے جموں کا ایریا کمانڈر بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ جے، کے، ایل، ایف کی تنظیم بنائے۔ کم

عمراور ناسمجھ مسلم لڑکوں کو بھرتی کرے۔ اُنھیں ہتھیار چلانے کی تربیت دے اور پھر جموں میں وارداتیں کرے۔ کا کا حسین نے دس بارہ کم سن بچوں کی جماعت بنائی اور گوجر نگر کے قبرستان میں اُن کو اے، کے 47 بندوق چلانے کی تربیت دینے لگا۔ اُنہی دِنوں جموں میں انتہا پسند ہندو لڑکوں نے تالاب کھٹیکاں کے مسلم دُکانداروں پر حملہ کر دیا۔ کا کا حسین اپنے کچھ دوستوں اور دُکانداروں کے ساتھ اُن پر جوابی حملہ آور ہوا۔ اُس نے دو تین لڑکوں پر قصائی کے ٹوکے سے وار کیا اور وہ لوگ بھاگ گئے۔ اس واردات نے کچے ذہن کے ان بچوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ وہ کا کا حسین کو مسلمانوں کا ہیرو سمجھنے لگے۔ متاثر ہونے والوں میں خالد حسین کا بیٹا ذاکر حسین بھی تھا۔ وہ بھی کا کا حسین کی جماعت میں شامل ہو گیا یہ سب نو عمر لڑکے گوجر نگر قبرستان میں جاتے۔ کا کا حسین اِن کو غازیوں کے سچے جھوٹے قصے سناتا جبکہ وہ خود کورا اَن پڑھ تھا۔ بندوق چلانی سِکھاتا۔ پھر اُس نے کوئی واردات کرنے کے لئے بچوں کو تیار کیا۔ ذاکر حسین سب سے کم عمر تھا۔ وہ اُس وقت 15 سال کا تھا اور میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔ اُسے کار چلانے کا شوق تھا۔ خالد صاحب کے سرکاری ڈرائیور کلبھوشن سنگھ نے اُسے کار چلانا سکھا دیا تھا۔ چنانچہ کا کا حسین نے اُس کی ڈیوٹی یہ لگائی کہ وہ اُس کی ماروتی وین کے شیشوں پر کالی فلم لگوا کر لائے۔ ذاکر حسین ماروتی وین کو جموں کی سڑکوں پر خوب گھماتا رہا اور پھر کالی فلم لگوا کر وین کا کا حسین کے سپرد کر کے اپنے گھر آ گیا۔ دوسرے دِن کا کا حسین نے گمٹ چوک میں ایک ویشنو ڈھابے پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ اُس کے ساتھ تین لڑکے اور بھی تھے۔ اس حادثے میں دو آدمی مارے گئے اور ڈھابے کے مالک سمیت کچھ لوگ زخمی ہو گئے۔ کا کا حسین اس واردات کے بعد گاندھی نگر کی طرف بھاگا۔ وہاں اُس نے ایک گلی میں ماروتی وین کھڑی کر دی۔ وہ اور اس کے ساتھی الگ الگ سمت میں بھاگ

گئے۔ اگلی صبح سبھی اخباروں میں واردات کی خبر شہ سرخیوں میں چھپی تھی۔ پولیس نے ماروتی وین ضبط کرلی اور حادثے کی تحقیقات کرنے لگی۔ پولیس کو پتہ چل گیا کہ واردات سے ایک روز پہلے خالد حسین کا بیٹا ذاکر حسین ضبط شدہ ماروتی وین چلا رہا تھا۔ ذاکر کے کچھ دوستوں نے اُسے بتادیا کہ پولیس اُسے ڈھونڈ رہی ہے۔ کیونکہ اُن لوگوں نے جو واردات کی ہے وہ اسی وین سے کی گئی ہے۔ جسے وہ چلا رہا تھا۔ ذاکر حسین نے جب یہ سُنا تو وہ گھر سے بھاگ گیا۔ ذاکر کی گم شدگی کی خبر سن کر جب خالد حسین پونچھ سے جموں پہنچے تو گھر میں ماتم کا ماحول تھا۔ ذاکر کی ماں اور بہنوں نے رو رو کر بُرا حال کیا تھا۔ خالد حسین نے سب کو دم دلاسا دیا اور ذاکر حسین کا پتہ لگانے کیلئے ہر وہ دروازہ کھٹکھٹایا جہاں اُس کے روپوش ہونے کی اُمید تھی۔ لیکن کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ اتنا پتہ ضرور چل گیا کہ کاکا حسین نے معصوم ذاکر اور دوسرے کئی کم سن بچوں کی زندگی برباد کردی ہے۔ خالد حسین واپس پونچھ چلا گیا۔ پھر ایک آدھ مہینے کے بعد کاکا حسین سرینگر میں گرفتار ہوگیا۔ تفتیش میں اُس نے سبھی لڑکوں کے نام بتادیئے جن میں ذاکر حسین بھی شامل تھا۔ خالد حسین کو متعلقہ پولیس تھانے بُلایا گیا۔ جہاں راجستھان کے رہنے والے ایک اعلیٰ افسر نے اُن کی تفتیش کی۔ جب اُسے خالد حسین کے خاندانی پس منظر کا پتہ چلا اور بطور ضلع افسر اُس کی کارکردگی کا معلوم ہوا تو وہ پوچھنے لگا کہ اتنی اچھی بیک گراونڈ کے ہوتے ہوئے ذاکر حسین کیسے ان لوگوں کے چُنگل میں پھنس گیا۔ تو خالد صاحب کا جواب تھا کہ اُن کے گھر میں تعلیم کا ماحول ہے۔ اُن کے بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں ذاکر بھی دیوان بدری ناتھ شکھشا ودیالیہ میں دسویں تک پڑھا۔ وہاں اُسے کون سی تعلیم دی جاتی رہی، شاید مسلم اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک اور حقارت بھی ایک وجہ ہو ورنہ قوم پرست اور بھارتی سنسکرتی کا دعویٰ کرنے والے ان اداروں میں پڑھ کر بھی کوئی کیسے منفی سوچ رکھ سکتا ہے۔ دراصل ذاکر حسین نے اُن کی سوچ

پڑا کہ ڈالا ہے۔ جس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ تین گھنٹے کی تفتیش کے بعد اُس افسر نے خالد صاحب کو چائے پلائی اور سٹی تھانے کے ایس، ایچ، او اور علاقے کے ڈی، ایس، پی کو تحریری ہدایت دی کہ خالد حسین یا ان کی فیملی کو تنگ نہ کیا جائے اور نہ کبھی خالد صاحب کو تھانے میں بُلایا جائے۔ لیکن اُس کے باوجود سادہ کپڑوں میں پولیس کے سپاہی خالد کے گھر کا طواف کرتے رہتے۔ لیڈی پولیس کی عورتوں بھکاریوں کے بھیس میں گھر کے اندر جا کر جائزہ لیتیں کہ کہیں ذاکر گھر کے اندر ہی نہ چھُپا ہو۔ اکثر وقت بے وقت مکان پر چھاپے مارے جاتے۔ خالد صاحب اور اُن کا اہل خانہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہو گئے۔ وہ رات کو اُٹھ بیٹھتے اور بیگم کے پوچھنے پر بتاتے کہ کسی نے گیٹ کی بیل بجائی ہے۔ وہ باہر جاتے لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا۔ گوجر نگر کے اُس آسیب زدہ مکان میں گھر کے کسی بھی فرد کو سکھ کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ گوجر نگر کالونی میں ایک دوسرے کو لوگ کم ہی جانتے تھے۔ لمبی داڑھیاں، ہاتھ میں تسبیح او عجیب وغریب لباس اور نمازوں پر زور، لیکن اندر سے کون مخبر ہے اور کون مجاہد۔ اللہ ہی جانے۔

یہ سب باتیں مجھے خالد حسین صاحب نے خود سنائی تھیں۔ جب وہ پونچھ سے تبدیل ہو کر 1991ء کے شروع میں دوبارہ ضلع ڈوڈہ میں اے، سی، ڈی، تعینات ہوئے تھے۔ میرا نام اختر حسین گتو ہے۔ میں اُن کا قابلِ بھروسہ اہل کار تھا۔ اُنہوں نے ہی مجھے سارا دفتری کام سِکھایا تھا۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور روز شام کو مجھے اپنے سرکاری کوارٹر میں بُلاتے اور اپنا من ہلکا کرتے۔ اُن دِنوں ڈوڈہ میں حیدر آباد کے رہنے والے ایک اعلیٰ ظرف آئی، پی، ایس افسر مسٹر ایلنگو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس تعینات تھے۔ ہنس مُکھ طبیعت، بااخلاق اور ادب نواز انسان۔ خالد حسین صاحب کے ساتھ اُن کی دوستی کی بُنیاد ادبیاتِ عالم کی جانکاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے۔ کچھ

دیر کے بعد ایلنکو کا تبادلہ جموں ہوگیا جہاں وہ ایس، ایس، پی جموں لگائے گئے تھے۔ ایک دِن ایلنکو صاحب کا فون آیا۔ اُنہوں نے خالد صاحب کو فوراً جموں بُلایا تھا۔ وہ ذاکر حسین کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ خالد حسین جموں پہنچے اور ایلنکو صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دی تو اُنہوں نے دوسری صبح ناشتے پر خالد صاحب کو بُلایا۔ وہاں مسٹر ایلنکو نے بتایا کہ ذاکر حسین جموں میں ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اُن کے دوست کا بیٹا مارا جائے۔ اس لئے اُسے وہ سرنڈر کرائیں۔ ورنہ پولیس مقابلے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ خالد حسین نے گھر آکر اُس کے قریبی دوستوں کو بُلایا۔ جن میں محمد ایوب تیلی بھی تھا۔ خالد صاحب نے ایوب کو ساری بات سمجھائی اور کہا کہ وہ ذاکر کو سرنڈر کرنے پر مجبور کرے۔ شام کو ایوب نے ذاکر کا پیغام دیا کہ پولیس کے آگے سرنڈر کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اُس کی تنظیم کے ملی ٹنیٹ اُس کے پورے خاندان کو مار ڈالیں گے۔ دوسرے دِن خالد صاحب مسٹر ایلنکو سے ملے اور بتایا کہ وہ سرنڈر کرنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ اُسے ڈر ہے کہ ملی ٹنیٹ اُس کے اہل خانہ کو مار ڈالیں گے۔ مسٹر ایلنکو نے خالد صاحب کو کہا کہ اب سب خدا پر چھوڑتے ہیں آپ واپس اپنی ڈیوٹی پر چلے جائیں۔ خالد حسین واپس ڈوڈہ آگئے لیکن بے چین رہنے لگے۔

کچھ دِنوں کے بعد پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی، اے، چوہدری محمد اسلم کے ساتھ خالد حسین بانہال کے دورۂ پر گئے۔ رات خالد صاحب اور اسلم صاحب ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ آدھی رات کے بعد یعنی کوئی تین بجے کے قریب خالد حسین اُٹھ کر بیٹھ گئے اور محمد اسلم صاحب سے کہنے لگے کہ ذاکر حسین کو کسی نے گولی ماردی ہے وہ مر گیا ہے۔ اُس کا جنازہ پڑھنا ہے۔ اُس کو دفنانا ہے۔ جلدی کرو۔ اور چلو۔ محمد اسلم نے اُنھیں سنبھالا اور کہا کہ اُنہوں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ صبح چلتے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ باہر برف باری

ہو رہی ہے۔ ناشری نالہ بند ہے۔ رام سو میں بھی پسیاں گری ہوں گی۔ دوسرے کمرے سے
میں اور اسلم صاحب کا اے، پی، او تصدق جیلانی (جو کہ بعد میں ڈائریکٹر رورل ڈیولپمنٹ
اور ڈپٹی کمشنر رہا اور بعد ازاں کورونا کی وجہ سے سب کو چھوڑ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا) بھی
اُن کے کمرے میں آ گئے۔ ہم سبھی خالد صاحب کو دلاسہ دیتے رہے۔ دوسرے دن خالد
حسین اور محمد اسلم جموں چلے گئے اور ہم ڈوڈہ۔ جب خالد صاحب اپنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ
پورے گوجر نگر کو پیرا ملٹری فورس اور ریاستی پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ ٹھیک رات کے بارہ
بجے مسٹر ایلنگو (جو بعد میں R.A.W میں ایک بڑے عہدہ پر رہ کر ریٹائر ہو گئے) اور ایس
پی شیش پال وید (جو بعد میں ڈائریکٹر جنرل پولیس بنے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں) خالد
صاحب کے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ کچھ سپاہی بھی تھے۔ مسٹر ایلنگو چھت
پر چڑھ گئے۔ اور ایس، پی وید خالد صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چھت پر
سے آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ والے مکان میں بہت شور تھا۔ پولیس کے جوان ادھر اُدھر
بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ بغل والا مکان کشتواڑ کے محمد اقبال شیخ کا تھا اور اُس کی بیوی
پروین اختر اپنے بچوں کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ اُسی گھر سے پولیس نے ذاکر کو پکڑا
تھا۔ ذاکر کو اُس وقت کے ڈی، ایس پی (جو بعد میں آئی، جی، پی ریٹائر ہوئے اور پھر
لکشدیپ کے ایڈمنسٹریٹر اور جموں کشمیر گورنر کے ایڈوائزر بنے) سردار فاروق خان نے
قابو کیا تھا۔ فاروق خان صاحب کی والدہ ماجدہ محترمہ خالدہ بیگم خالد حسین کے والد ماسٹر
غلام حسین کی شاگرد تھیں اور اُن کا تعلق بھی ادھم پور سے تھا۔ خالد صاحب اور فاروق
صاحب بھی گہرے دوست تھے۔ ذاکر حسین کو پکڑ کر گھر لایا گیا اور فاروق صاحب نے اُس
کے جوتے منگوائے کیونکہ وہ ننگے پاؤں تھا۔ خالد صاحب نے ذاکر کو پہچانا نہیں تھا کیونکہ
جب وہ گھر سے بھاگا تھا تو اُس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی لیکن اب ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔

ذاکر حسین کوسب سے پہلے اُس کی بہن ہماتبسم نے پہچانا۔ وہ ذاکر حسین کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھی۔ اُس کی والدہ بھی رونے لگی۔ لیکن مسٹر ایلنکو نے اُنھیں یقین دلایا کہ جب تک ذاکر اُن کے پاس ہے، اُسے کسی قسم کی اذیت نہیں دی جائے گی۔ مسٹر ایلنکو نے خالد حسین کو بتایا کہ اُس نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ اگر ذاکر حسین کے پاس ہتھیار ہوا اور اُس نے گولی چلائی تو جواباً اُس کی ٹانگ پر گولی چلائی جائے کیونکہ وہ خالد حسین کا بیٹا ہے۔ اور ہمیں وہ زندہ چاہئے۔ پولیس ذاکر کو لے گئی۔ گھر ماتم کدہ بن گیا۔ خالد صاحب کی بیگم، بیٹیاں اور چھوٹے بیٹے یاسر عمران نے رو رو کر اپنا برا حال کر دیا۔ کوئی ہمسایا، کوئی رشتہ دار کوئی دوست دُکھ کی اُس گھڑی میں درد بانٹنے نہیں آیا۔ اُنھیں ڈر تھا کہ خالد حسین کے گھر جانے سے کہیں وہ مصیبت میں نہ پھنس جائیں یہاں تک کہ جس گلی یا سڑک سے خالد صاحب گذرتے، قرابت دار اور دوست احباب وہ راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر وعظ فرمانے والے امام مسجد اور مذہبی ٹھیکیدار کہیں نظر نہیں آئے۔ مسٹر ایلنکو نے اپنا وعدہ نبھایا کیونکہ جب تک ذاکر حسین پولیس کی حراست میں رہا اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اُس کیلئے کھانا بھی گھر سے جاتا تھا۔ آٹھویں روز ذاکر حسین کو سٹی تھانے سے نکال تفتیشی مرکز تالاب تلو بھیج دیا گیا۔ انٹروگیشن سنٹر کا انچارج ڈی، ایس، پی، مکھن لال شرما تھا۔ جو بڑا اکھڑ، تجربہ کار لیکن سخت مزاج کا شخص تھا۔ وہ بااصول اور پوجا پاٹھی افسر تھا۔ کسی کی سفارش نہیں سنتا تھا چاہے وہ اُس کا سنیئر افسر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی ڈیوٹی فرض سمجھ کر کرتا تھا۔ ملی ٹیٹنوں کے لئے وہ ایک دہشت تھا۔ اُس کے سامنے بڑے بڑے عسکری لیڈر بھی طوطے کی طرح بولنا شروع کر دیتے تھے۔ کشمیر کے علیحدگی پسند لیڈروں اور بھارت مخالف طاقتوں کے وہ سخت خلاف تھا۔ اور جو بھی کوئی انٹروگیشن سنٹر میں اُس کے ہتھے چڑھتا وہ مکھن لال شرما کو زندگی بھر نہیں

بھولتا۔ 1947ء کی شورش میں اُس کے بھی سگے سمبندھی مسلم بلوائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے
تھے جس کی کسک اُس کے اندر بھی گورنر جگموہن کی طرح زندہ تھی جس کا خاندان بھی
لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوا تھا۔ ذاکر حسین کو تفتیشی مرکز میں گئے تقریباً دو مہینے
ہو چکے تھے۔ ذاکر کی ماں اور بہنیں اُسے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ آخر مجبور ہو کر خالد
حسین نے اپنے لڑکپن کے دوست ایس، ایس، پی خالد دُرّانی سے ذاکر کو ملنے کے لئے اس
کی مدد طلب کی۔ خالد دورانی اُسے پرتھوی راج گنڈوترا سے ملانے لے گئے جو اُس وقت
ایس، ایس، پی، سی آئی، ڈی جموں تعینات تھا (بعد میں آئی، جی پی ریٹائر ہوئے) اور مکھن
لال شرما اُسی کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ دُرّانی صاحب نے پی، آر، گنڈوترا کو ذاکر حسین سے
ملاقات کے لئے کہا تو اُس نے ہچکچاتے ہوئے مکھن لال شرما کو فون کیا اور کہا کہ اُس کا بیچ
میٹ خالد دُرانی اور ہمارے مشترکہ دوست خالد حسین آئے ہیں وہ ذاکر حسین سے ملنا
چاہتے ہیں کیونکہ ذاکر کی ماں اور بہن اُسے دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔ اگر اس کی تفتیش
مکمل ہو چکی ہو تو ملاقات کرا دی جائے۔ مکھن لال شرما نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن
گنڈوترا صاحب کے نرم لہجہ کی وجہ سے اُس نے آٹھویں دِن ملاقات کا وقت دیا۔ ٹھیک
آٹھویں دِن خالد حسین، اُن کی اہلیہ، بیٹی ھما تبسم اور بیٹا یاسر عمران انٹروگیشن سنٹر وقت پر پہنچ
گئے۔ مکھن لال شرما خالد حسین صاحب سے کڑوا بولنے لگا اور کہنے لگا کہ آپ کے گھروں
میں بھارت مخالف اور پاکستان کے حق میں باتیں ہوتی ہیں۔ اِسی لئے آپ کے بچے
دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ 1947ء میں اُس کے رشتے
دار بھی قبائلی درندوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور پاکستان کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔
جواب میں خالد صاحب نے کہا تھا ”اُن کا بھی سارا کنبہ 1947 میں کٹر پنتھی ہندوؤں نے
قتل کر دیا تھا۔ دادا، باپ، چاچے، چاچی اُن کا بیٹا، پھوپھا اور دو بھائی، سب مسلمان ہونے

کی وجہ سے قتل کر دیئے گئے لیکن اُس قتل و غارت کے لئے وہ ہندوؤں کو ذمے دار نہیں سمجھتے
اور نہ ہی مسلمانوں کو کیونکہ ایسے گھنوَنے کام کرنے والے وحشی جانور ہوتے ہیں وہ کسی دھرم
کو نہیں مانتے جبکہ دھرم تو ''جیو اور جینے دو'' کا درس دیتا ہے۔ پھر خالد صاحب اور اُن کے
پریوار کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ذاکر حسین کو وہاں لایا گیا۔
ذاکر کی حالت دیکھ کر ہما بیٹی بے ہوش ہوگئی۔ اُس کے سارے شریر پر سوجن تھی۔ خاص
کر پاؤں بہت سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ اور اُن کے گرد سیاہ ہالے پڑے تھے وہ
چل بھی نہیں سکتا تھا۔ دو سپاہیوں نے اُسے سہارا دے کر کمرے کے اندر لایا تھا۔ خالد
صاحب کو دیکھتے ہی وہ بلکنے لگا اور گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگا اور تفتیش کرنے والوں کی
شکایتیں کرنے لگا کہ انہوں نے ٹکٹکی باندھ کر اُس کی خوب پٹائی کی ہے۔ 15 دن تک سونے
نہیں دیا۔ بجلی کے کرنٹ دیئے۔ جوؤں والے کمرے میں رکھنے اور جسم کھجانے کی وجہ سے
زخم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ خالد صاحب نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے
اُسے کہا تھا ''بیٹا! تم غلط صحبت میں پڑ گئے تھے۔ تمہیں اپنے گھر کا لذیذ کھانا اور آرام دہ بستر
راس نہیں آیا۔ تم نے کاکا حسین جیسے موالی کو اپنا ہیرو مانا۔ میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود تم
نے اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جس نے تمہارا استعمال کیا۔ تمہیں اپنے باپ کے گھر میں کس
چیز کی کمی تھی۔ تم کو کون سی آزادی چاہئے تھی۔ تمہارا باپ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہے جس نے
تم کو ہر آسائش مہیا کی تھی۔ پھر بھی تم کاکا حسین کے بہکاوے میں آگئے۔ یہ تفتیشی افسر
تمہارے انکل ہیں تمہیں اچھا اور برا سمجھانے والے۔ تمہیں سیدھے راستے پر لانے
والے۔ اللہ کا شکر کرو کہ تم زندہ ہو۔'' ملاقات کے بعد مکھن لال شرما نے خالد حسین کو اپنے
کمرے میں بلایا۔ سب کو قہوہ پلایا اور کہا کہ ذاکر حسین کی تفتیش مکمل ہو چکی ہے۔ کچھ دنوں
تک ذاکر کو عدالتی حراست میں جیل بھیج دیا جائے گا۔ اُسی کمرے میں خالد صاحب کو اننت

ناگ کے حریت لیڈر مولوی نثار بھی ملے (جن کا بعد میں انکاؤنٹر کر دیا گیا تھا) ذاکر حسین پر "ٹاڈا" قانون کے تحت ٹاڈا عدالت میں چالان پیش کیا گیا۔ پولیس نے اُس پر جو الزام لگائے تھے، اُن میں یہ اہم تھے۔

1۔ وہ ایک خطرناک اُگروادی ہے۔

2۔ جے، کے، ایل، ایف تنظیم کا جموں میں ائیر یا کمانڈر ہے۔

3۔ فوج پر گرینیڈ پھینکنا، بم بلاسٹ اور قتل وغیرہ

ذاکر حسین کو ڈسٹرکٹ جیل جموں میں رکھا گیا۔ ذاکر کے ساتھ جو دوسرے لڑکے پکڑے گئے تھے اور جن کا نام چالان میں درج تھا، وہ، ساجد بٹ، خالد چوہدری، محمد اشرف، غلام محمد رنگساز اور پروین اختر تھے۔ مقدمہ لڑنے کے لئے خالد صاحب کوئی مسلم وُکلا کا نام تجویز کیا گیا لیکن اُنہوں نے ایک کشمیری پنڈت بنسی لال چٹھہ کو ذاکر اور اُس کے ساتھیوں کا وکیل بنایا، جو دیکھنے میں وکیل کم اور باتونی منشی زیادہ لگتا تھا۔ وہ بارہ مولہ سے ہجرت کر کے جموں آیا تھا اور مقامی عدالتوں میں وکالت کرنے لگا تھا۔ اُس نے چالان اور اُسکے ساتھ نتھی دیگر کاغذات کی کاپیاں حاصل کیں اور عرق ریزی سے اُنھیں پڑھنے لگا تاکہ استغاثہ کی طرف سے کیس تیار کیا جا سکے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ سرکاری وکیل کی طرف سے گواہان اپنے بیان قلمبند کرانے لگے۔ بنسی لال چٹھہ گواہوں پر جرح کرتا رہا۔ عدالتی کاروائی میں چار سال بیت گئے تاریخ پر تاریخ پڑتی رہی۔ اس دوران ذاکر حسین جموں جیل سے سنگرور جیل منتقل کیا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد اُسے جودھ پور جیل میں بھیج دیا گیا۔ جودھ پور جیل سے اُس کو مقررہ تاریخ پر عدالت میں حاضر نہیں کیا جاتا۔ سرکاری وکیل کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر عدالت سے لمبی لمبی تاریخیں لینے لگا۔ جودھ پور جیل میں ذاکر حسین تقریباً ڈیڑھ سال سے قید تھا۔ اس عرصہ میں اُسے کبھی پیشی پر جموں نہیں لایا گیا۔ اپنی اہلیہ کے

اصرار پر خالد صاحب ذاکر کو ملنے جودھ پور گئے۔ ان کے دوست سردار عجب سنگھ وزیر نے جموں سے لیکر جودھ پور تک کار چلائی اور گیارہ بارہ سو کلومیٹر کا سفر دو دنوں میں طے کیا۔ پہلی رات دہلی میں اور دوسری جودھ پور میں گذاری۔ ضابطے کے مطابق ذاکر سے ملاقات کے لئے ڈسٹرکٹ جج جودھ پور سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ اسلئے وہ پہلے عدالت میں گئے۔ وہاں ایک سکھ وکیل کو دیکھ کر عجب سنگھ اُن کی طرف دوڑا۔ اُسے ساری بات بتائی۔ سکھ وکیل نے خود درخواست بنائی اور ٹائپ کی۔ خالد حسین کے دستخط کروائے اور اُن کو لے کر سیشن جج کے سامنے پیش ہوگیا۔ جج صاحب نے اجازت نامہ پر دستخط کر دیئے۔ جب عجب سنگھ نے اُسکے کام کا محنتانہ پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اُسے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ ایک عرصہ کے بعد ایک سکھ بھائی کو دیکھا ہے۔ خالد صاحب اُن کی اہلیہ نسیم فردوس، بیٹی ہما تبسم اور عجب سنگھ جودھ پور جیل گئے۔ خالد حسین نے اپنا شناختی کارڈ اور اجازت نامہ جیلر کے پاس بھیجا۔ اس نے سب کو اپنے کمرے میں بُلایا۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا خالد صاحب کو سلیوٹ مارا۔ چائے پلا کر عزت افزائی کی اور پھر کہنے لگا کہ اُس نے اپنا پروٹوکول پورا کر دیا ہے۔ اب اُن سب کو باقی ملاقات کرنے والوں کی طرح جیل ضابطے پر عمل کرنا ہوگا۔ جیل کوٹھری سے ذاکر حسین کو لایا گیا۔ آدھا گھنٹہ ملاقات ہوئی۔ ذاکر کی صحت بہت اچھی تھی۔ چہرے کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ اُس وقت اُسی جیل میں ذاکر حسین کے ساتھ مشتاق لٹرم، نعیم خان، بٹہ کراٹے، مشتاق السلام، عمران الٰہی (جو بعد میں ایم، ایل، سی بنایا گیا) عبدالسلام راتھر وغیرہ کئی دوسرے علیحدگی پسند لیڈر بھی قید تھے۔ دوسری رات بھی اُنہوں نے جودھ پور کے ہوٹل میں گذاری۔ پھر وہ اجمیر آئے اور حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دی۔ دہلی پہنچنے پر اُنہوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھی اور ذاکر کی رہائی کے لئے دعائیں مانگیں۔ درگاہ

سے باہر خالد صاحب نے تقریباً ایک سو فقیروں کو کھانا کھلایا کیونکہ جموں میں کسی جیوتشی نے خالد حسین سے کہا تھا کہ فقیروں اور حاجت مندوں کو کھانا کھلانے سے ذاکر کے گرہ ماند پڑ جائیں گے۔ اگلے روز وہ لوگ جموں واپس آ گئے۔ جموں آنے کے بعد بھی خالد صاحب ہر جمعرات کو ستواری والے پیر بابا بڈھن شاہ کی درگاہ اور رام نگر کے موڑوں میں واقع پنج پیر کی درگاہ پر حاضری دیتے اور فقیروں میں کھانا اور پیسے بانٹتے (پنج پیر زیارت کا ذکر قدرت اللہ شہاب نے اپنی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' میں کیا ہے) اس کے علاوہ وہ گمٹ میں نوگزیئے پیر کی درگاہ اور رگھوناتھ مندر کے باہر مانگنے والوں میں پیسے بانٹتے۔ اپنی اولاد کی چاہت میں انسان کیا کیا نہیں کرتا۔ کہاں کہاں ماتھا نہیں رگڑتا۔ چاہے وہ ان باتوں کو شرک سمجھتا ہو لیکن جب نصیبوں کی مار پڑتی ہے تو عقل و دانش کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

اُن ہی دِنوں خالد حسین کی پوسٹنگ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیٹ جموں ہوئی۔ اس دفتر میں ایک مہاجر کشمیری پنڈت (جس کے والدین اننت ناگ کے بڑے زمیندار تھے) ڈیلی ویجر کے طور پر کام کرتا تھا۔ اُس کا نام وجے کمار کول تھا۔ اخباروں اور دیگر قریبی ذرائع سے اُسے خالد حسین کی پریشانی کے بارے میں علم تھا۔ ایک دن وہ خالد صاحب سے کہنے لگا کہ ذاکر کو جودھ پور سے جموں لانے کے سلسلے میں وہ اُن کی مدد کر سکتا ہے۔ کیونکہ اُس کے خالہ زاد بھائی شری تر لوکی ناتھ بٹ ٹاڈا کورٹ کے جج ہیں۔ وہ اُن سے ملاقات کرا سکتا ہے۔ خالد صاحب نے بے دِلی سے اُسے کہا کہ اگر وہ کوشش کر سکتا ہے تو کرے، پھر ایک دِن وجے کمار کول خالد صاحب کو سیشن جج تر لوکی ناتھ بٹ صاحب کے گھر لے گیا۔ وہاں خالد صاحب نے ذاکر حسین سے متعلق ساری روداد سنائی اور گذارش کی کہ وہ ذاکر کو جموں ڈسٹرکٹ جیل یا کوٹ بھلوال جیل میں منتقل کرائیں کیونکہ بار بار جودھ پور نہیں جایا جا سکتا۔ جج صاحب نے دوسرے دِن داخلہ امور کے کمشنر

جناب محمودالرحمن (جو بعد ازاں علی گڑھ مسلم نیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اوراب وفات پا چکے ہیں) کوایک سخت چٹھی لکھی اور وضاحت مانگی کہ ذاکر حسین کو کس کی اجازت سے جودھ پور جیل میں رکھا گیا ہے۔ جبکہ وہ اُن کی عدالتی حراست میں تھا اور اُن کی پیشگی منظوری کے بغیر اُسے کہیں نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی کئی تاریخوں میں وہ عدالت میں حاضر نہیں ہوسکا۔ اُنہوں نے ذاکر کواگلی پیشی پر حاضر کرنے کی ہدایت کی اور وارننگ دی کہ اگر آئندہ پیشی پر ذاکر حسین کوعدالت میں حاضر نہیں کیا گیا تو وہ اُس کے خلاف سارے کیس خارج کر کے اُس کی رہائی کا حکم صادر کردیں گے۔ اس چٹھی نے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ایک ہلچل مچادی۔ خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آگئیں اور یوں ذاکر حسین ڈیڑھ سال کے بعد ڈسٹرکٹ جیل امپھلا جموں لایا گیا، جودھ پور جیل میں جیلر نے ذاکر حسین کواسلامی کتب اور قرآن مجید معہ اردو ترجمہ پڑھنے کو دیا اور خود بھی اُس کی برین واشنگ کرتا رہا۔ جودھ پور جیل میں ذاکر حسین کوآزادی کے نام نہاد متوالوں اور حریت کے لیڈروں کو بڑے قریب سے جاننے کا موقع ملا اور وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا کہ ان کے قول وفعل میں کتنا تضاد ہے۔ وہ لوگ بھارت اور پاکستان کی ایجنسیوں سے پیسے لیتے تھے۔ پاکستانی سرکار کشمیر کے لوگوں کو ہندوستانی تسلط کے خلاف بھڑکانے اور آزادی کی تحریک کوزندہ رکھنے کے لئے اور ہندوستانی حکومت آزادی کی تحریک کودبانے کے لئے افراطِ زر خرچ کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے آزادی کے ان پروانوں نے کروڑوں روپئے کی جائیداد بنائی تھی (ان لیڈران کورقم دینے کا انکشاف ''را' کے سابقہ چیف سری امر سنگھ دُلت نے اپنی کتاب "Kashmir: The Vajpaye's years" میں بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ جس کی کسی نے تردید نہیں کی) ان لیڈروں کی کرتوتیں دیکھ کر ذاکر حسین کا سارا جوش ولولہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ان لیڈروں سے ملنے سپریم کورٹ کے وکیل معروف صحافی اور آئی، بی ودیگر

خفیہ ایجنسیوں کے افسران اکثر آتے۔ ڈسٹرکٹ جیل امپھلا میں اُن دِنوں سید علی شاہ گیلانی، شبیر شاہ، جاوید میر المعروف جاوید نلکا بھی مقیم تھے۔ زیادہ ملاقاتیں ''الجہاد'' تنظیم کے چیف شبیر شاہ سے ہوتیں۔ مرکزی سرکار کے ایلچی جیل میں اُن سے ملتے رہتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شبیر شاہ کو وزیر اعلیٰ بنانے کا جھانسہ دیا گیا (تفصیل Kashmir: The vajpayee years) اُسے رہا کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ جیل امپھلا تا ''مانسر ہوٹل'' جموں تک اُس کا استقبال کرایا گیا۔ کھلی جیپ میں اُسے بٹھایا گیا اور غلام محمد رنگساز (جو ذاکر کے ساتھ گرفتار ہوا تھا) سے نعرے لگوائے جا رہے تھے، ''لیڈر ہمارا شبیر شاہ۔ اُس وقت بھارت کے وزیر اعظم دیوگوڑا جی تھے۔ اُن کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا تھا، اُس کے مطابق ''الجہاد'' تنظیم توڑ دی گئی۔ تنظیم کے عہدے داروں اور شبیر شاہ کے قریبی ساتھیوں کی احسن طریقے سے بحالی (Rehablitate) کی گئی چنانچہ سمجھوتے کے تحت ''الجہاد'' کے عسکری کمانڈر بابر بدر (فردوس بابا) غلام نبی شاہ کو ممبر لجسلیٹو کونسل بنا دیا گیا۔ شبیر وانی اور دوسرے کئی ممبران کو ٹرانسپورٹ کے رُوٹ پرمٹ اور کاروبار کیلئے امدادی رقم فراہم کی گئی۔ جیل سے باہر نکلتے ہی شبیر شاہ نے کٹھوعہ سے عوامی جلسے کرنے شروع کئے۔ پونچھ، راجوری، اُودھم پور اضلاع کا دورہ کر کے جب وہ بانہال پہنچے تو لوگوں کی نبض دیکھ کر اقتدار کے غبارے کی آدھی ہوا نکل گئی۔ باقی ماندہ ہوا جواہر سرنگ کو پار کر کے وادیٔ کشمیر میں داخل ہوتے ہی اُڑن چھو ہو گئی۔ لوگوں نے غدار کہنا شروع کر دیا۔ اور شبیر شاہ نے اپنا بیان تبدیل کرتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ کشمیر مسئلہ کے تین فریق ہیں۔ بھارت، پاکستان اور کشمیری عوام۔ ''ضمیر کا قیدی'' کے خطاب سے نوازے گئے شبیر شاہ صاحب کروڑ پتی بن گئے۔ انکم ٹیکس کے گوشوارے میں اُنھوں نے خود اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا تخمینہ سات کروڑ روپئے بتایا تھا۔ پیسے کی تقسیم کی وجہ سے ہی نعیم خان اور شبیر شاہ کے درمیان جھگڑا ہوا اور نعیم

خان اُن سے علیحدہ ہوگیا۔ کسی نے بھی یہ جانچ کرنا گوارہ نہ کیا کہ ان لیڈران کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی جب کہ یہ سبھی لوگ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرر ہے تھے۔ نہ مرکزی سرکار اور نہ ہی ریاستی سرکار نے اس طرف کوئی توجہ دی۔ لیکن 2014 کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے ان سب کو جیل میں ڈالا ہے اور منی لانڈرنگ کی تفتیش ہو رہی ہے لیکن سابقہ تجربات کی بنا پر یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ پھر کوئی باہمی مفاہمت ہو جائے اور نئی حکومت بھی پرانی روش پر چل پڑے جیسا کہ سجاد لون کے معاملہ میں ہوا۔

ایک دِن جب خالد صاحب ذاکر حسین کو ملنے امپھلا جیل گئے تو اُنھیں وہاں آئی، بی، کا ایک ڈی، ایس، پی ملا جو پونچھ میں اُن کی پوسٹنگ کے وقت تعینات تھا، علیک سلیک کے بعد اُس نے ذاکر کے بارے میں پوچھا تو خالد صاحب نے کہا کہ وہ اُسی سے ملنے جیل میں آئے ہیں۔ جب خالد صاحب نے دریافت کیا کہ وہ یہاں کس مقصد کیلئے آئے ہیں تو اس نے کہا کہ اُن کے ڈپٹی ڈائریکٹر (ڈی، آئی، جی) جاوید میر المعروف جاوید نلکا سے جیلر کے کمرے میں ملاقات کرر ہے ہیں۔ جاوید میر اپنے چھ ساتھیوں کی رہائی کے لئے کہہ رہا ہے۔ آپ بھی میر صاحب سے کہیں کہ وہ ذاکر کا نام بھی دے۔ خالد صاحب جیلر کے کمرے میں گئے۔ جاوید میر نے اُنھیں سلام کیا۔ اس سے پہلے کہ خالد حسین جاوید سے کچھ کہتے، ذاکر حسین آ گیا جب خالد صاحب نے ذاکر سے بات کی تو اُس نے سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ ہرگز نہیں۔ وہ اِن لوگوں کی سفارش پر باہر نہیں آنا چاہتا۔ سب بِکے ہوئے لوگ ہیں۔ آپ عدالتی کاروائی میں تیزی کروائیں۔ اور عدالت سے اُس کی ضمانت کرائیں۔

اُنہی دِنوں بھارت سرکار نے کئی علیحدگی پسند اور مجاہدین کمانڈروں کو خرید لیا تھا۔ کوکا پرے اور عثمان مجید کو فوج کے بل بوتے پر الیکشن لڑوایا گیا۔ ایک منسٹر بن گیا اور دوسرا ممبر اسمبلی کوکا پرے کی بیٹی کی شادی میں فوج اور خفیہ ایجنسیوں کے اعلیٰ افراد اور مقامی انتظامیہ کے لوگ

شامل ہوئے۔آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے یہ اصلی چہرے تھے۔ذاکر حسین اِن لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا جنہوں نے اُس کی زندگی خراب کردی تھی۔

ٹاڈا عدالت میں مقدمہ چلتا رہا، کشمیری پنڈت وکیل بنسی لال چٹھہ ہر پیشی پر اپنے دلائل دیتا رہا۔اُدھر خالد حسین مجاز افسران سے ذاکر کی رہائی کے لئے ملاقاتیں کرتے رہے۔ ریاستی سرکار نے معمولی جُرم کرنے والے نوجوانوں کی رہائی کے لئے ایک سکریننگ کمیٹی بنائی تھی۔جس میں ریسرچ اینڈ انیلائسس ونگ (R.A.W) انٹلی جنس بیرو (I.B) سرحدی حفاظتی پولیس، ملٹری انٹلی جنس، ریاستی سی آئی ڈی کے علاوہ ریاسی انتظامیہ سے محترمہ سشما چوہدری (ریاست کی پہلی خاتون آئی، اے، ایس افسر) اور غلام محمد ٹھاکر شامل تھے۔سیشن جج ترلوکی ناتھ بٹ کی تبدیلی کسی اور عدالت میں ہوگئی تھی اور اُن کی جگہ مرحوم سردار مہندر سنگھ ٹاڈا عدالت کے جج تعینات ہوئے تھے۔اُنہوں نے تین چار پیشیوں کے بعد ذاکر حسین اور اُس مقدمے میں ملوث تین دوسرے ملزموں کو ضمانت دے دی۔لیکن سکریننگ کمیٹی ذاکر کی رہائی کے خلاف تھی۔ایک ایسی ہی میٹنگ میں مِس سُشما چوہدری جی نے ذاکر حسین کی رہائی کے لئے زوردار وکالت کی اور کہا کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں گرفتار ہونے والا لڑکا کیسے خُونخوار ملی ٹینٹ ہوسکتا ہے۔ایجنسیوں کے الزامات سراسر غلط ہیں اور وہ خالد حسین کا بیٹا ہے جو ریاست کا ایک نامور ادیب ہے۔وہ اُسے ذاتی طور پر جانتی ہیں۔ کیونکہ خالد نے اُس کے ماتحت کام کیا ہے۔لہٰذا اُس کی رہائی کے لئے اڑچنیں نہ ڈالی جائیں۔کمشنر غلام محمد ٹھاکر نے بھی محترمہ چوہدری کی دلیل سے اتفاق کرتے ہوئے اُس کی رہائی کی مانگ کی۔فیصلہ اگلی میٹنگ تک کے لئے ٹال دیا گیا۔اسی دوران خالد صاحب کے دوست اور آئی، اے، ایس، افسر شری سُدھیر سنگھ بلوریا (جو اُس وقت محکمہ داخلہ کے کمشنر تھے اور بعد ازاں چیف سکیریٹری اور سنٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے) نے انسپکٹر

جنرل پولیس سی، آئی، ڈی شری گوپال شرما آئی، پی ایس (جو بعد میں ڈائریکٹر جنرل پولیس بنے) کو ذاکر حسین کی مِسل دی اور کہا کہ سکریننگ کمیٹی کی ہونے والی میٹنگ میں ذاکر کی رہائی ہو جانی چاہئے کیونکہ عدالت نے اس کو ضمانت دے دی ہے۔ شری گوپال شرما نے بھی میٹنگ میں ممبران کے شکوک دور کئے اور ذاکر حسین کی مشروط رہائی کی منظوری دے دی گئی۔ شرط یہ لگائی گئی کہ یا تو ذاکر کو پڑھائی کے لئے بیرون ریاست بھیجا جائے (کیونکہ اُس نے ہائر سیکنڈری (12ویں جماعت) کا امتحان اور بی، اے دوئم کا امتحان جیل میں ہی پاس کر لیا تھا) یا پھر اُس کی شادی کردی جائے۔ اس طرح 3 نومبر 1995 کو ذاکر حسین ضمانت پر گھر آ گیا۔ بنسی لال چٹہ ایک درویش صفت کشمیری پنڈت تھا۔ اُس نے کئی بے گناہ کشمیری نوجوانوں کا کیس لڑا اور اُنھیں رہائی دلائی۔ وہ پیسے کا لالچی نہیں تھا، بلکہ کئی نادار والدین کے بچوں کا کیس اُس نے مفت لڑا۔ ذاکر حسین اور اُس کے ساتھیوں کا کیس بھی وہ جانفشانی سے لڑ رہا تھا۔ اُس نے کبھی پیسے کا تقاضا نہیں کیا۔ جو بھی رقم دی گئی وہ خوشی سے قبول کی۔ خالد حسین کی نظر میں وہ ایک کرم یوگی تھا۔ ذاکر کی رہائی کی خبر بھی سب سے پہلے اُسی نے خالد کو دی تھی اور وہی ذاکر حسین کو گھر لے کر آیا تھا۔ ٹاڈا کورٹ میں ذاکر حسین کا کیس لمبے عرصہ تک چلتا رہا لیکن بی، ایل، چٹہ ہر پیشی پر حاضر ہوتا رہا۔ سرکاری وکیل اور سرکاری گواہ اُس کی جرح اور دلائل کے آگے ٹِک نہیں سکے اور بالآخر ذاکر سارے الزامات سے بری ہو گیا۔ ذاکر حسین کے بری ہونے کا سہرہ صرف اور صرف اُس کے وکیل بنسی لال چٹہ کو جاتا ہے۔ آج وہ اس دُنیا میں نہیں ہے لیکن وہ سب لوگ اُس کی آتما کی شانتی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں جن کو چٹہ صاحب نے نئی زندگی دی۔ خیر رہائی کے بعد رشتے دار اور دوست احباب مبارک دینے کیلئے آنے لگے، چند روز گہما گہمی رہی۔ خالد نے ذاکر سے پوچھا کہ کیا وہ پڑھنا چاہتا ہے یا شادی کرنا چاہتا ہے۔ ذاکر حسین نے پڑھنے سے صاف

انکار کردیا لیکن شادی کے لئے وہ تیار ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی رشتے داروں کے پاس جانے لگے لیکن کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ اُنھیں خدشہ تھا کہ کہیں ذاکر میاں دوبارہ اُسی ڈگر پر نہ چل پڑے۔ آخر مالیر کوٹلہ کے سید بشیر شاہ کی بیٹی سے رشتے کی بات کی گئی تو وہ کہنے لگا کہ آپ کی بیٹی ہے جب چاہیں بارات لے کر آجائیں۔ پندرہ دنوں کے اندر ہی ذاکر حسین کی شادی ہوگئی۔ ایس، ایس بلوریا اپنے پریوار کے ساتھ شادی میں شامل ہوئے۔ خالد کے ایک اور دوست ڈی آئی جی جموں انوپ سنگھ اور دیگر وہ سبھی لوگ شامل ہوئے جو مصیبت کی گھڑی میں خالد کے ساتھ جُڑے رہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُن پانچ سالوں میں جو ذاکر نے جیل میں کاٹے، کسی بھی سرکاری ادارے، پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی نے خالد حسین کو تنگ نہیں کیا۔ اُس کی پروموشن نہیں رکی بلکہ اچھی سے اچھی پوسٹ پر اُس کو تعینات کیا گیا۔ وہ ایڈیشنل رجسٹرار کوآپریٹیو صوبہ جموں بنا۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جموں بنا، ایڈمنسٹریٹر اوقاف جموں رہا، اور بحیثیت ڈپٹی کمشنر پونچھ بھی اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔

ڈکھاں دی روٹی، سولاں دا سالن، آہیں دا بالن بال
مائے نی میں کینوں آکھاں درد وِچھوڑے دا حال
(شاہ حسین)

ترجمہ:

دکھوں کی روٹی، کانٹوں کا سالن، آہوں کا بالن بال
ماں میں کس کو سناؤں درد جدائی کا حال

رہے نام سائیں کا

انسان درندوں کی طرح گھوم رہے ہیں
شہروں کی طرح کوئی بھی جنگل نہیں دیکھا

(نامعلوم)

1990ء میں جب ملی ٹینسی زوروں پر تھی تو وادیٔ کشمیر کے شوپیاں اور پلوامہ کے 34 پڑھے لکھے نوجوان اسلحہ چلانے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے ضلع پونچھ کے علاقے ساوجیاں اور گگریاں اور جمیا گلی کے راستے گائیڈ کی مدد سے پاکستانی انتظام والے کشمیر چلے گئے تھے۔ اُن لڑکوں کے گائیڈ کا نام غلام رسول تتر و گوجر تھا۔ تترو کو بھارتی فوج کی راشٹریہ رائفل کے کرنل نے خرید لیا تھا اور وہ فوج کا بھی مخبر بن گیا تھا۔ فوج کی بٹالین منڈی میں مقیم تھی۔ ٹریننگ لینے کے بعد جب وہ نوجوان واپس آنے لگے تو اُن کے کمانڈر نے وائرلیس کے ذریعے تترو گوجر سے رابطہ کیا۔ تترو نے اُن کو جمیا گلی کے جنگل میں ایک مخصوص جگہ پر اُس کا انتظار کرنے کو کہا اور خود منڈی میں آرمی کرنل سے ملا اور اُن کے آنے کی خبر دی۔ تترو کی بات چیت میں یہ طے پایا کہ تترو سبھی نوجوانوں کو لیکر مین روڈ پر آجائے گا جہاں ایک سول ٹرک کھڑا ہوگا۔ وہ اُن لڑکوں کو ٹرک میں سوار کر کے آرمی بیریئر تک لائے گا اور جب وہ اپنے ساتھی سمیت ٹرک سے اُتر کر فوجی بیریئر کے پاس پہنچے گا۔ وہ ٹرک پر فائرنگ شروع کردیں گے۔ اور سبھی ملی ٹینٹوں کو بھون ڈالیں گے۔ منصوبے کے مطابق تترو نے ویسا ہی کیا۔ اُس کے ساتھ فوج کا ایک اور مخبر تھا جو تترو گوجر پر نظر رکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ تترو

نے 34 لڑکوں کو جن کی عمر 18 اور 25 سال کے درمیان تھی۔ٹرک میں سوار کیا اور اُن کا اسلحہ لیکر ٹرک کے ٹول بکس میں رکھ دیا اور اُنھیں سمجھایا کہ آگے آرمی کا ناکہ لگا ہوا ہے۔اُنہوں نے بیرئر لگا کر رُکاوٹ کھڑی کی ہے اور وہ ہر گاڑی کی تلاشی لیتے ہیں۔ترو نے کہا کہ وہ آرمی جوانوں سے کہے گا کہ وہ ٹھیکیدار ہے اور لڑکے اُس کے مزدور ہیں اور وہ لوگ کام ختم کر کے منڈی اپنے گھروں کو جارہے ہیں۔اُن لڑکوں نے ترو کی بات مان کر بندوقیں اور دیگر اسلحہ اُس کے حوالے کر دیا۔پروگرام کے مطابق ٹرک جب فوجی ناکے کے پاس رُکا تو ترو ٹرک سے نیچے اُترا اور فوجی جوانوں کے پاس گیا۔جنہوں نے ٹرک کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ملی ٹینٹوں کا کمانڈر سمجھ گیا کہ گائیڈ نے اُن کے ساتھ بے ایمانی کی ہے اور وہ آرمی کے نرغے میں پھنس چکے ہیں۔ترو کا دوسرا ساتھی بھی ٹرک سے جب اُترنے لگا تو کمانڈر نے اُسے پکڑ لیا، اور کہا جو ہمارے ساتھ ہوگا وہی اُس کے ساتھ بھی ہوگا۔ایک آدھ منٹ تک جب دوسرا مخبر ٹرک سے نیچے نہیں اُترا تو فوجی جوانوں نے چاروں اطراف سے ٹرک پر فائر کھول دیا۔ٹرک کی باڈی گولیوں سے چھلنی ہوگئی اور سبھی لڑکے مارے گئے۔ سڑک پر خون ہی خون تھا۔لاشوں کو منڈی لایا گیا۔اتنے میں وہاں بریگیڈ کمانڈر بھی آگیا۔بریگیڈئر اور کرنل نے دو جوانوں کو حکم دیا کہ وہ پٹرول چھڑک کر سبھی لاشوں کو جلادیں۔لیکن موقع پر موجود پولیس کے ڈی، ایس، پی شیخ غلام احمد نے بریگیڈئر کو سمجھایا کہ ایسا کرنے سے سول ایڈمنسٹریشن کے لئے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔لہٰذا لاشوں کو دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔بریگیڈئر مان گیا لیکن کہنے لگا کہ فوج اس کام میں کوئی مدد نہیں کرے گی۔ڈی، ایس، پی شیخ غلام احمد نے رات کے بارہ بجے نیشنل کانفرنس کے مقامی بلاک صدر مرحوم غلام محمد گنائی المعروف ''ماما گنائی'' کو جگایا اور ساری بات بتائی۔ماما گنائی نے مقامی لوگوں کو جگایا۔دُکانیں کھلوائیں اور کفن کے لئے پکڑا لیا۔موضع ''سیکلو''

کے پاس ایک کھیت کے اندر تین قطاروں میں گیارہ، گیارہ قبریں کھدوائیں اور 34ویں قبر چوتھی قطار میں کھدوائی۔ باقاعدہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور صبح 5 بجے تک سبھی لاشیں دفنا دی گئیں۔ آج بھی اُن بچوں کی قبریں سیکلو میں موجود ہیں۔ یہ تمام باتیں خالد حسین کو ڈپٹی کمشنر نے خود بتائی تھیں۔ جس کا نام پی، جی دھر چکرورتی (آئی، اے ایس) تھا۔ ایس ایس پی پتمبر لال گپتا (آئی، پی، ایس) اور خالد حسین اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ پونچھ تھے۔

جن دِنوں خالد حسین ڈپٹی کمشنر پونچھ تھا، اُن ہی دِنوں وادیٔ کشمیر کے کچھ لڑکے پاکستانی انتظام والے کشمیر سے اسلحہ چلانے کی تربیت لے کر واپس آ رہے تھے اور جمیا گلی کے جنگل میں تھکاوٹ دور کرنے کے لئے آرام کر رہے تھے کہ پولیس کے مخبر نے اُن کی آمد اور سستانے والی جگہ کی خبر ایس، ایس، پی شری پنچ سکسینہ کو دی۔ وہ پولیس کی نفری لے کر موقع پر پہنچ گئے اور اُن لڑکوں کو چاروں طرف سے گھیر کر سرنڈر کرنے کے لئے کہا۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پولیس کے سامنے سرنڈر کر دیا وہ سب لڑکے ضلع پلوامہ کے تھے اور اُن میں کوئی بھی غیر کشمیری نہیں تھا۔ شری پنچ سکسینہ نے اس واقعے کی اطلاع اپنے اعلیٰ افسران ڈی، آئی، جی پونچھ۔ راجوری رینج شری رام لبھایا او انسپکٹر جنرل پولیس جموں کو دی۔ ان دونوں نے پنچ جی کو حکم دیا کہ اُن سالوں کو گولیوں سے بھون ڈالو۔ نوجوان پولیس افسر شش و پنج میں پڑ گیا کہ سرنڈر کرنے والے لڑکوں کو وہ کیوں اور کس لئے مارے۔ وہ حق حلال کی روٹی کھانے والا ایک ایماندار آئی، پی، ایس افسر تھا اور صبح شام پوجا کرتا تھا۔ جب اُس پر سنیئر افسر دباؤ ڈالنے لگے تو اُس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خالد حسین سے وائرلیس پر رابطہ قائم کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ نہتے لوگوں پر گولی چلانا قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔ لہٰذا وہ اُس کی اُلجھن دُور کریں۔ خالد حسین نے اُسے سختی سے منع کیا کہ ہتھیار ڈالنے والے کسی بھی لڑکے کو کوئی نقصان نہیں

پہنچنا چاہئے کیونکہ وہ سب کشمیری ہیں، اس لئے اِس کا ردِعمل وادیٔ کشمیر میں بہت سخت ہوگا۔ خالد حسین نے وائرلیس کے ذریعہ پنکج سکسینہ جی کو پیغام بھیجا کہ وہ گرفتار کئے گئے سبھی ملی ٹینٹوں کو پونچھ تھانے میں لیکر آئیں کیونکہ پولیس کا کام ملزموں کو پکڑنا اور اُن کو عدالت میں پیش کرنا ہے نہ کو اُن کو مارنا۔ یوں اُن لڑکوں کی زندگی بچ گئی۔ اُس وقت پونچھ میں ملی ٹینسی زوروں پر تھی۔ فوج اور پولیس کے ساتھ ملی ٹینٹوں کے مقابلے آئے دِن ہوتے رہتے۔ دونوں طرف کا جانی نقصان ہوتا۔ ملی ٹینٹوں کا اسلحہ پکڑا جاتا۔ اُن کی کمین گاہیں مسمار کردی جاتیں۔ پندرہ، بیس دِنوں کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے ڈائریکٹر جنرل پولیس سردار گوربچن جگت بذریعہ ہیلی کاپٹر پونچھ دورے پر آئے۔ اُنہوں نے ڈپٹی کمشنر کو بھی ظہرانے پر بُلایا۔ انہوں نے پولیس کے اُن جوانوں میں انعام تقسیم کئے جو اُس مہم کا حِصہ تھے جس میں 18 لڑکوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ وہ خالد حسین کے گلے ملے اور مسّرت کا اظہار کیا کہ اُس کی بروقت مداخلت سے لا اینڈ آرڈر کی حالت خراب ہونے سے بچ گئی۔ اُنہی دِنوں ایک اور بڑا واقع بالاکوٹ کے گاؤں ترکُنڈی میں ہوا۔ یہ گاؤں لائن آف کنٹرول کے بالکل ملحق تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر راجپوت مسلمان رہتے تھے لیکن ایک رات پہلے بالاکوٹ میں تعینات فوجی بٹالین کے سپاہیوں نے گاؤں والوں کے ساتھ مارکٹائی کی تھی۔ فوجی جوانوں کی زیادتی کی وجہ سے گاؤں کی پوری آبادی سرحد کے پار چلی گئی تھی اور گاؤں بے چراغ ہوچکا تھا۔ گاؤں کے نمبردار اور سرپنچ کی سربراہی میں گاؤں والوں نے سرحد پار کی تھی۔ اس واقع کی اطلاع جب ریاستی سرکار کو ملی تو چیف سیکریٹری شری اشوک جیٹلی اور ڈی، جی، پی ڈاکٹر گوربچن جگت نے خالد حسین اور پنکج سکسینہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں ترکُنڈی کا دورہ کریں اور اُن وجوہات کا پتہ لگائیں جو گاؤں والوں کی ہجرت کا سبب بنیں۔ پنکج سکسینہ اور خالد حسین جب ترکنڈی کے قریب آخری فوجی چوکی پر پہنچے

تواُنہوں نے بٹالین کے کرنل اور میجر سے ہجرت کرنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو دونوں فوجی افسر یہ ثابت کرنے میں لگے رہے کہ گاؤں والے اُگروادیوں کواپنے گھروں میں پناہ دیتے تھے۔جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کی تفتیش کی گئی۔ اُن لوگوں کے ورغلانے پر ہی سارے گاؤں والے سرحد پار چلے گئے ہیں۔جبکہ گاؤں کے پٹواری، گرام سیوک اور نائب تحصیلدار کا کہنا تھا کہ شام پانچ بجے سے لیکر صبح چھ بجے تک فوجی کسی دیہاتی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔فوج دِن رات ترکُنڈی میں گشت کرتی رہتی ہے۔اس لئے فوجی افسروں کا الزام سفید جھوٹ ہے۔جب پنکج سکسینہ اور خالد حسین گاؤں کی طرف جانے لگے تو فوج کے میجر نے اُنھیں جانے سے روک دیا اور کہا کہ سامنے والی پہاڑی پر پاکستانی فوج کی چوکی ہے اور وہ اُنھیں دیکھ کر گولیاں چلانی شروع کر دیں گے۔جب ایس، ایس، پی سکسینہ اور خالد حسین نے میجر کی بات پر دھیان نہیں دیا اور ترکُنڈی کو جاتی پگڈنڈی اُترنے لگے تو اپنے ہی فوجیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں اُن دونوں کے سروں کے اوپر سے گذر گئیں۔ اتنے میں وہی میجر آیا اور بڑے غُصّے اور بدتمیزی سے کہنے لگا۔

''میں نے آپ دونوں کو روکا تھا لیکن آپ نہیں مانے۔آپ کو جاتا دیکھ کر ہی پاکستانی فوجیوں نے گولیاں چلائی ہیں۔اگر آپ لوگوں کو کچھ ہو جاتا تو ہماری شامت آجانی تھی کہ ہم نے کیسے آپ کو ترکُنڈی جانے دیا۔'' اس پر پنکج سکسینہ جی نے بڑی سختی سے جواب دیا اور کہا

''انڈین پولیس سروس میں آنے سے پہلے میں آرمی کا کمیشنڈ افسر تھا اور لیفٹینینٹ کے عہدے پر تعینات تھا۔اس لئے مجھے بیوقوف مت بناؤ۔میں ایل، ایم، جی اور اے کے 47 اور دوسرے ہتھیاروں سے چلنے والی گولیوں کی پہچان رکھتا ہوں۔دوسری بات یہ ہے

کہ گولیاں سامنے والی پہاڑی سے نہیں بلکہ ہمارے پیچھے سے آئی ہیں اور پیچھے سے آنے والی گولیاں ہمارے اپنے جوانوں نے چلائی ہیں۔"

ایس، ایس، پی کی باتیں سُننے کے باوجود میجر ٹس سے مس نہیں ہوااور بولا کہ اُسے حکم ہے کہ وہ اُنھیں گاؤں کی طرف نہ جانے دے۔ خالد حسین اور پنچ سکسینہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ میجر نے کچھ فوجیوں کو راستے میں کھڑا کر دیا تا کہ وہ گاؤں کی طرف نہ جا سکیں۔ اتنے میں ایک بوڑھا سر پر بستر اور برتن اُٹھائے اور ایک بُڑھیا دو بھینسیں اور ایک گائے کو ہانکتے ہوئے آرہے تھے۔ جب وہ بوڑھا، بوڑھی اُن دونوں کے پاس پہنچے تو خالد حسین نے اُن سے اصل واقع جاننا چاہا لیکن وہ ڈر کے مارے کچھ بول نہیں رہے تھے۔ جب خالد نے کہا کہ وہ یہاں کے ڈی سی ہیں اور یہ ایس، ایس، پی ہیں تو وہ رونے لگے۔ انہوں نے بتایا "کل رات فوجیوں نے گاؤں والوں کی بڑی پٹائی کی۔ جوان عورتوں، لڑکیوں پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ جب مردوں نے مزاحمت کی تو اُن پر بندوقیں تان لیں اور بے رحمی سے پیٹا۔ گاؤں کے نمبر دار اور سرپنچ نے گاؤں والوں کو لائن آف کنٹرول پار کرنے کے لئے کہا۔ بوڑھے شخص نے بتایا کہ پورا گاؤں راجپوٹ مسلمانوں کا تھا اور راجپوت بے غیرت نہیں ہوتے۔ اس لئے ہجرت کر گئے۔ ہماری بیٹی ترکنڈی میں بیاہی گئی ہے۔ جب ہمیں صبح پتہ چلا تو ہم وہاں گئے۔ یہ مال مویشی اور سامان ہمارے داماد کا ہے اور ہم یہ مویشی اپنے گھر لے جا رہے ہیں تا کہ فاقہ کشی سے نہ مریں۔" رات کو خالد حسین اور پنچ صاحب راجوری چلے گئے اور وہاں ڈی، آئی، جی رام لبھایا کو ساری رپورٹ دی۔ اُسی وقت پاکستان کے سرکاری ٹیلی ویژن سے خبریں پیش کی جا رہی تھیں کہ سکرین پر ترکُنڈی کے نمبر دار کے انٹرویو کا وہ حصہ دِکھایا گیا۔ جس میں وہ اپنا جسم دِکھا رہا تھا جو زخمی تھا۔ نمبر دار وہی باتیں بتا رہا تھا جو دِن کو اُس بوڑھے شخص نے کہی تھیں۔ پونچھ پہنچتے ہی

دونوں نے ایک مشترکہ رپورٹ تیار کی اور چیف سیکریٹری اور ڈائریکٹر جنرل پولیس کو بھیج دی۔ اُس کی ایک کاپی ڈویژنل کمشنر جموں شری انل گوسوامی (جو بعد ازاں بھارت سرکار کے امور داخلہ کے سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) کو بھی بھیج دی۔ گوسوامی صاحب نے ایک چٹھی کور کمانڈر، 16۔ کور کو لکھی اور رپورٹ کی کاپی نتھی کر دی۔ کور کمانڈر صاحب نے اپنے جواب میں لکھا کہ دونوں افسر اُگروادیوں کی بولی بول رہے ہیں۔ اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ اُس رپورٹ کی نقل خالد حسین نے مجھے پڑھائی تھی۔ چند دِنوں کے بعد چیف سیکرٹری اشوک جیٹلی صاحب نے خالد حسین کو اپنے دفتر میں بُلایا اور ساری بات زبانی بھی سُنی۔ اُنہوں نے رپورٹ کے ساتھ نتھی تحصیلدار اور پولیس کے مقامی ایس، ایچ او اور بلاک افسر کے لکھتی بیان بھی پڑھے اور کہا کہ وہ بے خوف ہو کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے اور کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں جبکہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے جیٹلی صاحب سے کہا تھا کہ وہ خالد کو وہاں سے تبدیل کر دے۔ کہیں فوجی اُس کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ لیکن چیف سیکریٹری ڈاکٹر صاحب کی رائے سے متفق نہیں تھے۔

بطور ڈپٹی کمشنر پونچھ خالد حسین کو کئی مزید آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ جیسے مینڈھر تحصیل کے گاؤں ہرنی کا واقع، جہاں چار معصوم ہندوؤں کا دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہونا، اور کشمیر کی تحصیل ترال کے گاؤں چھٹی سنگھ پورہ میں 36 بے گناہ سکھوں کا قتل۔ 'ہرنی' گاؤں میں بے گناہ ہندوؤں کے قتل کی وجہ دراصل ہمارے کچھ سرپھرے فوجیوں کے احمقانہ کارنامے کا ردِعمل تھا۔ ہمارے چند فوجی شراب کے نشے میں آدھی رات کو سرحد پار کر کے ایک شادی والے گھر کی چھت پر سوئے ہوئے سات آدمیوں کے سر کاٹ کر سرحد کی اپنی طرف لے آئے تھے۔ اُن کے دھڑ پاکستان ٹیلی ویژن اپنی خبروں میں دکھا رہا تھا اور نوجوان نعرے لگا رہے تھے کہ ایک کا بدلہ سو سے لیں گے۔ خالد حسین نے ٹیلی ویژن

پر دِکھائے جانے والے مناظر خود دیکھے اور ایس، ایس، پی سکسینہ کو فون پر ساری بات سنائی اور کہا کہ وہ ضلع کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو حکم جاری کرے کہ جہاں جہاں ہندو اقلیت رہتی ہے۔اُن کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور اُن کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ ہرنی گاؤں کے پولیس اسٹیشن کے انچارج نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا، اور کوئی حفاظتی قدم نہیں اُٹھایا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دِن کے اُجالے میں تقریباً 11 بجے دہشت گردوں نے گاؤں پر دھاوا بول دیا اور چار بے قصور لوگوں کو قتل کر دیا۔ ہندو برادری نے اِس واقع کے خلاف زور دار مظاہرہ کیا۔خالد حسین اور پنکج سکسینہ پونچھ سے ہرنی گاؤں پہنچے اور لوگوں کو شانت کرنے لگے لیکن تب تک وہاں سیاسی روٹیاں سیکنے والے لوگ راجوری، پونچھ اور سورن کوٹ سے آ گئے تھے۔ وہ وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے اور تشدد پر اُتر آئے تھے۔خالد حسین اور پنکج سکسینہ اُنہیں پُر امن رہنے کی تاکید کرتے رہے اور سمجھانے لگے کہ ارتھیوں کا کریا کرم شام ہونے سے پہلے پہلے کرنا ضروری ہے کیونکہ اِس علاقے میں ملی ٹینٹوں کی کمین گاہیں پہاڑیوں میں ہیں اور وہ صورتِ حال کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، لیکن احتجاج کرنے والے پاکستان کے خلاف اپنے پردھان منتری شری اٹل بہاری واجپائی اور وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے خلاف لگاتار نعرے بازی کرتے رہے۔اُن کا مطالبہ تھا کہ وزیر اعظم جب تک یہاں خود نہیں آئیں گے وہ لاشوں کا انتم سنسکار نہیں ہونے دیں گے۔اُسی وقت ہیلی کاپٹر کے ذریعے انسپکٹر جنرل پولیس پر مجیت سنگھ ِگل (جو بعد ازاں پنجاب پولیس کے ڈائریکٹر جنرل بنے) وہاں پہنچے۔ ِگل صاحب اور خالد حسین نے لوگوں سے کہا کہ امن بنائے رکھیں اور کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں، جس کی وجہ سے دہشت گردوں کو نئی واردات کرنے کا موقع ملے۔اُنہوں نے کہا کہ وہ سرکار کے نمائندے ہیں اور عوام کے جذبات پرائم منسٹر اور چیف منسٹر صاحبان تک پہنچا دیں گے۔فی الحال شام ہو رہی ہے لہٰذا شہیدوں کا انتم سنسکار ہونے

دیں۔ باقی لوگوں کی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ راجوری، نوشہرہ اور پونچھ سے آئے لوگ آہستہ آہستہ جانے لگے۔ شام ہونے تک صرف مقامی لوگ رہ گئے۔ پولیس کے سپاہیوں نے لکڑی کا بندوبست کرلیا تھا اور چتائیں بنالی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں اور پولیس وانتظامیہ کے اہلکاروں نے لاشوں کا انتم سنسکار کردیا۔ یہ واقع 4-3/ اپریل 2000 کا ہے۔

اسی مہینے یعنی اپریل میں ترال کے موضع چھٹی سنگھ پورہ میں 36 بے گناہ سکھوں کو بندوق دھاریوں نے شہید کردیا تھا۔ ایک ہاہا کار مچ گیا۔ پوری ریاست اور بیرون ریاست بڑے بڑے جلوس نکلنے شروع ہوگئے۔ سرکار نے سبھی ڈپٹی کمشنروں کو وائرلیس کے ذریعے اس واردات کی اطلاع دے دی تھی تاکہ وہ اپنے اپنے ضلع میں امن قائم رکھنے کے لئے ہر ضروری قدم اُٹھائیں۔ اُس واردات سے ایک روز پہلے خالد حسین دو دِن کی چھٹی لیکر اپنے ننھیال ڈوڈو (تحصیل لاٹی) تعزیت کے لئے گیا تھا۔ جہاں اُس کے برادرِ نسبتی (اہلیہ کے پھوپھی زاد) منظور کو دہشت گردوں نے مار دیا تھا۔ ابھی وہ وہاں پہنچا ہی تھا کہ بارڈر سکیورٹی فورس کا ایک ڈی، ایس، پی سرکاری گاڑی لیکر پہنچ گیا اُس نے کہا کہ ڈویژنل کمشنر صاحب کا حکم ہے کہ وہ فوراً اپنے ہیڈکوارٹر پہنچیں۔ اسی لئے وہ سرکاری گاڑی لیکر آیا ہے۔ فاتحہ خوانی کے بعد خالد وہاں سے اُدھم پور پہنچا۔ جہاں ڈپٹی کمشنر ادھم پور محمد سعید خان نے کار تیار رکھی تھی۔ چائے کا کپ پینے کے بعد خالد حسین ریاسی، پونی اور کالا کوٹ کے راستے راجوری پہنچا۔ جہاں ڈپٹی کمشنر بشیر احمد رونیال کھانے پر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد خالد حسین رونیال صاحب کی کار میں بھمبر گلی پہنچا جہاں اُس کی سرکاری کار اور سیکورٹی کا عملہ اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ خالد حسین مینڈھر کے راستے تقریباً رات دو بجے پونچھ پہنچ گیا۔ اُسی وقت ایڈشنل ڈپٹی کمشنر قلندریہ صاحب، اے، سی ریونیو اور تحصیلدار پہنچ گئے اور اُنہوں نے بتایا کہ کل پونچھ میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا

جارہا ہے۔جس میں سکھوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان بھی شامل ہوں گے۔اُسی وقت ایس،
ایس، پی پنکج سکسینہ بھی آ گئے اور باہم مشورے سے حکمتِ عملی بنانے لگے کہ کل کے جلوس
کے دوران امن وامان کو کس طرح برقرار رکھتا ہے۔خالد حسین کا خیال تھا کہ وہ بھی جلوس
میں شامل ہوں گے۔اس سے لوگوں میں اچھا پیغام جائے گا کہ ضلع کی انتظامیہ بھی اس دُکھ
کی گھڑی میں عوام کے ساتھ ہے۔صبح 10 بجے کے قریب کرشن چندر پارک سے ایک بڑا
جلوس نِکلا۔خالد حسین اور قلندریہ صاحب جلوس میں شامل تھے۔پونچھ قلعہ کے پاس خالد
حسین نے ایک دُھواں دھار تقریر کی اور کہا کہ دہشت گردوں اور قاتلوں کا کوئی مذہب نہیں
ہوتا۔مرکزی اور ریاستی سرکار نے چھٹی سنگھ پورہ کی ظالمانہ کاروائی کی سخت ترین الفاظ میں
مذّمت کی ہے۔اُنہوں نے سکھ بھائیوں سے کہا کہ وہ شہیدوں کی آتما کی شانتی کے لئے
گورودوارہ صاحب میں اکھنڈ پاٹھ رکھیں اور واہیگورو سچے پادشاہ سے ارداس کریں کہ وہ
شہیدوں کی قربانی کو قبول کرتے ہوئے پورے دیش میں امن اور شانتی بنائے رکھے تاکہ
صدیوں کا آپسی بھائی چارہ قائم رہے۔لوگ شانت ہوکر اپنے گھروں کو چلے گئے۔
بھوگ والے دِن خالد حسین نے گورودوارے میں آکر ماتھا ٹیکا اور سنگت کے سامنے اپنے
خیالات رکھے اور لنگر کی سیوا بھی کی اس طرح پونچھ میں حالات کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔
دہشت گردی کی اُس کاروائی کا الزام بھارت سرکار نے پاکستان پر لگایا تھا اور کہا
تھا کہ دہشت گرد آئی، ایس، آئی اور لشکر طیبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔چند روز کے بعد فوج
اور سیکورٹی فورس نے دعویٰ کیا کہ چھٹی سنگھ پورہ میں واردات کرنے والے پانچ دہشت گرد
ہلاک کردیئے گئے ہیں۔جبکہ مقامی لوگوں نے اُن کو مقامی باشندے قرار دیا اور کہا کہ اُن
کو گھروں اور دُوکانوں سے اُٹھا کر سیکورٹی فورس والے لے گئے تھے۔اس پر پورے
کشمیر میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ہڑتالیں اور جلوس نکالے گئے۔عدالتی حکم سے قبر کشائی

کی گئی اور نام نہاد دہشت گردوں کی لاشوں کو باہر نکالا گیا۔ اُن کا ڈی، این اے ٹیسٹ کیا گیا اور ثابت ہو گیا کہ پانچ معصوم نوجوانوں کو بلّی کا بکرا بنا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے ایک انکوائری کمیشن بنایا جس کی رپورٹ کبھی نہیں آئی۔ ترال کی مقامی سکھ برادری اور حریت والے اُس واردات کو دہشت گردی کی کاروائی نہیں مانتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ کام اکھوانیوں (وہ بندوق بردار جو فوج نے پال رکھے ہیں اور جو فوج اور سکیورٹی فورسز کے کہنے پر وارداتیں انجام دیتے ہیں اور مخبری کا کام بھی کرتے ہیں) کا ہے، لیکن لوگوں کی پُرزور مانگ کے باوجود سرکار نے کوئی انکوائری نہیں کرائی۔ چھٹی سنگھ پورے کی واردات امریکی صدر مسٹر کلنٹن کے دورہ کے وقت ہوئی تھی اور جب صحافیوں نے امریکی صدر سے اُس واردات کے بارے میں اُن کی رائے پوچھی تو اُنہوں نے کہا تھا کہ اس واردات کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ البتہ جو معصوم لوگ مرے ہیں وہ اُن کی وجہ سے ہی مرے ہیں۔ یہ بات کہہ کر امریکی صدر نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

پونچھ ضلع کے پہاڑی علاقوں میں سرکاری سکولوں کے ٹیچر اکثر اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتے۔ وہ اپنی جگہ بے روزگار پڑھے لکھے نوجوانوں کو تین چار ہزار ماہوار پر دور دراز علاقوں کے سکولوں میں پڑھانے کے لئے رکھ لیتے اور مستقل اسکول ماسٹر گھر بیٹھے کوئی کاروبار کرتے یا لیڈری کرتے۔ بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان حاصل ہونے والی رقم کو اپنا جیب خرچ سمجھ کر سکول کھولتے، بند کرتے اور بچوں کو پڑھاتے۔ خالد حسین نے ضلع کے سکولوں کی حالت سدھارنے اور سرکاری اُستادوں پر نکیل کسنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔

پونچھ پوسٹینگ کے دروان خالد حسین کو چند ذہین نوجوانوں کا ساتھ ملا جو علم وادب سے شغف رکھتے تھے۔ اُن کے لئے خالد حسین کی سرکاری کوٹھی کے دروازے کھلے رہتے۔ اُن میں ڈاکٹر لیاقت جعفری، سوامی انتر نیرو اور انور خان ایسے نوجوان تھے جو بہت اچھے شاعر

تھے۔اُن کے تعاون سے خالد حسین نے پونچھ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد مشاعرہ کروایا۔لیاقت جعفری کی مشاورت سے اردو کے نامور شاعر جناب بشیر بدر کو پونچھ لایا گیا۔ اور "ایک شام بشیر بدر کے نام" کے عنوان سے مشاعرہ ہوا۔جس میں صرف بشیر بدر شاعر تھے اور ڈیڑھ ہزار ادب نواز سننے والے۔راجوری کے ڈپٹی کمشنر اور ایس،ایس،پی خصوصی طور پر بشیر بدر کو سننے کے لئے آئے تھے۔پروگرام کی ساری کاروائی ڈاکٹر لیاقت جعفری نے انجام دی۔اُس نے بڑی خوبصورتی سے پروگرام کنڈیکٹ کیا حالانکہ نظامت کرنے کا یہ اُس کا پہلا تجربہ تھا۔اسی دروان سرکار نے پنچایت الیکشن کروانے کا فیصلہ کیا۔پنچایت الیکشن خالد حسین کے لئے ایک بڑا چیلنج تھا لیکن سوامی انتر نیرو، خالد میر، انور خان اور لیاقت جعفری نے اُس کی بڑی مدد کی۔الیکشن کا دفتر خالد حسین نے اپنی سرکاری کوٹھی کے برآمدے میں لگایا۔اُس کی ہدایت کے مطابق یہ نو جوان کام کرنے لگے۔سارا کاغذی کام انہی نوجوانوں نے کیا۔پنچایت الیکشن کامیابی سے انجام کو پہنچا۔کوئی ناخوشگوار واقع نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ نے خالد حسین کی عزت رکھ لی۔دوسرے سال لیاقت جعفری کے مشورے سے نِدا فاضلی اور سردار پنچھی کو پونچھ بُلایا گیا۔خالد حسین کا دوست سردار پرتپال سنگھ بیتاب بھی مدعو تھا۔وہ مشاعرہ بھی بڑا کامیاب رہا۔واپسی کے سفر میں سردار پنچھی ہر آدھے پونے گھنٹے کے بعد پیشاب کرنے کیلئے کار رُکواتا۔جب کار کالی دھار کی چڑھائی چڑھ رہی تھی تو خالد حسین نے نِدا فاضلی سے پوچھا "حضور! چائے نوش فرمائیں گے"، تو اُنہوں نے کہا "ضرور"۔ وہاں ایک ڈھابے پر بہت عمدہ چائے بنتی تھی۔کار وہاں روکی گئی۔چائے کا آرڈر دیا گیا۔نِدا فاضلی، بیتاب اور خالد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔اتنے میں سردار پنچھی نے خالد حسین سے پوچھا "یار خالد! جموں اب کتنی دُور رہ گیا ہے؟"، تو خالد حسین کے مونہہ سے بے ساختہ نکلا "بس دو پیشاب"۔سب ہنس پڑے۔نِدا فاضلی کے تو ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔وہ جہاں

بھی مشاعرہ پڑھنے جاتے تو اکثر سردار پنچھی والا لطیفہ سُنایا کرتے۔''ایک شام بشیر بدر کے نام'' والا تجربہ دُہراتے ہوئے خالد حسین نے اپنے دوست اور مشہور پنجابی شاعر سُرجیت پاتر کو جموں آنے کی دعوت دی۔ سُرجیت پاتر کی دی ہوئی تاریخ کے مطابق کلچرا کادمی کے ''ابھینو تھیٹر'' میں ''اِک شام پاتر دے ناں'' کے عنوان سے پروگرام مرتب کیا گیا۔ کارڈ چھپوائے گئے۔ کارڈ بانٹے گئے۔ شام پانچ بجے کا پروگرام تھا۔ صبح چھ بجے سرجیت پاتر سے خالد حسین نے بات کی۔ اُس نے کہا کہ وہ بے فکر رہے۔ وہ وریام سندھو (مشہور کہانی کار) کو ساتھ لیکر وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جائے گا۔ سُرجیت پاتر کے نام پر سارا ہال بھر گیا۔ سُرجیت پاتر سے خالد نے پھر رابطہ کیا تو وہ کہنے لگا کہ وہ مادھو پور میں چائے پی رہے ہیں اور بس نکلنے وہی والے ہیں۔ خالد حسین نے کہا کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ اُن کا بے تابی سے انتظار ہو رہا ہے۔ فوراً پہنچو۔ پانچ بج گئے۔ چھ بج گئے۔ لیکن پاتر کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔ خالد فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو فون بند۔ خالد حسین نے پروگرام شروع کر دیا اور نہایت مودبانہ انداز میں سامعین وحاضرین سے کہنے لگا کہ سُرجیت پاتر صاحب تھوڑی دیر میں تشریف لا رہے ہیں دراصل اُن کی کار خراب ہو گئی تھی۔ اُس کو ٹھیک کرانے میں وقت لگ گیا لیکن سامعین فکر نہ کریں، وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ جب تک پاتر صاحب تشریف لاتے ہیں وہ آپ کو چند لطیفے سناتے ہیں تا کہ آپ کی بوریت ختم ہو۔ خالد حسین نے لطیفے سنانے شروع کئے۔ سات بجنے کو تھے۔ لطیفوں کا سٹاک ختم ہو رہا تھا کہ اتنے میں سٹیج پر سُرجیت پاتر اور وریام سندھو نشے میں جھومتے تشریف لائے۔ خالد حسین نے شُکر کا کلمہ پڑا۔ انتظار کرتے کرتے آدھا ہال خالی ہو چکا تھا لیکن جب وریام سندھو نے نظامت شروع اور سُرجیت پاتر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو سامعین پاتر کی شاعری کے نشے میں جھومنے لگے۔ واہ واہی ہونے لگی۔ کوک کی بوتل میں وہسکی کے گھونٹ پاتر اور وریام وقفے وقفے سے پیتے رہے۔

پاٹ ترنم میں اپنی غزلیں سناتا رہا اور لوگ فرمائش کرتے رہے کہ فلاں غزل سنائی جائے۔ رات کے دس بجے تک دونوں شیر کے بچوں نے سامعین کو باندھ کر رکھا۔ ہوٹل کے کمرے میں جب خالد حسین باز پرس کرنے لگا تو کہنے لگے۔ "یار! مادھو پور بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ نہر کے کنارے بیٹھ کر راوی دریا کا دُکھ بانٹنے کے لئے ہم نے وہسکی پینی شروع کی۔ ہم نے راوی کے پانی کا مکھ موڑ کر اچھا نہیں کیا۔ لاہور بیچارہ پیاسا مر جائے گا۔ اُس کے کھیت سوکھ جائیں گے۔ یہ سیاست دان پاگل کیوں ہوتے ہیں کہ قدرت کے نظام کو لگام لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سالے، خرام خور، بس، راوی کا درد ہم سے سہا نہیں گیا اور ہم نے وہسکی کی پوری بوتل پی ڈالی۔ تم بتاؤ یار خالد! ہم نے اچھا کیا نا۔ اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ پھر ہم نے کوکا کولا کی بوتل منگوائی۔ آدھا کوک پھینک دیا اور پھر اُس میں وہسکی ڈال کر بوتل پھر بھر لی اور وہاں سے چل پڑے۔ لیکن تُو تو خوش ہو جا۔ تیرا پروگرام تو کامیاب ہو گیا۔ ہم نے تو تمہارے جھنڈے گاڑھ دیئے ہیں۔ تُو جا اب گھر۔ ہماری بھابھی تیرا انتظار کرتی ہو گی۔" ایسے تھے خالد حسین کے ادبی اور غیر ادبی دوست۔ میرا نام محمد بشیر بٹ ہے۔ جب خالد حسین راجوری میں اے، سی، ڈی تھا تو میں وہاں تحصیلدار تھا اور جب وہ پونچھ میں ڈپٹی کمشنر بن کر آیا تو میں وہاں اسسٹنٹ کمشنر ریونیو تھا۔ ہم دونوں بے تکلف دوست تھے حالانکہ ڈی، سی ہونے کے ناطے وہ میرا باس تھا لیکن اُس نے کبھی باس ہونے کا احساس نہیں کرایا۔ بلکہ وہ اپنے غم اور خوشیاں مجھ سے بانٹتا رہتا تھا۔ خدا مغفرت کرے۔

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں
(بشیر بدرؔ)

تُو غفُور ہے تُو رحیم ہے

شہر کا شہر کوئی دفن ہے اس مٹی میں
کھودو بنیاد، تو دیوار نکل آتی ہے
(لیاقت جعفری)

انکل خالد حسین کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی ڈاکٹر سمعیہ تبسم اور داماد انجینئر محمد ایوب وانی کے دو بیٹے، گوہر ایوب اور احمر ایوب ہیں۔ دونوں انجینئر ہیں اور ماشاءاللہ دونوں برسرِ روزگار ہیں۔ دوسری بیٹی ڈاکٹر ہُما تبسم اور داماد ڈاکٹر عشرت چوہدری کے بھی دو بیٹے آریب چوہدری اور ارحم چوہدری ہیں۔ آریب ایم، بی، بی، ایس کر رہا ہے جبکہ ارحم کسی ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ بیٹا ذاکر حسین اپنا ریسٹورینٹ چلا رہا ہے اور علیحدہ اپنے مکان میں رہ رہا ہے جو محلہ دلپتیاں میں ہے۔ اُس کی دو بیٹیاں زارا فردوس اور رمشا فردوس دونوں ایم، بی، بی، ایس کر رہی ہیں۔ زارا کی ڈگری میں صرف انٹرن شپ باقی رہ گئی ہے۔ جبکہ رمشا چھٹے سمسٹر میں ہے۔

دوسرا بیٹا یاسر عمران ہے جس کی دو بیٹیاں آئرہ فردوس اور علیشبہ اور بیٹا یشب خالد ہے۔ یشب آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا ہے جبکہ آئرہ چوتھی جماعت میں ہے اور علیشبہ ایک سال کی ہے۔ ذاکر اور فرحت کے دو بیٹے بھی تھے لیکن ایک پچاس دنوں بعد نمونیہ سے فوت ہو گیا جبکہ دوسرا مردہ پیدا ہوا۔ یہ صدمے کیا کم تھے کہ انکل خالد ایک اور سانحہ سے ہل گئے۔

ہوا یوں کہ جب ان کا پوتا یشب خالد پونے دو سال کا تھا تو انکل کے ڈرائیور راج کمار

نے بلیرو جیپ ریسورس کرتے ہوئے ایک ٹائر یشب کے پیٹ پر چڑھا دیا جو بلیرو کے پاس کھیل رہا تھا۔ یشب بے ہوش ہوگیا۔ یاسر اُسے فوراً ہسپتال لے گیا۔ میڈیکل کالج جموں میں ڈاکٹروں نے اُس کا ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ کیا تو پتہ چلا کہ یشت کا کلیجہ پھٹ چکا ہے اور انفیکشن سارے پیٹ میں پھیل چکی ہے۔ یشب کا فوراً آپریشن کیا گیا اور آدھا کلیجہ کاٹ کر باہر نکال دیا باقی کا حصہ سی دیا۔ یشب کے پیٹ کی صفائی کر کے اور ٹانکے لگا کر یشب کو ایمرجنسی وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ وہ بے ہوش تھا اور دوسرے دن بھی اُسے ہوش نہیں آیا اور نہ ہی کوئی ڈاکٹر اُسے دیکھنے آیا۔ صرف ہاؤس جاب کرنے والے دو ڈاکٹر موجود تھے۔ جن کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اتوار ہونے کی وجہ سے کوئی ڈاکٹر فون بھی نہیں اُٹھا رہا تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں ڈاکٹروں کی ایسی ہی لاپرواہی مریضوں کی موت کا سبب بنتی ہے۔ خالد انکل نے مشہور سرجن ڈاکٹر طارق آزاد سے بات کی۔ انہوں نے یشب کا دوبارہ الٹراساؤنڈ کیا۔ اُنھیں الٹراساؤنڈ میں بہت زیادہ گڑبڑ دِکھائی دی۔ اُنہوں نے خالد انکل کو مشورہ دیا کہ یشب کو فوراً دہلی، چنڈی گڑھ یا لدھیانہ لے جائیں کیونکہ بچے کی حالت بہت نازک ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ جموں میں ڈاکٹروں نے کیس بگاڑ دیا ہے۔

خالد انکل کے ایک قریبی دوست جو مالیر کوٹلہ میں رہتے ہیں اور جن کا نام عارف حلیم ہے، اُس کا بھانجا ڈاکٹر نوید اسلم دیانند میڈیکل کالج ہسپال (DMC) لدھیانہ میں دِل کے امراض کا ڈاکٹر ہے اور میڈیکل کالج کا پروفیسر بھی۔ خالد حسین صاحب نے ڈاکٹر نوید اسلم کو فون ملایا اور یشب کی نازک حالت کے بارے میں بتایا۔ اُس نے کہا کہ بچے کو فوراً ڈی، ایم، سی لدھیانہ میں لایا جائے کیونکہ اس ہسپتال میں ایشیا کا نامور بچوں کا سرجن کام کرتا ہے۔ آپ کے آنے تک وہ اُس سے بات کر لے گا اور بچے کا فوراً علاج شروع ہوجائیگا۔ ڈاکٹر نوید اسلم طالب علمی کے زمانے سے ہی خالد انکل کی بہت عزّت کرتا تھا اور

عارف حلیم اور طاہر حلیم کی طرح خالد انکل کو بھی ماما جی کہتا تھا۔ ایمبولینس کا انتظام کیا گیا۔ یشب کی ماں اور میری بڑی بہن ثنا فاروق، بہنوئی یاسر عمران اور میں ایمبولینس میں یشب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک ڈاکٹر اور ایک نرس بھی ہمارے ساتھ تھے جو یشب کو طبی امداد دینے کے لئے ڈاکٹر طارق آزاد نے بھیجے تھے۔ میرا نام مستقیم بیگ ہے اور آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں یشب کا ماموں ہوں۔ خالد انکل بھائی ذاکر حسین، سمی دیدی اور خالد انکل کے بھانجے اعجاز بھائی اپنی کار میں سوار، ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چھ گھنٹے میں ہماری ایمبولینس ڈی، ایم، سی ہسپتال کے ایمرجنسی بلاک کے سامنے پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نوید اسلم دو ڈاکٹروں نرسوں اور دیگر عملے ساتھ گیٹ پر کھڑے تھے۔ یشب کو فوراً انتہائی نگہداشت یونٹ (ICU) میں لے جایا گیا۔ اُس کے سارے ضروری ٹیسٹ کئے گئے۔ دوسرے دِن صبح بچوں کے خصوصی سرجن ڈاکٹر آر، جے، سنگھ نے انکل خالد کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔

"آپ نے ایک مردہ لاش کو یہاں لایا ہے۔ ۹۰ فیصد انفیکشن بچے کے اندر پھیل چکی ہے لیکن میں پھر بھی چانس لینا چاہتا ہوں اور آپ کے پوتے کا دوبارہ آپریشن کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہے تو اجازت نامے کے فارم پر دستخط کر دیں۔ انکل خالد حسین نے فارم پر دستخط کر دیئے۔ دِن کے گیارہ بجے یشب کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ تین گھنٹے تک یشب کا آپریشن ہوتا رہا۔ میری بہن اس ساری مدّت میں نفل پڑھتی رہی۔ دُعائیں مانگتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ تین گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر سے یشب کو آئی سی یُو میں شفٹ کیا گیا۔ ڈاکٹر آر، جے، سنگھ نے خالد انکل کو اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ واہیگورو کی کرپا سے آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ آگے مالک کی مرضی۔ یشب کی خوراک والی نالی (Food pipe) کٹ گئی تھی۔ پِتّا بھی (spleen) پنچر ہوا تھا جس کی وجہ سے زہر پیٹ

میں پھیل چکا تھا۔ اس کے علاوہ دو انتڑیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ انتڑیوں اور خوراک والی پائپ کو سی دیا گیا ہے۔ پیٹ کی پوری صفائی کردی گئی ہے۔ وہ اپنی طرف سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ اب آپ سب اپنے رب سے دُعا مانگیں۔ یشب کو آئی، سی، یُو میں تقریباً 20 دِن رکھا گیا۔ ڈاکٹر آر، جے، سنگھ ہر روز اُس کی ڈریسنگ خود کرتے تھے۔ کِسی جونیئر ڈاکٹر کو ڈریسنگ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ دِن میں دو تین بار یشب کو دیکھنے کے لئے آتے، کئی بار اُن کے ساتھ میڈیکل سٹوڈنٹ بھی ہوتے جن کو وہ مریض کی کیس ہسٹری سمجھاتے۔ یشب کئی دِنوں تک بے ہوش رہا۔ اُس کے جسم پر گلوکوز کے علاوہ تین چار قسم کی دوائیوں کے ڈرپ لگے ہوئے تھے۔ چوتھے دِن جب یشب کو ہوش آیا تو وہ درد سے کراہنے لگا۔ ڈاکٹر سنگھ کو بلایا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اُسے نیند کا ٹیکہ لگایا اور وہ سو گیا۔ ڈاکٹر سنگھ 18 دِنوں تک خود ڈریسنگ کرتے رہے۔ اٹھارہ روز کے بعد یشب کا پھر ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ کرایا گیا۔ اور اسے منہ کے راستے ہلکی اور نرم خوراک دی گئی۔ اُسے چکن سُوپ دیا گیا۔ دودھ پلایا گیا۔ جب وہ خوراک ہضم کرنے لگا تو ڈاکٹر آر، جے سنگھ اُسے دوبارہ آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ اُن کے ساتھ میڈیکل سٹوڈنٹ بھی تھے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب نے اُس کے پیٹ کو کھلا رکھا تھا اور وہ یہ تسلی کرنا چاہتے تھے کہ جس خوراک والی نالی اور انتڑیوں کو اُنہوں نے جوڑا ہے، وہ صحیح کام کرنے لگی ہیں اور پِتا بھی جُڑ چکا ہے یا نہیں جب اُنہوں نے ہر طرح سے تسلی کر لی تو اُنہوں نے پیٹ کو سی دیا۔ وہ اپنے طالب علموں کو بھی عملی ٹریننگ دے رہے تھے۔ اُس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جونیئر ڈاکٹر اور نرسوں کو کہا کہ آئندہ سے یشب کی ڈریسنگ وہ خود کیا کریں۔ ساتھ ہی انہوں نے حکم دیا کہ ساری ڈرپ نکال دی جائیں۔ اور بچے کو سپیشل روم میں شفٹ کیا جائے۔ اُدھر یشب کی دادی، نانی، بہنیں زارہ اور رمشا اُس کی شفایابی کے لئے دُعا مانگتی رہیں۔ یشب کے نام کا صدقہ دیا گیا۔

درگاہوں پر دیگیں چڑھائی گئیں۔ مسجدوں میں دُعائیں کرائیں گئیں۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب جونیئر ڈاکٹر ہی اُس کی ڈریسنگ کرتے۔ ڈاکٹر سنگھ صبح شام اُس کو دیکھنے آتے۔ یشب کے جگر سے بائل (گندہ پانی) نکالنے کے لئے اُسے پلاسٹک کی تھیلی لگائی گئی۔ وہ اب ہلکی غذا کھانے لگا۔ ہسپتال کے باہر ایک ہوٹل میں انکل خالد نے دو کمرے لئے تھے جن میں اعجاز بھائی، ذاکر بھائی، یاسر بھائی، سمی دیدی اور دیگر جموں سے آنے والے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ثنا دیدی یشب کے پاس ہی رہتی تھی۔ یشب کی حالت میں دن بہ دن سدھار آنے لگا۔ اب وہ ہسپتال سے دی جانے والی خوراک کھانے لگا۔ ہندوستان بھر سے کئی ڈاکٹر یشب کو دیکھنے آنے لگے۔ ڈاکٹر آر، جے، سنگھ نے یشب کے آپریشن کی ویڈیو فلم بنائی تھی جو وہ ڈاکٹروں کو دِکھاتے۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد ڈاکٹر سنگھ نے خالد انکل کو اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا۔

''یشب خالد اب پوری طرح خطرے سے باہر ہے۔ آپ اسے گھر لے جا سکتے ہیں لیکن مہینے میں دو بار چیک اپ کے لئے ڈی، ایم، سی میں لانا ہوگا۔ جموں میں یشب کو ایک ایسے کمرے میں رکھا جائے جہاں انفیکشن ہونے کا ڈر نہ ہو۔ بستر کی چادریں، کمرے کے پردے اور فرش کو روزانہ فرنائل یا ڈیٹول سے صاف کیا جائے۔ جو بھی یشب کے پاس جائے اُس کے مونہہ پر ماسک ہو اور ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے ہوں۔ یہ احتیاط بہت ضروری ہے۔

جموں میں یشب کو پندرہ بیس دِنوں کے لئے اُس کی پھوپھی ڈاکٹر سمعیہ تبسم کے گھر رکھا گیا۔ تاکہ رشتے داروں اور دوستوں کی آوا جائی سے انفیکشن کے خطرے کو ٹالا جا سکے۔ دو مہینوں میں چار بار یشب کو ڈی، ایم، سی لدھیانہ چیک اپ کے لئے لے جایا گیا پھر مہینے میں ایک بار۔ پھر دو مہینے میں ایک بار اور پھر ڈاکٹر سنگھ کی ہدایت کے مطابق چھ مہینے میں ایک بار۔ یشب کو نئی زندگی ملی تھی جس کے لئے خالد حسین ہمیشہ اللہ سائیں کے آگے سر

بہ سجود رہتے اور ڈاکٹر آر، جے، سنگھ کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک فرشتہ کہتے جس نے یشب کے جسم میں نئی روح پھونکی تھی۔ آج یشب خالد ماشاءاللہ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا ہے اور اپنی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ وہ اپنے نانا فاروق بیگ اور نانی فرحت بانو اور بہنوں زارا، رمشا، آئرہ اور علیشبہ کی جان ہے۔ وہ اپنی دادی، پھوپھیوں اور تایا ابّو کا راج دُلارا ہے۔

خلیل اللہ قاضی عُرف ببلو خالد حسین کا بھانجا بھی تھا اور بڑی بہن کی بیٹی آصفہ کا خاوند بھی۔ ببلو کے دو بیٹے ہیں۔ ذیشان اور فیضان، ایک انجینئر ہے اور دوسرا جموں یونیورسٹی میں قانون پڑھ رہا ہے اور تیسرے سال کا طالب علم ہے۔ ببلو مضبوط جسم کا طاقتور پہلوان، ہمدرد اور رشتے نبھانے والا نوجوان تھا۔ شادی بیاہ یا فوتگی کے موقع پر وہ قرابت داروں، ہمسایوں اور دوستوں کے گھروں میں سارا انتظام کرتا۔ یہاں تک کہ چار پانچ سو مہمانوں کا کھانا بھی وہ خود بناتا۔ پوری برادری کے لئے وہ انمول اثاثہ تھا۔ پیشے سے وہ وکیل تھا۔ اُس نے بہوجن سماج پارٹی کی ٹکٹ پر دو بار رام نگر سے الیکشن لڑا لیکن دونوں بار ہار گیا۔ پہلی بار تو تین سو ووٹوں کے معمولی فرق سے ہارا۔ خالد انکل کی بڑی بیٹی کی شادی پر سارا کام اُسی کی زیرنگرانی ہوا۔ دعوت کے لئے منگوائے گئے سارے بکرے اُسی نے ذبح کئے اور نہ فقط سارا گوشت کاٹا بلکہ کھانا پکانے والوں کی بھی پوری مدد کی۔ ذاکر حسین اور یاسر عمران کی شادیوں کی ذمے داری اُسی نے نبھائی۔ خلیل اللہ قاضی یعنی خالد انکل کا ببلو سادہ طبیعت کا بے عیب نوجوان تھا۔ وہ کوئی نشہ نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے کبھی سگریٹ نوشی بھی نہیں کی۔ پھر نہ جانے کیوں اُسے جگر (Lever) کی بیماری لاحق ہوئی۔ کلیجہ خراب ہونے کا پتہ اُسے تب چلا جب وہ سر گنگا رام ہسپتال دہلی میں اپنا چیک اپ کرانے گیا۔ وہ خاموشی سے اپنا علاج کراتا رہا لیکن اپنی بیماری کے بارے میں کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ

دن بہ دن کمزور ہوتا گیا۔ ایک رات جب وہ بے ہوش ہو گیا تو انکل خالد کی بھانجی اور ببلو کی بیوی آصفہ نے ذاکر بھائی کو فون کیا۔ ذاکر بھائی فوراً اُسے میڈیکل کالج ہسپتال لے گیا۔ وہ کوما میں جا چکا تھا۔ اُسے کوئی ہوش نہیں تھی۔ مقامی ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور اُسے دہلی منتقل کرنے کے لئے کہا۔ رام نگر میں اُس کے والدین (قاضی عباد اللہ اور انور سلطانہ) کو اطلاع دی گئی۔ وہ دوڑے دوڑے جموں پہنچے۔ ایمبولینس بُک کی گئی۔ انکل خالد کے دوست نے اپولو ہسپتال کے ڈاکٹر راہُل گپتا سے بات کی اور ببلو کو سیدھا اپولو ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں تین دنِ تک ڈاکٹر راہل گپتا نے اُس کا علاج کیا اور اُسے کوما سے باہر نکالا۔ پھر ڈاکٹر گپتا نے اُنھیں سر گنگا رام ہسپتال شفٹ کرنے کا مشورہ دیا تا کہ اُس کا لیور ٹرانسپلانٹ کیا جا سکے۔ کیونکہ کلیجہ مکمل طور پر سکڑ چکا تھا۔ ببلُو کے ساتھ اُس کا بھائی نور اللہ قاضی، ہم زلف اور خالہ زاد اعجاز بٹ اور بہنیں بھی گئی تھیں۔ گنگا رام ہسپتال کے سامنے راجند نگر کالونی میں ایک پورا فلیٹ کرایہ پر لیا گیا۔ ببلو کو گنگا رام ہسپتال میں داخل کرایا گیا، اور اُس کا علاج شروع ہوا۔ اُس کے ٹیسٹ لئے گئے ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کیا گیا، اور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ لیور ٹرانسپلانٹ کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق جگر بھی اپنے خونی رشتے دار کا ہی لیا جا سکتا ہے۔ بھائی نور اللہ قاضی، بہن تہمینہ اور تسمینہ کے ٹیسٹ لے گئے لیکن کسی کا بھی جگر اس قابل نہیں تھا کہ اُس کا کچھ حصہ کاٹ کر ببلو کو لگایا جا سکے۔ یہاں خدا کی خدائی پر ایمان لانا لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ حکمت والا اور بڑا کارساز ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ببلُو اور اُس کی بہن سمینہ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ سمینہ کو گھر میں سبھی ببلی بُلاتے تھے۔ ببلی کا جگر ڈاکٹروں کے مطابق موزوں تھا۔ اُس کے خاوند مصطفی نے اجازت دے دی۔ عدالتی کارروائی مکمل کی گئی۔ ببلی کے جگر کا ایک ٹکڑا پیوندکاری سے ببلو کے لیور سے جوڑ دیا گیا۔ 18 گھنٹے تک آپریشن ہوا اور کئی خصوصی سرجن

اس آپریشن کا حصہ بنے تھے۔ آپریشن گنگا رام ہسپتال میں ہوا۔ بہت ہی پیچیدہ آپریشن تھا۔ ڈاکٹروں نے ہنرمندی سے لیور ٹرانسپلاٹ کیا تھا۔ دونوں بہن بھائی ڈاکٹروں کی نگرانی میں آہستہ آستہ صحت یاب ہونے لگے۔ ببلی کو بیس دِنوں کے بعد ہسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ جبکہ ببلُو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد بھی چار مہینے تک دہلی میں رہا۔ اس کے ٹیسٹ لگاتار ہوتے رہے۔ چیک اپ ہوتا رہا۔ لاکھوں روپئے کا خرچہ ہوا لیکن اللہ کے کرم سے زندگی بچ گئی۔ خالد انکل تین چار بار اُس کی عیادت کے لئے دہلی گئے۔ دس سال تک خلیل اللہ قاضی بالکل ٹھیک رہا لیکن سال میں تین بار اُس کو چیک اپ کے لئے دہلی جانا پڑتا تھا۔ دوائیاں اور خوراک ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق لیتا لیکن کرونا وبا کی پہلی لہر میں ہر جگہ جو افراتفری مچی تھی اور دہلی کو تقریباً تین چار مہینے لاک ڈاؤن میں رکھا گیا تھا تو اس کی وجہ سے ببلو دہلی نہیں جا سکا۔ اُس کا پیلیا (Hypatitus) بہت زیادہ بڑھ گیا اور جگر نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ لاک ڈاؤن میں ہی اُسے دہلی لے جایا گیا لیکن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ ببلو واپس جموں آ گیا اور چند دِنوں کے بعد یہ دُنیا چھوڑ کر مالک حقیقی کے پاس چلا گیا۔

اسی طرح کا صدمہ خالد انکل کو تین سال پہلے بھی برداشت کرنا پڑا۔ اُن کی بڑی بہُو فرحت بانو ایک سگھڑ گھریلو عورت تھی امور خانہ داری میں ماہر، مہمان نواز اور رشتوں کو عزت دینے والی خاتون تھی۔ اُس نے اپنی بچیوں کی پرورش اپنی بساط سے بڑھ کر کی۔ اُس کی بڑی بیٹی زارا فردوس کی ایڈمیشن جب میڈیکل کالج میں ہوئی تو خالد انکل کے ساتھ وہ بھی زارا کو چھوڑنے کے لئے گئی۔ واپس آنے کے بعد وہ بیمار رہنے لگی۔ جب اُس کے ٹیسٹ کرائے گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ فرحت بھابی کینسر میں مبتلا ہے۔ ذاکر حسین یہ سُن کر رونے لگا۔ انکل خالد نے اُسے حوصلہ دیا اور اُسی رات بذریعہ ریل دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی

پہنچتے ہی سیدھا گنگا رام ہسپتال گئے۔ اُنھوں نے فرحت بھابھی کے سارے ٹیسٹ کیے اور بتایا کہ فرحت کا آپریشن ضروری ہے۔ چنانچہ اُس کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد فرحت اپنے سسر خالد انکل، خاوند ذاکر حسین اور چھوٹی بیٹی رمشا کے ہمراہ واپس جموں آ گئی۔ اُس کی کیموتھریپی شروع ہوئی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اُنھیں سرینگر کے صورہ ہسپتال میں بھرتی کیا گیا لیکن بے سود، آخر آپریشن کے ٹھیک دس مہینے بعد فرحت بانو فوت ہو گئی۔ خالد انکل مستقل طور پر ذاکر حسین کے گھر آ گیا۔ گھر کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ رمشا بھی ایم، بی، ایس کے لئے بیرون ملک جا چکی تھی۔ گھر میں صرف باپ بیٹا رہ گئے۔ انکل خالد نے ذاکر کو بٹھنڈی چلنے کے لئے کئی بار کہا لیکن وہ نہیں مانا اُس کا کہنا تھا کہ دلپتیاں والے مکان میں اُس کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ لہٰذا وہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ ذاکر خود کھانا بناتا، گھریلو ملازمہ گھر کی صفائی وغیرہ تو کر دیتی لیکن دیگر امور سے وہ ناواقف تھی۔ خانہ آبادی کا منظر نامہ خانہ بدوشی میں بدل گیا تھا۔ ایک سال اسی طرح گذر گیا۔ سمی دیدی، اور آنٹی دوسری شادی کیلئے ذاکر پر زور ڈالنے لگے۔ انکل خالد بھی چاہتے تھے کہ ذاکر حسین شادی کر لے لیکن وہ تیار نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اس کی دو جوان بیٹیاں ہیں اور وہ کبھی برداشت نہیں کریں گی کہ اُن کا باپ اُن پر سوتیلی ماں لے کر آئے۔ ایک دِن ذاکر بھائی نے انکل خالد سے کہا کہ اُن کے مرحوم دوست داؤد بٹ کی صاحبزادی عاصمہ غیر شادی شدہ خاتون ہے۔ والدین کی وفات کے بعد اُس کو گھر کی ذمے داریاں سنبھالنی پڑیں تھیں جس کی وجہ سے اُس نے شادی نہیں کی۔ وہ انتہائی شریف اور دیندار خاتون ہے اگر اُس کے گھر بات کی جائے تو وہ شادی کے لئے تیار ہے۔ خالد انکل یوں تو عاصمہ کے پورے کنبے کو جانتے تھے پھر بھی اُنھوں نے دوست احباب سے پوچھ گچھ کی تو سب نے عاصمہ کو ایک مثالی خاتون بتایا۔ خالد انکل کی

بڑی بیٹی سمی دیدی (ڈاکٹر سمعیہ تبسم) نے عاصمہ کے بہنوئی اور کلاس فیلو شیخ جاوید سے بات کی۔اُن دونوں کی کوشش سے یہ رشتہ طے ہوگیا۔خالد انکل نے اپنی پوتیوں کو سمجھایا اور بتایا کہ اُن کا باپ گھر کا سارا کام خود کرر ہا ہے۔کل کو جب اُن کی شادیاں ہوجائیں گی تو وہ بالکل اکیلا ہوجائے گا۔وہ دونوں بھی پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک ہیں۔اس لئے وہ باپ کوشادی کی اجازت دے دیں۔آخر شادی ہوئی۔خالد انکل کی دونوں پوتیاں شادی میں شامل ہوئیں۔اپنے حُسن سلوک سے عاصمہ نے دونوں کے دِلوں کو جیت لیا۔ذاکر بھائی کی بیٹیاں عاصمہ سے گھُل مل گئیں۔گھر میں دوبارہ چہل پہل آگئی۔عاصمہ سکول ٹیچر تھی۔اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ادب پڑھنے والی،خلیل جبران، ناظم حکمت،ٹیگوراور دیگر عالمی ادب کے شاہسواروں کواُس نے پڑھا ہے۔اُس نے بھائی ذاکر کے گھر کوسنوارا ہے۔اُس کے پورے خاندان کواپنایا ہے اوراپنا گرویدہ بنایا ہے۔پوتیاں عاصمہ پر جان چھڑکتی ہیں اور خالد انکل مرتے دم تک عاصمہ کودعائیں دیتے رہے۔

فرشتے مبتلائے آزمائش ہوں تو چیخ اُٹھیں
یہ انساں ہے جو دیتا جارہا امتحاں اپنا
(اقبالؔ)

بھنور جال

سیاست کی اپنی الگ اک زباں ہے
لکھا ہو جو اقرار، اِنکار پڑھنا
(بشیر بدرؔ)

بھارتی زیر انتظام ریاست جموں وکشمیر کے تین حصے تھے جن کی نسل، زبان، ثقافت، تاریخ، موسم، لباس، کھان پان، ادب اور سنگیت غرض آپس میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ صوبہ لداخ، جس میں تبتی گھرانے کی بولیاں بوٹی، لداخی، بلتی پرُگی وغیرہ بولی جاتی ہیں، اُن کا نسلی اور ثقافتی رشتہ، تبت اور درد گروپ سے ملتا ہے۔ جبکہ ضلع کرگل معہ دراس میں، پرُگی، بلتی اور شینا اور لداخی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہاں رہنے والوں کا نسلی اور ثقافتی رشتہ گلگت بلتستان اور چین کے صوبے سنکیانگ سے ملتا ہے۔ ضلع لیہہ کا رقبہ 45110 مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار ہے۔ کرگل ضلع کا رقبہ 14086 مربع کلومیٹر ہے۔ اور آبادی ایک لاکھ پینتالیس ہزار ہے جن میں اکثریت شیعہ مسلک کی ہے۔ لداخ میں پرُگی اور لداخی جبکہ کرگل میں 78 فیصد آبادی بلتی بولتی ہے اور بٹالک میں 10 فیصد لوگ شینا / دردی اور زنسکار میں بوٹی / بودھی بھی بولی جاتی ہے۔ ضلع لیہہ میں 75 فیصد آبادی بودھ مت کو ماننے والی ہے۔ جبکہ بیس فیصد لوگ مسلمان ہیں اور زیادہ تر سُنی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ وادی کشمیر ریاست کا دوسرا صوبہ ہے۔ جس کی تہذیب اور ثقافت پر وسط ایشیا کے ممالک کا اثر ہے۔ اسلام سے پہلے بودھ مذہب اور ویدک دھرم کا بول بالا تھا کشمیر شیوازم کا ایک بڑا مرکز

تھا۔ویدک دھرم اور بودھ کلچر یا گندھارا تہذیب کی نشانیاں کشمیر میں ہر جگہ بکھری پڑی ہیں۔وادئ کشمیر کی طرح لداخ خطے میں بھی اسلام چودہویں صدی عیسوی میں آیا۔کشمیر صوبے کا رقبہ 16 ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً 80 لاکھ ہے۔جس میں 96.05 فیصد مسلمان ہیں تقریباً 50 ہزار کشمیری پنڈت ہیں اور 80 ہزار کے قریب سکھ رہتے ہیں جبکہ پنڈتوں کی تقریباً ساڑھے تین لاکھ آبادی 1990ء میں کشمیر سے ہجرت کر گئی تھی۔کشمیری نسل دراصل آرین اور درد گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔جو کہ پانچ ہزار سال پرانی نسلی تہذیب ہے۔کشمیر میں 90 فیصد لوگ کشمیری زبان بولتے ہیں جو کہ پانچ ہزار سال پرانی زبان ہے اور جو دارد ک اور انڈو آریائی زبان سنسکرت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔اسلام کے آنے کے بعد یعنی چودہویں صدی کے بعد اس زبان میں فارسی،عربی اور وسط ایشیا کی بولیوں کا بھی اثر پڑا۔کشمیری کا اپنا رسم الخط شاردا ہے۔جواب کوئی بھی استعمال نہیں کرتا۔کشمیر کی اپنی الگ زبان، ثقافت، رہن سہن، خوراک، سنگیت بالکل مختلف ہے جو نہ تو لداخ صوبے کے ساتھ ملتا ہے اور نہ ہی جموں صوبے کے ساتھ۔تیسرا صوبہ جموں ہے جسکا کل رقبہ 26 ہزار تین سو مربع کلومیٹر ہے۔جبکہ صوبہ جموں کا 13 ہزار تین سو مربع کلومیٹر علاقہ پاکستان کے زیر قبضہ ہے۔بھارتی زیر انتظام جموں صوبہ کی کل آبادی 55 لالاکھ کے قریب ہے۔آبادی کا تناسب اس طرح ہے۔61 فیصد ہندو، 35 فیصد مسلمان اور 4 فیصد سکھ اور عیسائی۔ڈوڈہ، کشتوار، رام بن، راجوری اور پونچھ اضلاع میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔جبکہ جموں، کٹھوعہ، اُدھم پور، سانبہ اور ریاسی اضلاع میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔یہاں بولی جانے والی زبانوں میں سب سے بڑی ڈوگری پھر پہاڑی (پوٹھواری) گوجری اور پنجابی ہیں۔ان کے علاوہ ڈوڈہ اور رام بن ضلع میں سراجی بولی بھی بولی جاتی ہے۔یہ سب زبانیں پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ انڈو۔آریائی زبانوں پالی اور سنسکرت سے نِکلی ہیں۔جموں کے لوگوں کی نسل،

ثقافت، رہن سہن سنگیت تاریخ، موسم اور کھان پان سب پنجاب سے اور کچھ حد تک ہماچل پردیش (سابقہ پنجاب) سے ملتا ہے۔ پاکستانی انتظام والے جموں وکشمیر کا کل رقبہ تقریباً 91 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ جس میں سے 5 ہزار مربع کلومیٹر پاکستان نے چین کو پٹے پر دیا ہوا ہے اور 73 ہزار کلومیٹر گلگت بلتستان کا رقبہ ہے جو خنجراب درّہ سے چین کے ساتھ ملتا ہے۔ گلگت بلتستان کا نظم ونسق پاکستان کے پاس ہے اور وہ اُسے جلد اپنے ایک صوبے کا درجہ دینے جا رہا ہے۔ جبکہ آزاد کشمیر کا رقبہ 13 ہزار مربع کلومیٹر ہے اور آبادی لگ بھگ 45 لاکھ نفوس ہے۔ اور اس کے دس اضلاع میں ضلع نیلم کو چھوڑ کر باقی 9 اضلاع کے لوگ پنجابی نسل سے تعلق رکھتے یں۔ نیلم سمیت پاکستانی انتظام والے اس خطہ کی ثقافت، زبان، رہن سہن، سب پنجاب سے ملتا ہے۔ پورے خطہ میں پہاڑی (پوٹھواری) پنجابی اور گوجری بولی جاتی ہے۔ ریاست کی تقسیم سے پہلے صوبہ کشمیر کی تجارت مظفر آباد کے راستے راولپنڈی سے ہوتی تھی۔ جبکہ صوبہ جموں کی تجارت سیالکوٹ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اسی طرح صوبہ لداخ کی تجارت تبت کے ساتھ ہوتی تھی۔

گلگت بلتستان کا جغرافیہ، نسل، ثقافت جموں یا کشمیر کے ساتھ نہیں ملتا۔ البتہ بھارتی زیر انتظام والے لداخ کے ضلع کرگل اور دراس کی ثقافت اور بولیاں گلگت بلتستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ گلگت بلتستان کی آبادی 15 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور یہاں تبّتی اور دردی گھرانے کی بولیاں بلتی پرُگی، دردی، شینا، بوٹی اور برُشسکی وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ گلگت بلتستان کا ضلع ہنزہ، چلاس اور کلاش قبیلے کے علاقوں میں برُشسکی، شینا بولیاں بولی جاتی ہیں۔ پرُگی بلتی زبان کی dialect ہے۔ یہاں بولی جانے والی زبانوں کا تناسب اس طرح ہے پرُگی/بلتی 78 فیصدی، شینا 9 فیصد، دردی 2 فیصد بوٹی 6 فیصد، برُشسگی ودیگر 5 فیصد۔ گلگت بلتستان کی تین ڈویژن ہیں وہاں کی الگ اسمبلی ہے جس کے ممبران کی

تعداد 33 ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے زیرانتظام جموں وکشمیر میں کشمیری بولنے والے 2فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں۔حالانکہ کشمیری نسل کے لوگ پاکستانی پنجاب کے شہر، لاہور، گوجرنوالہ، سیالکوٹ، جہلم اور راولپنڈی میں کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ جن کے آباواجداد معاشی مجبوری یا شخصی راج کی بربریت کی وجہ سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے شہروں میں آباد ہو گئے تھے لیکن اُن کی کشمیری شناخت اور ثقافت اکثریتی ثقافت میں گم ہو چکی۔ جیسے ہمارے ہاں کشمیری پنڈتوں کی ثقافت اور زبان اکثریتی ثقافتی یلغار میں ختم ہو رہی ہے۔ پنڈتوں کی نئی نسل اپنی زبان اور ثقافت سے دور ہوتی جارہی ہے۔صوبہ جموں چھوٹے چھوٹے راجواڑوں اور جاگیرداروں کی علمداری میں رہا اور یہ سب پنجاب کی حکومت یعنی لاہور دربار کے باز گذار رہے۔ یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ یعنی ڈوگرے راجپوت، پنجاب یا ہماچل کے پہاڑی راجوں کی فوج میں بھرتی ہوکر اپنی گھر گرہستی چلاتے تھے جبکہ باقی ماندہ لوگ کھیتی باڑی یا بیوپار کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جموں صوبے کی کوئی مستند تاریخ نہیں لکھی جاسکی۔ جبکہ کشمیر ایک خودمختار ہمالیائی ملک تھا جس پر چودھویں صدی کی دوسری دہائی تک ہندو راجگان نے حکومت کی۔ کشمیر میں تاریخ لکھنے کا بھی رواج تھا۔ چنانچہ کلہن پنڈت نے اپنی جلیل القدر تاریخ راج ترنگنی میں 1150ء تک کے کشمیر اور اُس پر حکومت کرنے والے راجگان کا سنسکرت بھاشا میں ذکر کیا۔اُس کے بعد جون راج نے اپنی راج ترنگنی میں 1450ء تک کی تاریخ کو قلم بند کیا۔جس میں لداخ کے راجکمار رنچن شاہ کا کشمیر آنا۔آخری راجہ سہدیو کا منگول فوجی سپہ سالار کے ہاتھوں شکست کھانا،اُس کے سیناپتی رام چندر رینہ کا مارا جانا اور پھر رنچن شاہ کا تخت پر قبضہ کرنا اور اُس کا مسلمان بننا۔اُس کی موت کے بعد شمس الدین شاہ میری کا کشمیر کے تخت پر قبضہ کرنا اور زین العابدین (بڈشاہ) تک کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ جون راج کے بعد اُس کے شاگرد شری ور نے کشمیر پر

مغلوں کے قابض ہونے تک کے واقعات درج کیئے۔ غرض کشمیر کی تاریخ کے تمام واقعات ہم کو کتابی روپ میں ملتے ہیں جبکہ جموں میں الگ سے اتہاس لکھنے کی روایت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جموں پنجاب کے ایک حصے کے طور پر ہی جانا جاتا رہا۔ جبکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ بنایا اور خود اکھنور کے مقام پر اس کی تاج پوشی کی۔ اُس کے بعد کی تاریخ کا مکمل احوال ملتا ہے۔ یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو معلوم ہو کہ نہ 1947 سے پہلے اور نہ بعد میں ریاست کے خطوں کا ثقافتی، تہذیبی اور لسانی رشتہ آپس میں ملتا ہے۔ کشمیر کی تاریخ جس میں کلہن پنڈت اور جوٗن راج کی راج ترنگنی شامل ہے، بتاتی ہے کہ کشمیر پر کشمیری نسل اور کشمیری زبان بولنے والا کوئی بھی شخص تخت پر کبھی نہیں بیٹھا۔ راجہ ہرش وردھن، راجہ اونتی ورمن سے لیکر رنچن شاہ، شاہمیری بادشاہت اور پوست شاہ چک تک کوئی بھی راجہ کشمیری نسل سے نہیں تھا، لیکن اُن حاکموں نے کشمیر کے عوام کی خدمت کی۔ اُن کے دل جیتنے کی کوشش کی۔ جموں اور لداخ ہمیشہ کشمیر سے الگ تھے۔ وہاں مقامی راجے حکومت کرتے رہے گو کہ وہ کسی نہ کسی مرکز کے باج گذار تھے۔ کشمیر میں بیرونی حکمرانوں کے خلاف سب سے پہلے مغلوں کے وقت میں آوازیں اُٹھنا شروع ہوئیں۔ مغلوں کی حکمرانی پٹھانوں نے ختم کی اور کشمیر پر 57 سال تک حکومت کی۔ پٹھانوں کی حکومت سکھوں نے ختم کی اور 29 سال تک کشمیر پر راج کیا۔ مغلوں، پٹھانوں اور سکھوں کے راج میں کشمیر میں بغاوت کے سُر اُبھرتے رہے۔ لوگوں میں بے چینی بڑھتی رہی۔ قحط سالی، بے جا ٹیکس لگانے کی وجہ سے لوگ بدحالی اور پسماندگی کی اندھی کھائی میں ڈوب کر رہ گئے۔ اپنی زمینوں کے مالک وہ نہیں رہے بلکہ کاشتکار بن گئے اور صرف آدھی فصل کے حق دار ہوئے۔ کشمیر کے سیاسی اور معاشی حالات پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں لیکن سر والٹر آر، لارنس کی کتاب ''ویلی آف کشمیر'' (1895) محمد دین فوقؔ کی کتاب A complete History

History of اور پی، این، کے بامزئی کی کتاب of Kashmir Ancient Kashmir اہم ہیں۔اس کے علاوہ لداخ کے رہنے والے ایک خانسامے یا انگریز سیاحوں کی چاکری کرنے والے ایک شخص غلام رسول گلوان نے بھی انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے Servant of Sahibs۔غلام رسول گلوان انگریز سیاح اور مہم جو لوگوں کیساتھ تقریباً بیس پچیس سال تک شاہراہ ریشم پر لداخ سے وسط ایشیا کے ممالک کا سفر کرتا رہا۔خاص کر سمرقند، نجارا، یارقند، تبت اور کاشغر وغیرہ۔ انگریزوں کے ساتھ ایک لمبا عرصہ رہنے کی وجہ سے وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ گیا تھا۔جبھی اُس نے انگریزی میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''نوکر صاحب لوگوں کا'' لکھ ڈالی۔ایک ایسے ہی سفر میں وہ مشہور انگریز ادیب اور فوجی افسر Lieutenant colonel sir Francis Edward young husband (جو کوہ مری پاکستان میں 13 مئی 1863ء کو پیدا ہوا اور 31 جولائی 1942ء میں انگلینڈ میں مرا) کے ساتھ 1904ء میں ہمسفر رہا۔جب وہ جانے لگا تو گلوان نے اپنی کتاب کا مسودہ اُسے دیا اور گذارش کی کہ وہ اُس مسودہ کی نوک پلک سنوار کر چھپوادیں۔اس کتاب کو ہم سفر نامہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اصل میں یہ کتاب کشمیر اور لداخ کے لوگوں کی حالت زار کا خلاصہ کرتی ہے۔ برطانیہ پہنچنے پر ینگ ہسبنڈ نے یہ مسودہ اپنے ایک پروفیسر دوست کو دیا تا کہ وہ اس کی زبان درست کرے۔لیکن چھ مہنے کے بعد وہ پروفیسر دوست مسودہ کو اس کی اصل حالت میں اُسے واپس کر گیا اور کہہ گیا کہ اس کتاب کا مسودہ جوں کا توں چھاپ دیا جائے۔ ینگ ہسبنڈ نے کتاب کا پیش لفظ لکھا اور کتاب چھپوادی۔آج تک اس کتاب کی تقریباً دس لاکھ کاپیاں بک چکی ہیں اور اس کا شمار Best Sellers میں ہوتا ہے۔(حال ہی میں چین اور بھارت کی فوجوں کے درمیان ''گلوان وادی میں جو جھڑپ ہوئی، وہ غلام رسول گلوان کے نام سے ہی منسوب ہے۔)

پنجاب میں سکھوں کا راج ختم ہوتے ہی کمپنی سرکار (انگریز سرکار) نے کشمیر پر بھی قبضہ کرلیا اور بعدازاں اُسے راجہ گلاب سنگھ جموال کو 75 لاکھ روپئے (نانک شاہی سکہ) میں بیچ دیا۔ خرید وفروخت کی اس دستاویز کو ''بیع نامہ امرتسر'' یا "Treaty of Amritsar" کہتے ہیں جو 16 مارچ 1846ء کو لکھا گیا۔ اس دستاویز کی کاپیاں ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے وادیٔ کشمیر پر راجہ گلاب سنگھ کی مشروط حاکمیت کمپنی سرکار نے تسلیم کی۔ معاہدے کی شرائط کے مطابق گلاب سنگھ کو مہاراجہ کا خطاب عطا کیا گیا اور اُسے کمپنی سرکار کو سالانہ خراج دینے کا پابند کیا گیا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کی اولاد انگریز سرکار کو خراج دیتی رہے گی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو جمہوریت کا علمبردار کہنے والی انگریز سرکار نے کشمیری عوام کی مرضی جانے بغیر انھیں اوران کی زمین کو مال مویشیوں کی طرح بیچ ڈالا۔ کشمیر میں ڈوگرہ شاہی قائم ہوتے ہی مہاراجہ نے کئی اہم اقدامات اُٹھائے جن کی بدولت کشمیر پر اُس کی فوجی اور انتظامیہ پکڑ مضبوط تر ہوتی گئی۔ سکھوں اور کشمیری مسلمانوں کو انتظامیہ عہدوں سے ہٹادیا گیا۔ جموں اور پنجاب کے لوگوں کو کشمیریوں پر مسلط کیا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر پر اپنا شکنجہ کسنے کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ کشتواڑ کے راستے ڈوگرہ فوج نے جنرل زورآور سنگھ کی کمانڈ میں زنسکار اور لداخ پر فوج کشی کی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے تبت کی راجدھانی لہاسہ تک جا پہنچی لیکن شدت کی سردی کی تاب نہ لاکر جنرل زورآور سنگھ شہید ہوگئے اور فوج بھی ماری گئی۔ پھر گلگت بلتستان کا رُخ کیا لیکن کمپنی سرکار نے اس علاقے کی جغرافیائی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ خطہ اپنے کنٹرول میں رکھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ، مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور مہاراجہ ہری سنگھ کے ڈوگرہ راج میں کوئی کشمیری مسلمان فوج میں بھرتی نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی کسی اہم عہدے پر لگ سکتا تھا جبکہ جموں، اور پنجاب کے

راجپوتوں اور مسلمانوں کے علاوہ صوبہ سرحد اور یہاں تک کہ افغانستان کے مسلمان بھی ڈوگرہ فوج میں بڑے بڑے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ڈوگروں کے ساتھ ساتھ پنجابی مسلمان بھی اعلیٰ انتظامیہ عہدوں پر تعینات رہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کشمیر کے لوگوں کو محکومیت کا احساس بار بار دلایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں بھی جاری رہا۔ حالانکہ انہوں نے کئی انقلابی قدم بھی اٹھائے جن کا زیادہ فائدہ جموں صوبے کو ملا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈوگرہ شاہی کے خلاف شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں ایک زوردار تحریک کا آغاز ہوا اور 13 جولائی 1931ء میں ڈوگرہ فوج کے ہاتھوں 22 نہتے کشمیریوں کی شہادت نے اس تحریک کو جلا بخشنے کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے ریاست کے مسلمانوں نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک چلائی، کشمیر کی آزادی کی تحریک صرف جموں کشمیر تک محدود تھی اور ڈوگرہ شاہی کے خلاف تھی۔ جموں کے ہندو مہاراجہ کے ساتھ تھے جبکہ کشمیری ڈوگرہ شاہی کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ریاست میں بھی ڈوگرہ شاہی کا خاتمہ ہوا لیکن قبائلی حملہ اور مہاراجہ کا ہندوستان کے ساتھ مشروط الحاق کرنے کی وجہ سے دونوں ملکوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ پونچھ حویلی، باغ، سدھنوتی، میرپور، کوٹلی، بھمبر کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ہندوؤں کا قتل عام ہوا۔ تقریباً 60 ہزار ہندو اور سکھ مارے گئے۔ عورتوں کی عصمت دری اور اغوا ہوا۔ جبکہ ہندو اکثریتی علاقوں، ریاسی ادھم پور، جموں، سانبہ اور کٹھوعہ کے اضلاع میں تقریباً اڑھائی لاکھ مسلمان مارے گئے اور عورتوں کا اغوا اور عصمت دری کی لرزہ خیز داستانیں الگ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست بھی تقسیم ہوگئی۔ لگ بھگ آدھا رقبہ پاکستان اور چین کے قبضے میں چلا گیا۔ اِس تاریخی پس منظر کا بیان اس لئے ضروری تھا کہ کشمیر کے مسئلے کی اصلیت کو موٹے طور پر جانا جائے۔

خالد حسین مسئلہ کشمیر اور اُس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کا چشم دید گواہ تھا۔ اگست 1953ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری اور لوگوں کا شیخ عبداللہ اور آزادی کے حق میں ایجی ٹیشن کرنے اور اس پر قابو پانے کے لئے مرکزی سرکار کی طرف سے طاقت کا بے جا استعمال کرنے کے واقعات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے حالانکہ اُس وقت خالد حسین کی عمر نو سال کی تھی۔ فوج نے ساری وادی کو یرغمال بنالیا تھا۔ پوری وادی میں کرفیو لگا دیا گیا تھا پھر بھی احتجاجی مظاہروں میں تقریباً چار ہزار کشمیری شہید کردیئے گئے۔ بخشی غلام محمد کو مرکزی سرکار نے جموں کشمیر کا وزیر اعظم بنایا۔ کشمیریوں کو بھارت کے حق میں کرنے اور شیخ عبداللہ کی لیڈر شپ پر قدغن لگانے کے لئے خرید و فروخت کا کاروبار جو ایک بار شروع ہوا تو مسلسل چلتا رہا۔ مرکزی سرکار نے کروڑوں روپئے رائے شماری کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے حواریوں میں بانٹے لیکن بخشی غلام محمد جب شیخ صاحب کی عوامی مقبولیت کو کم نہیں کر سکا تو کامراج پلان کے تحت 1963ء میں بخشی صاحب کی حکومت ختم کردی گئی اور شمس الدین 90 دِنوں کے لئے وزیر اعظم بنایا گیا۔ دسمبر 1963ء میں موئے مقدس کا کانڈ ہوا تو وادیٔ کشمیر کی لگ بھگ ساری آبادی گھروں سے باہر سڑکوں پر آگئی اور احتجاج کرنے لگی۔ بھارت سرکار کو صورتِ حال سنبھالی مشکل ہوگئی۔ آئی، بی کے چیف مسٹر ملک کی سربراہی میں ایک ٹیم کشمیر بھیجی گئی۔ موئے مقدس بازیاب کرالیا گیا لیکن چوری کیسے ہوئی اور کس نے کی اس بات کا خلاصہ کبھی نہیں ہوا۔ اس کانڈ کی وجہ سے شمس الدین کو 29 جنوری 1964ء کو وزارت چھوڑنی پڑی۔ ان سب حالات کو خالد حسین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ شیخ عبداللہ جیل میں تھے۔ پیر میرک شاہ اور مولانا محمد سعید مسعودی کی گواہی کے بعد موئے مقدس کی اصلیت اور اعتباریت بحال ہوئی اور یوں ایجی ٹیشن ختم ہوئی۔ مرکزی سرکار نے خواجہ غلام محمد صادق کو عنانِ حکومت سونپی۔ 1965ء کے ابتدائی مہینوں میں

(آپریشن جبرالٹر کے تحت) پاکستان نے کشمیر میں گوریلا جنگ کے لئے درانداز بھیجے جنہوں نے راجوری ضلع کے بدھل علاقے پر قبضہ کرلیا اور لورن کے راستے توش میدان میں ٹھکانے بنائے۔ محمد دین نامی گوجر نے دراندازی کرنے والوں کے بارے میں فوج کو ''آگاہ'' کیا اور فوج نے اُن کے خلاف کاروائی شروع کی۔ اپنے آپ کو مجاہد کہنے والے یہ نوجوان پورے کشمیر میں کاروائیاں کرنے لگے۔ ایک بار جب فوجی قافلہ بٹہ مالو (ٹٹو میدان اور آج کا بس اڈہ) سے گذر رہا تھا تو اُس پر فائرنگ زیارت بٹہ مالو کی طرف سے کی گئی۔ فوج نے جوابی کاروائی میں تقریباً سات سو مکانات جلادیئے۔ یہ مکانات وزیراعلیٰ غلام محمد صادق کے آبائی محلے میں جلے تھے۔ لوگوں کو عارضی کیمپوں میں رکھا گیا۔ آج کا زیارت بٹہ مالو 1965ء کے بعد بنایا گیا۔ 1965ء کی جنگ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگ سرحد پار چلے گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد صادق صاحب کی کوششوں سے ایک لاکھ واپس آگئے جبکہ باقی وہاں مستقل طور پر ہجرت کر گئے۔ یہ صادق صاحب ہی تھے جن کے کندھے پر بندوق رکھ کر صدر ریاست گورنر بنے اور وزیراعظم کا عہدہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا گیا اور صادق صاحب پہلے وزیراعلیٰ بنے۔ دستاویزِ الحاق کا کچومر نکال دیا گیا مہاراجہ ہری سنگھ کو تو پہلے ہی ریاست بدر کردیا گیا تھا اب اُس کے الحاق نامے کی دھجیاں اُڑادی گئیں۔ پھر بھی دعوے ہے کہ الحاق پکا اور ریاست اٹوٹ انگ ہے۔ کانگریسی سرکار نے آئین کی دفعہ 370 کو بچوں کے ربڑ سے مٹانا شروع کیا اور آہستہ آہستہ پوری دفعہ کو کھوکھلا بنادیا گیا۔ اس دفعہ کا ذکرِ خیر صرف لوگوں کی خوش فہمی کے لئے ہوتا رہا۔ خواجہ غلام محمد، صادق، میر قاسم و دیگر کشمیری لیڈر مرکزی سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر وہ قدم اٹھاتے رہے جو ان کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا۔ عوامی رائے عامہ فضول بن گئی۔ خالد حسین اُس وقت سرکاری ملازمت میں تھا اور پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ جموں میں وہ روزنامہ ''سندیش،

'عمارت' اور 'وقت' کی ادارت کرتا رہا۔ جبکہ سرینگر میں روزنامہ ''زمیندار''، ''روشنی''، ''پولیٹکل ٹائمز'' کا اعزازی مدیر رہا اور ابنِ حسین کے نام سے لکھتا رہا۔ ریاست میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں اور غیر جمہوری حادثوں کے بارے میں وہ اخبارات میں لکھتا رہا۔ ستمبر 1965ء کی ہند پاک جنگ ہوئی اور پھر تاشقند معاہدہ ہوا۔ دونوں ملکوں نے ریاست جموں کشمیر سمیت ایک دوسرے کے علاقے واپس کردیئے جن پر انہوں نے قبضہ کیا تھا۔ پھر 1971ء کی جنگ ہوئی پاکستان ٹوٹ گیا۔ کچھ اپنی غلطیوں کی وجہ سے اور کچھ ہندوستان کی فوجی مدد کے کارن۔ شملہ معاہدہ ہوا۔ پھر ایک دوسرے کے جیتے ہوئے علاقے واپس کردیئے گئے۔ جموں کشمیر میں جنگ بندی لائن "Cease fire line") کو حقیقی قبضے والی لائن Line of Actual Control میں بدلا گیا جس کے لئے سچیت گڑھ (جو پرانا ریلوے اسٹیشن ہوا کرتا تھا) میں دونوں ملکوں کے فوجی جرنیلوں نے سمجھوتہ کیا اور چھنب ہمیشہ کے لئے پاکستان کو دے دیا گیا اور اُس کے بدلے ''دنگی ٹیکری'' (مینڈھر) کی ایک چوکی اور کرگل میں تین فوجی چوکیاں حاصل کی گئیں۔ پاکستان کو اتنا کمزور کردیا گیا تھا کہ رائے شماری والوں نے بھارت سرکار کے ساتھ بات چیت کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ جس کے لئے وچولے کا کردار وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے ادا کیا۔ اندرا شیخ اکارڈ ہوا اور شیخ صاحب ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے۔ وہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جس نے 1952ء کے دہلی اگریمنٹ کو لاگو نہ کرنے کی وجہ سے ہند مخالف بیان دینے شروع کئے تھے اور جسے ملک سے غداری کے جُرم میں وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا کر جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ جس پر 11 سال تک غداری کا مقدمہ چلا اور جس نے بیس سال سے زیادہ کشمیر کی آزادی کے لئے جیل کاٹی، وہی شیر کشمیر حالات سے مجبور ہو کر وزیر اعلیٰ کی کرسی پر مطمئن ہو گیا۔ 1977ء میں کانگریس کی سرکار نے شیخ عبداللہ کی حمایت واپس لے کر حکومت گرادی۔ گورنر راج لگ گیا۔ 90 دِنوں کے اندر

الیکشن کرانے کا وعدہ کیا گیا۔ ریاست میں یہ پہلا گورنر راج لگا تھا۔ گورنر کے ایک مشیر ستار والا تھے اور خالد حسین کو اُن کا پرسنل اسسٹنٹ (PA) بنایا گیا۔ ستار اوالا انگریزی زبان کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ خالد حسین لوگوں کی درخواستوں کا مُدعا مختصر الفاظ میں انگریزی میں لکھ کر ستارا والا کو پیش کرتا تھا اور وہ مناسب کارروائی کے لئے متعلقہ محکمے کو احکامات لکھ دیتے تھے۔ کشمیر میں کانگریس کا کوئی وجود نہیں تھا کانگریس کا اثر صرف جموں کے علاقوں تک محدود تھا۔ کشمیر میں نیشنل کانفرنس کا بول بالا تھا۔ چنانچہ اس وقت جنتا پارٹی کی مرکزی سرکار نے جوڑ توڑ کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اور ریاست میں کام کرنے والی مرکزی خفیہ ایجنسیوں کا استعمال کر کے جموں وکشمیر میں جنتا پارٹی کا یونٹ قائم کیا تا کہ جنتا پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑا جا سکے کشمیر کی آزادی کے ایک نام نہاد مردِ مجاہد اور شیخ محمد عبداللہ کے دیرینہ ساتھی مولانا محمد سعید مسعودی کو جنتا پارٹی کی ریاستی شاخ کا سرپرست بنایا گیا اور پاکستان نواز اور کشمیر کو آزاد کرانے والی جماعت عوامی ایکشن کمیٹی، کے چیئرمین میر واعظ مولوی محمد فاروق کو جنتا پارٹی کا صدر بنایا گیا۔ لوگوں کی خرید وفروخت کے لئے مرکزی سرکار نے اپنی تجوریاں کھول دیں۔ جنتا پارٹی کے بڑے بڑے جلسے ہونے لگے۔ شیخ عبداللہ کو گالیاں دی جانے لگیں اور شیر اور بکرا کی روایاتی جنگ سڑکوں پر لڑی جانے لگی (کشمیر میں اُن دِنوں شیخ عبداللہ کے حمایتوں کو شیر اور میر واعظ خاندان کے حمایتوں کو بکرا کہتے تھے) خالد حسین اور اس کے دوست محمد صدیق کاتب نے مل کر اردو میں ایک ہفتہ وار اخبار ''کینواس'' نکالا۔ جس میں شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے حق میں مضامین اور اداریے لکھے گئے۔ یہ اخبار انتخابات کے اُس دور میں خوب بکا۔

اُس وقت بھارت کے وزیر اعظم شری مرار جی ڈیسائی تھے۔ چوہدری چرن سنگھ امورِ داخلہ اور بابو جگجیون رام امورِ دفاع کے وزیر تھے۔ بابو جگجیون رام اور چوہدری چرن سنگھ

ہر حالت میں یہ چناؤ جیتنا چاہتے تھے اور خفیہ ایجنسیوں کو اس کام کے لئے متحرک بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن تبھی وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے کشمیر کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میر واعظ مولوی فاروق نے اُنھیں اپنے گھر ''میر واعظ منزل راجوری کدل'' میں چائے کی دعوت پر بُلایا۔ جب مرارجی بھائی کا قافلہ میر واعظ منزل پہنچا تو عورتیں کشمیری بھاشا میں لوک گیت گا کر اُن کا سواگت کر رہی تھیں اور گا رہی تھیں ''سبز دستارس خدا چھُو راضی، پاکستانک غازی آؤ'' (سبز رنگ کی دستار پر خدا راضی ہے کیونکہ پاکستان کا غازی آیا ہے) وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کو جس کمرے میں بٹھایا گیا وہاں دیوار پر قائد اعظم محمد علی جناح کی تصویر کا فریم ٹنگا ہوا تھا اور مولوی فاروق بڑے فخر سے بتانے لگے کہ جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں، اس پر جناح صاحب بھی بیٹھے تھے۔ اِن واقعات کو خالد حسین نے ہفتہ وار اخبار ''کینواس'' میں خوب اُچھالا۔ دیگر کئی قومی اور مقامی اخباروں نے بھی شہ سرخیوں میں ان خبروں کو لکھا اور مرکزی سرکار کے خلاف اداریئے لکھے۔ اخباریں پڑھ کر مرارجی ڈیسائی کی سوچ یکسر بدل گئی۔ اُنہوں نے دہلی پہنچتے ہی کیبنٹ کی میٹنگ بلائی اور سختی سے ہدایت دی کہ جموں کشمیر میں انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہونے چاہئیں۔ کسی قسم کی دھاندلی برداشت نہیں کی جائے گی۔ وزیر اعظم کی ہدایات تمام متعلقہ محکموں اور خفیہ اداروں تک پہنچا دیں گئیں۔ شری مرارجی ڈیسائی کا کہنا تھا کہ شیخ عبداللہ ہندوستان کے آئین کے اندر رہ کر اٹانومی (اندرونی خود مختاری) کی بات کرتا ہے جبکہ میر واعظ مولوی فاروق اور اُس کی جماعت عوامی ایکشن کمیٹی تو کھُلم کھُلا پاکستان کے ساتھ الحاق کی مانگ کرتی ہے، اور پاکستان کے حق میں لوک گیت گاتی ہے۔ انتخابات ہوئے اور پہلی بار صاف وشفاف ہوئے۔ کوئی ہیرا پھیری نہیں ہوئی۔ بین الاقوامی اخبارات نے بھی الیکشن کو آزادانہ قرار دیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس دو تہائی سے زیادہ نشستیں لیکر کامیاب ہوئی۔ شیخ صاحب نے اقتدار سنبھالا گورنر

راج ختم ہوا۔ستاراوالا واپس ممبئی چلا گیا اور خالد حسین دوبارہ مرزا افضل بیگ کا پی اے بن گی۔مندرجہ بالا واقعات کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جموں وکشمیر کی ساری سیاست وادئ کشمیر پر مرکوز ہے۔ جموں کے غیر مسلم علاقوں کا اس میں کوئی خاص رول نہیں ہے۔ مرکزی سرکاریں بھی کشمیری لیڈروں کو ہی اہمیت دیتی ہیں کیونکہ بین الاقوامی سطح پر کشمیر ہی ہمیشہ موضوع بحث رہتا ہے۔ میرا نام محمد سلیم بیگ ہے اور میں خالد حسین کا پچھلے 45 سال کا دوست اور دُکھ سُکھ کا ساتھی رہا ہوں۔ ہم دونوں نے نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ کام کیا تھا۔ میں بیگ صاحب کا عوامی رابطہ افسر تھا۔ میں بھی ریاستی سرکار کے کئی اعلیٰ عہدوں پر کام کرتا رہا ہوں اور آخر ڈائریکٹر صنعت وحرفت کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہوں اور آج کل ایک ''این، جو، او'' چلا رہا ہوں۔ میں بھی کشمیر مسئلے اور اُس کی پیچیدگیوں سے واقف ہوں بلکہ کئی واقعات کا چشم دید گواہ بھی ہوں۔

جب تک خالد حسین سول سیکرٹریٹ میں تعینات رہا وہ دفتری ٹائم کے بعد اخباروں میں کام کرتا رہا اُس کے پاس کئی آئی، اے، ایس افسر اُردو سیکھنے کے لئے آتے تھے کیونکہ ان افسروں کو اردو کا ٹیسٹ پاس کرنا ضروری ہوتا تھا۔ اے، ایس۔ سدھو، ماریا ڈیزال فن، شیام سنگھ کپور اور سائمل ورگیز ان میں شامل تھے۔ بلدیو سنگھ جسوال، تاج محی الدین، پرویز دُرانی، خالد دُرانی، غلام محی الدین فور میں (غلام محی الدین فورمین بہت بڑا اسکیمر تھا۔ وہ عمدہ کاریگر تھا، اور اپنی ورکشاپ بنانا چاہتا تھا تاکہ سرکاری نوکری کو تیاگ سکے۔ کافی ہاؤس کے قریب اُسے ایک جنوبی افریقہ کی سانولی سلونی خوبصورت لڑکی ملی جو کشمیر کی سیر کرنے آئی تھی۔ محی الدین اُس کا گائیڈ بن گیا اور اُسے خوب گھمایا۔ وہ خوبصورت محی الدین کو دل دے بیٹھی اور اُسے شادی کر کے اسے ساتھ لے گئی۔ پیچھے اُس کی بیوی سب دوستوں کو کوستی رہی کہ اُنہوں نے اُسے کیوں نہیں بتایا۔ بہر حال محی الدین نے اپنی افریقن بیوی کی مدد سے وہاں ایک

بڑی ورکشاپ بنائی۔اُس عورت کے بطن سے ایک لڑا پیدا ہوا۔ پھر وہ فوت ہوگئی۔ جس کے بعد محی الدین نے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو بھی جنوبی افریقہ بلالیا۔ اُس کے سبھی بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور مالی طور پر خود کفیل ہیں۔ محی الدین اکثر کشمیر آتا جاتا اور دوستوں سے ملتا رہتا۔ خالد حسین کے ساتھ اُس کا رابطہ مرتے دم تک رہا۔) وغیرہ بھی اُس کے پاس وقت گذاری کے لئے آتے۔ دوستانہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اُس کی وفات تک جاری رہا۔

جموں و کشمیر میں جوڑ، توڑ کی سیاست کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ شیخ عبداللہ صاحب کی وفات کے بعد وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اُن کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو وزیر اعلیٰ بنوایا۔ پھر الیکشن کروانے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹر فاروق کو کانگریس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے انتخاب لڑنے کے لئے کہا گیا لیکن وہ نہیں مانا۔ الیکشن ہوا اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس دو تہائی اکثریت سے جیت گئی۔ محترمہ اندرا گاندھی انتخاب کے نتائج سے سیخ پا ہوگئی۔ اس کی سیاسی حکمتِ عملی بل کھا کر رہ گئی۔ اُس نے ڈاکٹر فاروق کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور آخر گورنر جگموہن کے ذریعہ یہ کام انجام کو پہنچا۔ فاروق عبداللہ کو ہٹا کر گل شاہ کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ ڈیڑھ سال کے بعد گل شاہ کو ہٹا کر دوبارہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا گیا اور 1987ء میں الیکشن ہوا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی اور فاروق عبداللہ آپس میں بغل گیر ہوئے بلکہ شکر اور کھیر ہوئے۔ الیکشن میں ڈٹ کر دھاندلی کی گئی اور کشمیر میں مسلح جدوجہد کے لئے بنیاد فراہم کی گئی۔ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ وادی کی تقریباً 20 اسمبلی نشستوں پر جیت درج کرا رہی تھی لیکن رزلٹ اس کے برعکس نکالے گئے۔ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے اُمیدواروں کو گرفتار کر کے زدکوب کیا گیا اور امیر اکدل حلقے میں الیکشن جیتنے والے محمد یوسف شاہ، اُس کے الیکشن ایجنٹ محمد یاسین ملک (JKLF) کی تھانے میں لے جا کر خوب دُھلائی کی گئی۔ یہی محمد یوسف شاہ بعد میں صلاح الدین کے نام سے مشہور ہوا اور آج کل پاکستانی

انتظام والے کشمیر میں حزب المجاہدین کا امیر ہے۔ اس الیکشن کے بعد سے ہی کشمیر میں افراتفری کا ماحول گرم ہوا اور بالآخر عسکری سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ نیشنل کانفرنس کشمیر وادی میں ایک مضبوط پارٹی تھی اُسے کمزور کرنے کے لئے مرکزی حکومت کی درپردہ مدد سے پی، ڈی، پی (پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی) بنائی گئی۔ الیکشن ہوا۔ ووٹ تقسیم ہوئے نیشنل کانفرنس کمزور ہوئی۔ کانگریس نے بھی کشمیر میں تھوڑے بہت پاؤں پسار لئے۔ اور پھر پی، ڈی، پی اور کانگریس کی مشترکہ حکومت بنی تین تین سال کے لئے اقتدار کی ساجھے داری کا فیصلہ وہا۔ ہیلنگ ٹیچ کا نعرہ دیا گیا۔ سری نگر۔ مظفر آباد اور پونچھ۔ راولا کوٹ بس سروس شروع ہوئی۔ مدت پوری ہونے کے بعد پھر انتخابات ہوئے اور کانگریس۔ نیشنل کانفرنس کی مشترکہ حکومت بنی۔ یہ مدت بھی وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ کی لیڈر شپ میں پوری ہوئی۔ پھر انتخابات ہوئے۔ پی، ڈی، پی اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی ساجھے داری میں حکومت بنی۔ ریاستی سیاست کی ندی کے دو کنارے ملائے گئے۔ حریت کے اہم لیڈر اور عبدالغنی لون کے فرزند سجاد لون حریت کا چولا اُتار کر بھارتیہ جنتا پارٹی کی شرن میں چلے گئے اور اس طرح اُن پر غداری، پاکستانی اور اینٹی نیشنل ہونے کے الزامات ختم ہو گئے اور وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے کوٹے سے وزیر بھی بنائے گئے۔ یہ گٹھ جوڑ بھی ختم ہوا اور سجاد لون کے ذمے یہ کام سونپا گیا کہ وہ نیشنل کانفرنس اور پی، ڈی، پی کے ممبران اسمبلی کو توڑے اور بی جے پی کے اشتراک سے حکومت بنائے پر یہ بیل بھی منڈے نہ چڑھ سکی اور پھر گورنر راج لگا دیا گیا۔ اسی گورنر راج میں 5/اگست 2019 کو آئین ہند کی کھوکھلی دفعہ 370 کا جنازہ پڑھا گیا اور ہمیشہ کے لئے اسے دفن کر دیا گیا۔ جبکہ ہمارے خیال کے مطابق یہ دفعہ 370 صادق صاحب کے زمانے سے کمزور ہوتے ہوتے میر قاسم کے وقت تک فوت ہو چکی تھی۔ لیکن سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے سیاست دان اس دفعہ کا تذکرہ کرنا اپنے فرائض میں سے سمجھتے تھے۔ ساتھ

میں 35-A کی بھی شامت آگئی۔ اُس کو بھی آئین سے ہٹا دیا گیا۔ چنانچہ ان دفعات کو ختم کرنے سے ہر دیش واسی جموں و کشمیر میں زمین خرید سکتا ہے۔ نوکری کر سکتا ہے کارخانے لگا سکتا ہے۔ اس کا اثر کشمیر پر کیا خاک پڑنا تھا کیونکہ Conflict zone میں کون زمین خریدے گا یا کاروبار کرے گا۔ ہاں! مگر اس چور سپاہی کی کھیل کا بھیانک اثر جموں کے اضلاع کٹھوعہ، اُدھم پور، سانبہ اور جموں پر پڑ رہا تھا۔ باہر سے لوگ یہاں جائیدادیں خریدنے لگے تھے۔ نوکریاں حاصل کرنے لگے تھے۔ فیکٹریاں لگائی جانے لگی تھیں۔ جو کہ پہلے ہی کٹھوعہ، سانبہ، جموں اور اُودھم پور میں غیر ریاستی باشندوں نے لگا رکھی تھیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر جموں صوبے میں مخالف آوازیں زور دار طریقے سے اُبھرنے لگیں۔ جلتی پر تیل کا کام جموں کشمیر کی ریاست توڑنے کے حکم نامے نے کیا۔ مرکزی کنٹرول میں دو Unin Territories بنائی گئیں۔ جموں کشمیر اور دوسری لداخ۔ جموں کے ڈوگرے (بی جے پی) عرصہ دراز سے جموں کو الگ ریاست کا درجہ دینے کی مانگ کر رہے تھے جب کہ اُن کو مرکز کے زیر نگیں علاقہ بنا دیا گیا۔ ان اقدامات کا فائدہ ریاست کے عوام کو تو نہیں ہوا البتہ حکمران جماعت کا ووٹ بنک بڑھ گیا۔ ہندوتو کی سیاست، غداری اور دیش بھگتی کی ٹھیکیداری نے ملک کے بھائی چارے اور مشترکہ روایت اور جمہوری قدروں کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جوڑ توڑ کی دائمی اور آزمودہ پالیسی کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے بھی جاری رکھا۔ بھارت نواز یا مین اسٹریم سیاسی رہنماؤں کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ حریت گٹھ جوڑ کے سبھی رہنماؤں اور منی لانڈرنگ کرنے والوں کو تو پہلے ہی جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ پھر جب سیاسی خلا پیدا ہونے لگا تو ''اپنی پارٹی'' موردِ وجود میں لائی گئی۔ ''پیپلز کانفرنس'' کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ اور کشمیر کی سیاسی گاڑی بغیر ٹائروں کے چلانے کی کوشش متواتر جاری و ساری ہے، آخر پھر ان ہی لوگوں کے ساتھ بات چیت کی جا رہی ہے جو کل تک

غدار اور پاکستانی تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست جموں کشمیر ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دانوں کے لئے ایک تجربہ گاہ ہے جہاں پچھلے 70 سال سے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ کہ کس طرح سیاست دان اس مسئلے کو اُچھال کر سیاسی فائدے اُٹھاتے رہیں۔ ورنہ جموں و کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے کئی موقع آئے لیکن کوئی بھی سنجیدہ نہیں تھا۔ نہ پاکستان اور نہ ہندوستان۔ ڈکسن پلان کو بھارت نے نامنظور کیا جو کہ خالد حسین کے خیال میں کشمیر مسئلہ کا بہترین حل تھا۔ جو اقوام متحدہ کی طرف سے مقرر کئے گئے ثالث نے 1950ء میں پیش کیا تھا۔ تین تین لڑائیاں لڑی گئیں۔ لیکن ماسوائے بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کشمیر میں عسکری کاروائیاں بدستور جاری ہیں۔ سرکار مسئلے کی جڑ تک پہنچنا نہیں چاہتی۔ صرف شاخ تراشی کی جاتی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ شاخ تراشی سے درخت مزید پھلتا پھولتا ہے۔ ادھر کشمیر کی صد سالہ سیاست بھی ہمیشہ بے اعتباری اور خودغرضی کا شکار رہی ہے۔ سیاسی سقراط شش و پنج میں مبتلا رہتے ہیں کہ کشمیریوں کے سیاسی اونٹ کی کون سی کل سیدھی ہے کیونکہ کبھی پاکستان کو ٹھکرا کر ہندوستان کا پلو پکڑا جاتا رہا اور نعرے لگائے جاتے رہے، ''حملہ آور خبردار۔ ہم کشمیری ہیں تیار'' کبھی ہندوستان کے حق میں اقوام متحدہ میں تقریریں کی گئیں۔ اور ہندوستان کے ساتھ الحاق کو پکا اور مستقل قرار دیا گیا۔ پھر اندرونی خودمختاری کے لئے جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ نیشنل کانفرنس، شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد محاذ رائے شماری بن گئی۔ کبھی پاکستان میں شمولیت اور کبھی آزادی کا راگ الاپا گیا۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو کشمیر میں جیالوں نے جماعت اسلامی کے ممبران کے چھ سو مکانات جلا ڈالے لیکن جب جنرل ضیاء الحق ہوائی حادثے میں مارے گئے تو کشمیر میں اُن کے حق میں بھی جلوس نکالے گئے اور سرکاری املاک کو جلایا گیا۔ کبھی حریت کے لیڈر ہندوستان کے خلاف عسکری کاروائیوں کی حمایت کرنے لگتے ہیں تو کبھی چیف منسٹر

بننے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ سجادلون تو بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے منسٹر بھی رہا۔ یوں لگتا ہے کہ سب گول مال ہے اور جیسے رنڈی کے گھر منڈی لگی ہوئی ہے کیونکہ نہ سرنگی ٹوٹی ہے اور نہ ''ہیر'' ختم ہوئی ہے۔ جوڑتوڑ کی سیاست کی وجہ سے دونوں ملکوں میں تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ جس کا اثر دونوں ملکوں کی تجارت پر پڑا۔ عوام کی پسماندگی دور کرنے، تعلیم اور صحت پر توجہ دینے کی بجائے دفاع پر کھربوں ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں۔ پھر بھی مسئلہ کا حل کچھ نہیں نکلتا۔ لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے ایک دوسرے کو للکارنے اور چھوٹی موٹی جھڑپوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہورہا۔ خالد حسین اور میرا ماننا ہے کہ اگر دونوں ملک ایک دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو دوستی کرلیں اور باہمی تجارت کو اولین ترجیح دیں۔ جب معاشی طور پر دونوں خودکفیل ہوجائیں تو پھر اُن مسئلوں پر بات چیت کی جائے جو متنازعہ ہیں۔ ہمارے خیال میں موجودہ لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ بلاشک سرحد کو سیدھا کرنے کیلئے کچھ علاقوں کی ادلا بدلی ضروری ہو تو کرلی جائے۔ اس تجویز کا اظہار خالد حسین نے دوبارا اپنے انٹرویو میں کیا تھا جو پاکستان کے جریدے ''بدلتی دنیا'' کراچی اور ''قومی ڈائجسٹ'' لاہور میں چھپے تھے۔ خالد حسین نے ہمیشہ دونوں ملکوں میں امن اور شانتی کے لئے کام کیا، اِنہی موضوعات پر اپنے کئی افسانے بھی لکھے اور مرتے دم تک وہ دنوں ملکوں میں امن کے لئے کام کرتا رہا۔

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی
(مظفر رزمی)

میں خطا وار تُو بخشنہار

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے
(اقبالؔ)

14 نومبر 2005ء کو خالد حسین کے چھوٹے بیٹے یاسر عمران کی شادی فاروق بیگ کی بڑی بیٹی ثنا فاروق کے ساتھ بٹھنڈی کالونی کے نئے گھر میں ہوئی۔ شادی سے پہلے اُنہوں نے حج پر جانے کا ارادہ باندھا تھا اور اِس سلسلہ میں ڈپٹی کمشنر جموں کے دفتر میں اپنے اور اہلیہ نسیم فردوس کے کاغذات جمع کرا دیئے تھے۔ ستمبر 2005ء میں فریضۂ حج پر جانے والی فہرست میں اُن کا نام بھی درج تھا۔ جانے سے قبل حاجیوں کو حج سے متعلق ضروری ہدایات اور ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ مکّہ اور مدینہ میں اُنہیں کوئی دشواری نہ آئے۔ یاسر کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ منگنی کی رسم ادا کی جا چکی تھی اور شادی کے لئے دُلہن کے والدین دسمبر 2005 یا جنوری 2006 کی تاریخیں دے رہے تھے۔ اسی دوران حج پر جانے کی حتمی تاریخ کا اعلان سرکاری طور پر کر دیا گیا۔ خالد حسین اپنی اہلیہ نسیم فردوس کے ساتھ اگر حج پر چلے جاتے تو پیچھے گھر کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ بڑا بیٹا الگ رہتا تھا اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ خالد حسین اپنے سمبندھی فاروق بیگ اور اُس کے بڑے بھائی یاسین بیگ سے ملا اور ساری صورتِ حال بیان کی تو یہ فیصلہ ہوا کہ حج پر جانے سے قبل یاسر اور ثنا کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ نومبر میں شادی ہوئی اور 6 دسمبر 2005 یعنی شادی کے بائیس

دِن بعد خالد حسین اور نسیم فردوس حج کے لئے سعودی عرب روانہ ہوگئے۔ خالد حسین کے بچپن کے دوست تاج محی الدین اُن کی اہلیہ امینہ تاج اور بیٹی ڈاکٹر عرشی تاج بھی اس سفر مقدس میں ہمارے ہم سفر تھے۔ حاجیوں کو سری نگر انٹرنیشنل ائرپورٹ سے ائرانڈیا جہاز میں سوار ہوکر سیدھا جدّہ ہوائی اڈے پر اُترنا تھا۔ روانگی سے قبل سری نگر کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر ہی خالد حسین اور اُن کے دوست تاج صاحب نے احرام باندھ لیا تھا (مکہ پہنچنے سے پہلے ہر مرد حاجی کو اپنے کپڑے اُتار کر، بغیر سلی دو سفید چادریں اپنے جسم پر لپیٹنی ہوتی ہیں۔ ایک کمر سے اوپر اور دوسری کمر سے نچلے حصے پر۔ اِس عمل کو احرام کہتے ہیں۔ اور مکہ کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے یہ عمل مکمل کرنا ضروری ہے) عورتوں کے لئے احرام باندھنا ضروری نہیں۔ اُن کے پہنے ہوئے کپڑوں کو ہی احرام مان لیا جاتا ہے۔ تاج محی الدین صاحب خصوصی طیارے کے ذریعے الگ سے جدہ پہنچے اور وہاں اُنھیں مکہ شریف کے ایک پانچتارہ ہوٹل میں لے جایا گیا کیونکہ وہ ایک نجی ٹریول ایجنسی ''الخُدام'' کے ذریعے گئے تھے۔ جبکہ ہم مرکزی سرکار کی طرف سے منظور شدہ ائرانڈیا کی فلائٹ کے ذریعہ روانہ ہوئے تھے۔ ہمارا جہاز تیل بھرنے کے لئے کچھ دیر شارجہ میں رُکا پھر اُس نے جدّہ کے لئے اُڑان بھری۔ جدّہ میں ہمارے لئے بسوں کا نتظام کیا گیا تھا ہمارا سامان جدّہ ائرپورٹ کے ملازموں نے بسوں پر رکھا اور بسیں مکّہ شریف کے لئے روانہ ہوگئیں۔ راستے میں بسوں کو روک روک کر مقامی لوگ آبِ زم زم، جوس، کھجوریں اور پھل پیش کر رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر یعنی تین بجے (سعودی وقت کے مطابق) ہم مکّہ معظّمہ پہنچے۔ جس بس میں خالد حسین اور میں سوار تھے، اُسے ڈرائیور نے خُدام کے دفتر کے سامنے جا کھڑا کیا۔ خُدام نے عربی زبان میں مختصر سی تقریر کی جس کا ترجمہ اُس کے ہندوستانی ملازم نے کیا۔ کیرالہ کے رہنے والے اُس ملازم نے پھر ہمارے جتھے کو خانہ کعبہ لایا تا کہ ہم عمرہ

کر سکیں۔ جو بھی حاجی مکّہ میں داخل ہوتا ہے اُسے سب سے پہلے عمرہ کرنا پڑتا ہے۔ عمرہ کرنے کے لئے خانہ کعبہ کا طواف کرنا لازم ہے۔ یعنی خانہ کعبہ کے سات چکر لگانے اور ہر چکر کے بعد خانہ کعبہ کی دیوار میں لگے سنگ اسود (کالا پتھر) کو چومنا پڑتا ہے لیکن اگر بھیڑ بہت زیادہ ہو تو چکر ختم ہونے پر اشارے سے سنگِ اسود کو چوم لیا جاتا ہے۔ سات چکر پورے ہونے کے بعد مقام ابراہیم کے سامنے دو رکعت نماز پڑھ کر خانہ کعبہ سے باہر نکل کر سعی کرنی پڑتی ہے (خانہ کعبہ کے ساتھ ''صفا'' اور ''مروہ'' کی پہاڑیوں کے بیچ بنے راستے پر سات چکر لگانے کو ''سعی'' کہتے ہیں) اور پھر نائی سے سر کے بال منڈوانے پڑتے ہیں۔ کچھ لوگ تو پورے بال اُتار دیتے ہیں جبکہ کچھ شرط پوری کرنے کے لئے تھوڑے سے بال کٹوا لیتے ہیں۔ عورتوں کو بھی بالوں کی لِٹ سے تھوڑے سے بال کاٹنے پڑتے ہیں۔ یوں عمرہ کرنے کا عمل پورا ہو جاتا ہے اور پھر حاجیوں کو الاٹ کئے گئے ہوٹلوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ حاجی لوگ احرام اُتار کر عام کپڑے پہن لیتے ہیں۔ یہ عمل بہت تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ عام طور پر حاجی فجر کی نماز پڑھ کر اور نہاری یا ناشتہ کھا کر سو جاتے ہیں۔

میرا نام پرویز خطیب ہے۔ میں بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کے لئے مکہ شریف گیا تھا اور سرینگر سے مکہ تک خالد حسین کا ہمسفر تھا۔ خُدام نے مجھے اور خالد حسین کو ایک ہی کمرے میں رکھا تھا اور ہم دونوں اپنی اپنی اہلیہ کے ساتھ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں اور قرآن مجید کے سپارے پڑھنے حرم شریف جاتے۔ ہر روز دو تین بار خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتے۔ ایک دِن صبح ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب غارِ حرا (وہ غار جہاں محمدؐ نے عبادت کی اور جہاں اُن پر وحی (غیبی آواز) اُتری تھی اور نبوت کی بشارت ملی تھی) کی زیارت کرنے گئے۔ دوسرے روز ہم نے مسجد عائشہ اور 'خندق' کا میدان دیکھا جہاں ہمارے رسولؐ نے منافقوں کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ کچھ دِنوں کے اندر اندر ہم نے مکّہ شریف کے قرب

وجوار میں سبھی تاریخی مقامات کی زیارت کرلی۔ پھر ہمیں خُدام مدینہ منورہ لے کر گئے جہاں حاجیوں کو چالیس نمازیں ادا کرنی ہوتی ہیں یعنی آٹھ دِن مدینہ میں قیام کرنا ہوتا ہے۔ وہاں بھی ہمارے رہنے کا بہترین انتظام کیا گیا تھا۔ یہ نمازیں مسجد نبوی میں پڑھنی پڑتی ہیں جہاں حضرت محمدؐ دفن ہیں۔ ان کے روضۂ مبارک پر تقریباً روز ہم حاضری دیتے تھے اور دعائے خیر مانگتے تھے۔ نویں دِن ہم پھر واپس مکہ کے لئے روانہ ہوئے اور اپنے ہوٹل میں جانے سے پہلے پھر عمرہ کرنے کے لئے احرام باندھ کر خانہ کعبہ گئے۔ طواف کے بعد سعی کی۔ بال منڈوائے۔ پھر اپنے ہوٹل میں آئے۔ پنجگانہ نمازیں حاجی صاحبان حرم میں ہی پڑھنا ثواب سمجھتے ہیں۔ اور خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتے رہتے ہیں۔ خالد حسین کے دوست تاج محی الدین خانہ کعبہ کے بالکل سامنے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ خالد حسین اور ان کی اہلیہ روز فجر کی نماز کے بعد اُن کے ہوٹل میں جاتے اور ناشتہ اُن کے ساتھ کرتے۔ جُوں جُوں ایام حج نزدیک آتے گئے تو حاجیوں کی بھیڑ بھی بڑھنے لگی۔ پکوانوں کی دُکانوں، ہوٹلوں اور نائیوں کی دُکانوں کے نرخ دوگنے بلکہ تین گنا بڑھ گئے۔ جہاں پہلے سر کے بال اُتارنے کیلئے نائی ایک یا دو ریال لیتے تھے، اب تیس ریال مانگنے لگے۔ جو نان ایک ریال میں ملتا تھا، اب دس ریال میں ملنے لگا۔ غرض بازاروں میں بکنے والی اشیاء مہنگی ہونا شروع ہوگئیں۔ پھر حج کی رسمیں شروع ہوئیں اسلامی مہینے (ہجری سن) ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ کو سبھی حاجی مِنیٰ جاتے ہیں جہاں حاجیوں کے ٹھہرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔ نہانے اور صفائی دُھلائی کا انتظام قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ دوسرا دِن (۹ رذی الحجہ) حاجی عرفات کے میدان میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارتے ہیں اور شام کو سورج ڈھلنے کے بعد مزُدلفہ آجاتے ہیں اور ساری رات ربّ العزت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ نفل ادا کرتے ہیں اور ۱۰ر

ذی الحجہ کی صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد واپس منیٰ اپنے اپنے خیموں میں آجاتے ہیں۔ چائے اور ناشتہ کے لئے ہر ملک کے طعام خانے ہوتے ہیں۔ بھارتی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی دُکانوں پر بہت زیادہ بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ناشتہ کھانے کے بعد حاجی اپنے خیموں میں جا کر سوجاتے ہیں جبکہ کچھ ناشتہ کرنے کے بعد ہی رمی (شیطانوں کو کنکریاں مارنا) کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے لئے علامت کے طور پر تین دیواریں بنائی گئیں ہیں یعنی بڑے شیطان کی علامت کے لئے بڑی دیوار، اس سے چھوٹے شیطان کے لئے چھوٹی علامتی دیوار اور تیسرے شیطان کے لئے اُس سے بھی چھوٹی دیوار۔ لوگ ان تینوں دیواروں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ اس عمل کو رمی کہتے ہیں۔ خالد حسین اور اُس کی بیوی نسیم فردوس ناشتہ کرنے کے بعد رمی کرنے چلے گئے جب کہ ہم آرام کرنے کے لئے اپنے خیمے میں آگئے۔ ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد رمّی کرنے کے لئے منیٰ سے نکلے جبکہ تب تک خالد حسین اور اُن کی اہلیہ یہ عمل مکمل کرنے کے بعد مکہ شریف اپنے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ رمی کرنے کے لئے لاکھوں کی بھیڑ کیڑے مکوڑوں کی رفتار سے چلتے ہوئے اس عمل کو پورا کرتی ہے۔ اکثر اس بھیڑ میں دھکم پیل کی وجہ سے بھگدڑ میں سینکڑوں حاجی مرجاتے ہیں۔ ایسا ہی حادثہ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ جب بھگدڑ میں 450 حاجی مر گئے اور ہم لاشوں پر سے گذر کر اپنے ہوٹل پہنچے۔ خالد حسین اور ان کی اہلیہ اس حادثے سے بے خبر اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے جب اُن کے چھوٹے داماد ڈاکٹر عشرت چوہدری کا سری نگر سے فون آیا اور خالد حسین کی خریت پوچھنے لگا۔ اُسی نے حادثے کے بارے میں جانکاری دی۔ اللہ کے فضل سے خالد بھائی اور بہن نسیم خیریت سے تھے۔ پورے ہوٹل میں حاجی ڈرے سہمے اور غمگین تھے۔ خُدام اُن کو حوصلہ اور ہمت دینے کیلئے خود ہوٹل میں آئے۔ پوری دُنیا کا میڈیا اِس حادثے سے متعلق خبریں دے رہا تھا۔ خالد بھائی

اور بہن نسیم بعد دوپہر حج کی باقی رسوم کی ادائیگی کیلئے خانہ کعبہ چلے گئے۔ طواف اور عمرہ کیا پھر سر کے بال منڈوانے کے لئے خالد حسین نائی کے دُکان پر گئے وہاں لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور نائی تیس ریال ایک حاجی سے وصولی کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر خالد بھائی نے دو ریال کا ایک سیفٹی بلیڈ خریدا اور ایک حاجی سے پوچھا کیا وہ اُس کے سر کے بال صاف کرسکتا ہے۔ جب اُس حاجی نے ہاں میں سر ہلایا تو پہلے خالد حسین نے اُس کی سر کی حجامت کی اور پھر اُس نے خالد حسین کے سر کے بال اتار دیئے یوں دو ریال میں آبِ زم زم سے دونوں نے یہ عمل پورا کیا۔ شام کو خالد حسین تاج محی الدین صاحب سے ملنے اُن کے ہوٹل میں گیا۔ دونوں دیر رات تک باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر عشرت اور ڈاکٹر ھما کے بعد خالد بھائی کے بڑے داماد ایوب وانی اور بیٹی ڈاکٹر سمیعہ تبسم کے فون آئے۔ دیگر رشتے داروں نے بھی خیریت معلوم کرنے کے لئے رابطہ کیا۔ اللہ کا شکر تھا کہ سب خیریت سے تھے۔ حج کے ارکان مکمل ہو چکے تھے۔ تاج محی الدین اُن کی اہلیہ اور بیٹی مدینہ مّنورہ کے لئے روانہ ہو چکے تھے جہاں اُنہوں نے چالیس نمازیں ادا کرنی تھیں۔ اور وہاں سے ہی سری نگر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ جبکہ خالد حسین تحفے تحائف خریدنے میں مشغول ہو گئے۔ اُنہوں نے پچاس سے زیادہ جائے نمازیں خریدیں۔ 80 کلو کھجوریں خریدیں تا کہ رشتے داروں اور دوست احباب میں بانٹی جاسکیں۔ اس کے علاوہ دس لیٹر زم زم کا پانی الگ سے لیا اور دس لیٹر زم زم کا پانی سعودی سرکار نے تبرک کے طور پر دیا۔ تا کہ زم زم اپنے قرابت داروں میں بانٹا جا سکے۔ اس کے علاوہ کئی دوسری چیزیں بھی خریدیں۔ اب ہم سب گھر واپسی کی تاریخ کا انتظار کر رہے تھے۔

مکّہ شریف اور مدینہ منورہ کو مقدس شہروں کا درجہ حاصل ہے۔ حُجاج کرام یہاں اللہ کے مہمان تصور کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں بھی مقامی دکانداروں، ٹیکسی

ڈرائیوروں اور کاروباری لوگوں کا رویہ تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسے ہمارے برصغیر کے ممالک میں ہے۔ بنارس، ہری دوار، دہلی، اجمیر، سری نگر، شملہ وغیرہ شہروں کی طرح یہاں بھی خریداری میں لوٹ کھسوٹ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ سعودی عرب میں رہنے والے کسی غیر ملکی کو شہری حقوق نہیں دیئے جاتے۔ وہ چاہے مسلمان ہو، ہندو ہو،، عیسائی ہو یا کسی اور مذہب کا ماننے والا ہو۔ وہ سعودی عرب کی شہریت حاصل نہیں کرسکتا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے زیادہ تر لوگ یہاں صاف صفائی کا کام کرتے ہیں۔ خدام حضرات کی ملازمت کرتے ہیں یا دُکانوں پر سیلز مین کا کام کرتے ہیں۔ مشکل سے 15 فیصد لوگ ڈاکٹر، انجینئر یا دیگر ہُنر مند ہوں گے جو برصغیر کے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ دُکانوں کے مالک عربی ہیں اور سارا کاروبار اُن کے نام سے ہی کیا جاتا ہے، چاہے دُکان غیر عربی کی کیوں نہ ہو۔ اگر عربی مالک کے ساتھ کسی بات پر اَن بن ہوجائے یا وقت پر مقرر کردہ رقم عربی کو نہ ملے تو وہ اُس کا سارا سامان دُکان کے باہر پھینک دے گا یا ضبط کرلے گا۔ وہاں کا قانون غیر ملکی کو بچانے کے لئے نہیں آئے گا۔ للہذا کوئی بھی غیر ملکی بیوپاری مقامی عربوں سے اُلجھنے میں گریز کرتا ہے۔ برصغیر کے اکثر لوگ ہندوستان کی تقسیم سے بہت پہلے کے وہاں رہ رہے ہیں، جن میں زیادہ تعداد تلنگانہ، آندھر پردیش اور کیرالہ اور بنگال کے لوگوں کی ہے لیکن کسی کو وہاں کی شہریت حاصل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ڈرے، سہمے رہتے ہیں کیونکہ ملک سے باہر نکالنے کی تلوار اُن کے سروں پر لٹکتی رہتی ہے۔ مکّہ اور مدینہ میں کام کرنے والے سارے ملازم مسلمان ہیں لیکن اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنا، سبھی مسلمان آپس میں بھائی بھائی، برابری اور برادری کی باتیں کتابوں تک محدود ہیں۔ ان کا عملی اظہار بہت کم ملتا ہے۔ مقامی لوگ عربی زبان کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں بول سکتے۔ انگریزی میں بات چیت کرنے والا کوئی اِکاّ دُکاّ ہی ملے گا۔ جبکہ حجاج کرام

میں 99 فیصد لوگ عربی زبان سے نابلد ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہماری مسجدوں کے ممبروں پر واعظ فرمانے والے مولانا اور رٹی رٹائی قرآنی آیات پڑھنے اور اُس کا ترجمہ کرنے والے مولوی صاحبان بھی عربی زبان نہیں بول پاتے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر خالد حسن کا کہنا تھا کہ بھارت سرکار اور خصوصاً مرکزی حج کمیٹی پر یہ لازم ہے کہ وہ حاجیوں کو سعودی عرب بھیجنے سے پہلے حاجیوں کو عربی زبان کی ابتدائی تعلیم بھی ضرور دیں تا کہ وہ ضرورت کی چیزوں کی خریداری کے لئے اور مقامی عربوں کو اپنی بات سمجھانے کے لئے گفتگو کر سکیں اور ٹھگے نہ جائیں۔

سعودی عرب کا فرماں روا خانہ کعبہ کا خادم الحرمین الشریفین بھی ہوتا ہے۔ (دیکھ بھال کرنے والا یا سرپرست) ہر سال خانہ کعبہ کا غلاف بدلا جاتا ہے۔ اور نیا چڑھایا جاتا ہے جس پر سونے کی تاروں سے قرآنی آیات کی کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ خادم الحرمین کی اجازت سے اسلامی ممالک کے سربراہان کے لئے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا جاتا ہے تا کہ وہ اندر سے زیارت کر سکیں۔ عام حجاج کو اس کی اجازت نہیں ملتی۔ خانہ کعبہ اور حرم شریف کے فرش پر لگے سنگِ مرمر کو ملازم ہر دو دو منٹ کے بعد صفائی مشینوں سے صاف کرتے رہتے ہیں اور پوچا مارتے ہیں۔ ستھرائی کا اعلیٰ انتظام ہوتا ہے۔ غسل خانوں اور پاخانوں کی صفائی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ زمزم کے متبرک پانی کا چشمہ خانہ کعبہ کے باہر والے صحن یا حرم شریف کے بالکل سامنے ہے۔ لاکھوں آدمی یہ پانی اپنے اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں۔ کئی حجاج کفن کے لئے کپڑا خرید کر اُسے زمزم کے پانی سے دھو کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تا کہ فوتگی کے وقت اُن کو وہی کفن پہنایا جائے۔ ہر ملک کے سفارتخانے کا عملہ مکہ شریف اور مدینہ منورہ میں موجود رہتا ہے۔ اس طرح ہر ملک کے صحت مراکز بھی دونوں جگہ قائم ہیں جہاں بیمار حاجیوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستانی سفارت خانے نے مکہ

اور مدینہ میں اپنے حاجیوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے بہترین بندوبست کیا ہوتا ہے۔ بھارتی ڈاکٹر نہ صرف ڈسپنسریوں میں حجاج کا علاج کرتے تھے بلکہ ہوٹلوں میں بھی جا کر حاجیوں کا چیک اپ کرتے اور دوائیاں دیتے تھے۔ خالد حسین کو بھی حج کے آخری دِنوں میں نزلہ، زُکام اور کھانسی کا شدید اٹیک ہوا لیکن ڈیوٹی پر تعینات ڈاکٹروں کے بروقت علاج سے وہ چند دِنوں میں ٹھیک ہو گئے۔ مکہ اور مدینہ میں انفیکشن کا خطرہ برابر لگا رہتا ہے خاص کر افریقہ اور انڈونیشیا اور کچھ حد تک ملیشیا کے حجاج کرام سے۔

ایک دِن ہمیں ہمارے خُدام کی طرف سے پیغام ملا کہ دوسرے دن ہماری جدّہ کے لئے روانگی ہے۔ چنانچہ خالد حسین اُن کی اہلیہ اور میں نے اپنی بیوی کے ہمراہ الوداعی طواف کیا۔ عمرہ ادا کیا اور دوسرے دن بسوں کے ذریعے ہم پھر جدّہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر لائے گئے۔ جدّہ ہوائی اڈے پر حاجیوں کے سامان کا وزن کیا گیا۔ انڈین ائر لائنز کے ضابطے کی مطابق صرف چالیس کلو وزن لے جانے کی اجازت تھی جبکہ بھائی خالد حسین کے سامان کا کل وزن ایک سو کلو گرام سے زیادہ تھا۔ لہٰذا انُہوں نے 40 کلو وزن کا سامان رکھ کر باقی کے سامان کی بُکنگ کارگو میں کروائی جس پر اتنی رقم خرچ ہوئی کہ دھیلی کی بُڑھیا ٹکا سر مُنڈ وائی والی بات ہو گئی اور سمجھ میں آ گیا کہ بلا ضرورت کچھ نہ خریدا جائے۔ خالد حسین کا یہ بھی کہنا تھا کہ حج جوانی میں کیا جائے کیونکہ حج کا عمل انتہائی مشکل ہے، خاص کر بزرگ لوگوں کے لئے۔ خیر جدّہ سے ہماری فلائٹ سری نگر پہنچی اور دوسرے دِن ہم سب جموں کے لئے روانہ ہوئے۔ اس طرح بھائی خالد حسین کے ساتھ میرا 45 دِنوں کا ساتھ دلچسپ رہا۔ مکہ اور مدینہ میں ہم نے وہ سارے مقامات دیکھے جو اسلامی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ لیکن بھائی خالد کو اس بات کا بڑا دُکھ تھا کہ سعودی عرب کی موجودہ شاہی حکومت بیشتر تاریخی مقامات کو مسمار کر رہی ہے۔ اُن قبرستانوں کو اُجاڑ رہی ہے جہاں صحابہ دفن ہیں۔ قبرستانوں

کے نیچے سے سڑکیں نکالیں گئی ہیں۔ مسجد الحرام کو وسعت دینے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ، بی بی خدیجہؓ اور تو اور حضرت محمدؐ کا آبائی گھر بھی مسمار کر دیا گیا ہے۔ وہاں سڑکیں، بڑے بڑے مال اور نئی مسجدیں بنائی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں Myth کو مذہب کی بنیاد بنایا جاتا ہے لیکن وہاں اسلام کے حقیقی ثبوتوں کو مٹایا جا رہا ہے۔

میرے گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت
کریم تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے

(نامعلوم)

دل دریا بہتا جائے

کیا اضطرابِ شوق نے مجھ کو خجل کیا
وہ پوچھتے ہیں کہیے اِرادے کِدھر کے ہیں
(داغؔ دہلوی)

خالد حسین معیاری ادبی تخلیق کے عاشق تھے۔ سبق آموز فلمیں دیکھنا، اچھا سنگیت اور رُوح کو معطر کرنے والی گائیکی سننا، زندگی سے جُڑے ڈرامے دیکھنا، اچھی شاعری پڑھنا اور مشاعرے سُننا اُن کے شوق تھے۔ مہدی حسن، غلام علی، ریشماں، عابدہ پروین، فریدہ خانم اُستاد حامد علی اُستاد نصرت فتح علی، طفیل نیازی، شوکت علی اور عارف لوہار کو سننے کے لئے خالد حسین کئی بار پنجاب کے اُس شہر میں جاتے جہاں اِن فنکاروں کا پروگرام ہوتا۔ ادب، فن اور فنکاروں کے لئے یہ اُن کا جنُون ہی تھا کہ اُنہوں نے اپریل 2004 میں لاہور کے الحمرہ آڈیٹوریم میں اجو کا تھیٹر لاہور کی طرف سے کھیلا گیا پنجابی ڈرامہ ''دُلہا'' دیکھا۔ جسے سوپور کے کشمیری سپُوت شاہد ندیم نے لکھا تھا اور اُس کی بیگم مدیحہ گوہر نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ بُلھے شاہ کی پنجابی صوفیانہ شاعری کو بنیاد بنا کر اس ڈرامے کا شاندار سکرپٹ لکھا گیا تھا، اور اداکاروں کے ساتھ ساتھ گلوکار اپنی آواز میں بلھے شاہ کا کلام گا رہے تھے جو کہ ڈرامے کی عام روایت سے ہٹ کر تھا۔ ڈرامہ ختم ہونے پر خالد حسین مدیحہ گوہر سے ملے اور بتایا کہ وہ جموں سے عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ''دُلہا'' ڈرامہ جموں میں کھیلا جائے۔ وہ تیار ہوگئیں اور کہنے لگیں کہ اُن کے تھیٹر گروپ میں تقریباً 26 ممبران ہیں

جو جموں آئیں گے۔ پھر اُنہوں کہا کہ جولائی 2004ء میں وہ امرتسر اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ آ رہی ہیں باقی کی تفصیلی بات وہاں آ کر کریں گے۔ ایک دِن امرتسر سے اُن کا ٹیلیفون آیا اور مجھے امرتسر بُلایا اور کہا کہ اُن کی نئی پروڈیکشن ''ایک تھی نانی'' ضرور دیکھیں اور جموں میں بُلھا' اسٹیج کرنے سے متعلق بھی بات چیت ہوگی چنانچہ خالد حسین اپنی اہلیہ اور بڑی بیٹی ڈاکٹر سمیہ تبسم، اپنے دوست ڈاکٹر للت گپتا اور مجھے ساتھ لیکر اُسی روز امرتسر پہنچے جس شام ''ناٹ شالا'' امرتسر میں ''ایک تھی نانی'' کھیلا جا رہا تھا۔ مدیحہ گوہر جی نے ہم سب کا خیر مقدم کیا اور منتظمین سے کہا کہ وہ ہمارے رہنے کا بندوبست کریں۔ شام کو ہم نے شاید ندیم کا لکھا ہوا اور مدیحہ گوہر کا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈرامہ ''ایک تھی نانی'' دیکھا۔ اُس ڈرامے میں تھیٹر اور فلم کی مشہور ہندوستانی اداکارہ زُہرہ سہگل اور اُس کی سگی بہن عذرا بٹ جو لاہور میں رہتی تھیں، نے دادی اور نانی کا کردار نبھایا تھا۔ اُن کی پوتی اور ناتی کا کردار نبھانے والی اداکارہ عذرا بٹ کی پوتی اور زہرہ سہگل کی حقیقی ناتی تھی۔ اُس وقت زُہرہ سہگل کی عمر 93 سال تھی لیکن مکالموں کی ادائیگی اور ہر سین میں لباس تبدیل کر کے اسٹیج پر آنا یہ سب اداکاری کے لئے اُن کے جنون کی انتہا تھی۔ یہی حال اُن کی 88 سالہ بہن عذرا بٹ کا تھا۔ دونوں چست اور درست تھیں۔ ڈرامہ پُرانی اور نئی نسل کے تضاد کی کہانی پر تیار کیا تھا۔ کمال کی اداکاری اور ہدایت کاری تھی ڈرامہ ختم ہونے پر ناظرین نے بھرپور تالیوں کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ڈرامہ دیکھنے والوں میں مشہور فلمی اداکارہ دیپتی نول بھی تھیں۔ جب اُن کو اسٹیج پر بلایا گیا اور ڈرامے کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے کہا گیا تو وہ رونے لگیں، سسکیاں بھرنے لگیں اور کچھ بھی نہ بول سکیں۔ رات کو کھانے پر مدیحہ جی سے بات ہوئی اور طے پایا کہ ''بلھا'' جموں میں کھیلا جائیگا جس کے لئے دو لاکھ روپئے دیے جائیں گے۔ واپسی کے سفر میں خالد حسین مجھ سے کہنے لگے کہ مالی معاونت کا انتظام تو ہو جائے گا لیکن

لاہور سے آرٹسٹوں کو جموں لانے کا مسئلہ ہوگا کیونکہ ہماری سرکار جموں کشمیر کے لئے پاکستانیوں کو ویزا نہیں دیتی۔ میرا نام ڈاکٹر لیاقت جعفری ہے اور میں بطور اردو شاعر برصغیر میں اپنی شناخت رکھتا ہوں۔ میں خالد حسین جی کو اُن دِنوں سے جانتا ہوں جِن دنوں وہ پونچھ میں اے، سی، ڈی تعینات تھے۔ میں نے اُن کے دو افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگری کا دُھواں'' اور ''اشتہاروں والی حویلی'' پڑھے تھے۔ پھر وہ پونچھ میں ڈپٹی کمشنر بنکر آئے تو اُن کی محبت مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو حاصل ہوئی۔ میرے علاوہ سوامی انتر نیرو، خالد میر اور انور خان وغیرہ کے ساتھ روز ادبی مناظرے ہوتے۔ گیت سنگیت کے پروگرام کرائے جاتے۔ مشاعرے ہوتے۔ نامور شعراء کو دعوت دی جاتی۔ پھر میری پوسٹنگ جموں کے ایک ڈگری کالج میں بطور اردو لیکچرار ہوئی۔ اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے خالد صاحب کو مشورہ دیا کہ جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امتیابھ مٹو سے بات کی جائے۔ شاید وہ ہماری کچھ مدد کریں۔ ہم دونوں امتیابھ مٹو صاحب سے ملے اور بتایا کہ جموں میں پاکستانی پنجابی ڈرامہ ''بُلھا'' کا ایک شو کرانا چاہتے ہیں جس کے لئے اُن کی مدد چاہئے تاکہ پاکستانی آرٹسٹوں کا ویزا لگوایا جاسکے۔ میں نے مٹو صاحب کو بتایا کہ لاہور کا مشہور تھیٹر گروپ ''اجوکا'' پنجابی صوفی شاعر بُلھے شاہ کی زندگی پر لکھا گیا ڈرامہ ''بُلھا'' جموں میں کھیلے گا۔ وائس چانسلر امتیابھ مٹو بہت خوش ہوئے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسائل کو حل کرنے والی ٹریک ٹو ڈپلومیسی میں شامل تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ پاکستانی ڈرامہ جموں میں دکھانے سے لوگوں کو آپس میں ملنے کا موقع ملے گا اور یہ اعتماد بحال کرنے کی سمت ایک اہم سنگ میل ہوگا۔ انہوں نے اُسی وقت مرکزی سرکار کے امورِ خارجہ کے سکریٹری سے ٹیلیفون پر رابطہ کیا اور 26 فنکاروں کو جموں کا ویزا جاری کرنے کے لئے کہا۔ پھر وہ ہم سے کہنے لگے کہ سبھی آرٹسٹ جموں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے اور

یونیورسٹی کے طرف سے ایک لاکھ کی رقم بھی دی جائے گی۔ یعنی جموں یونیورسٹی نے 'بلھا' ڈرامے کو سپانسر کرنا منظور کرلیا۔ اس طرح 'بلھا' کلچرل اکادمی جموں کے ابھینو تھیٹر میں 29 جنوری 2005 کو کھیلا گیا، جسے دیکھنے کے لئے پورا جموں شہر اُمڈ آیا تھا۔ اس ڈرامے میں پہلی بار بلھے شاہ کی کافیاں مشہور پاکستانی قوال اور میوزک ڈائریکٹر اُستاد جاوید بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے اسٹیج پر بیٹھ کر گائی تھیں۔ جو کہ ڈرامہ کا حصہ تھیں۔ ان کافیوں کو کرداروں کے مکالموں کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ جاوید بشیر نے بعد ازاں موسیقار اے، آر، رحمن کے ساتھ بھی کام کیا۔ فلم راک سٹار کی قوالی کی دُھن جاوید بشیر نے ہی بنائی تھی۔ کوک اسٹیڈیو کے کئی گانے بھی اُنہوں نے گائے ہیں۔ بُلھے شاہ کا کردار سرفراز انصاری نے نبھایا تھا اور ان کے مرشد شاہ عنایت کا کردار پاکستان فلم، ٹیلی ویژن اور تھیٹر کے مشہور اداکار عاصم بخاری جی نے نبھایا تھا۔ اس ڈرامے کے تقریباً سبھی اداکار ٹیلی ویژن سے وابستہ تھے۔ کئی ایک نے تو پاکستان کی مشہور اردو فلم ''بول'' میں بھی کام کیا تھا۔ ڈرامے کو بے حد پسند کیا گیا۔ دوسرے دن مقامی اخباریں 'بلھا' ڈرامے کی تعریفوں سے بھری پڑی تھیں۔ اخباریں پڑھ کر جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امیتابھ مٹّو کو ریاست کے گورنر جنرل سنہا صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ اُنہوں نے ڈرامہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسی طرح خالد حسین جی کو بھی گوجر برادری کے ایک بڑے لیڈر اور بابا نگری وانگت (کنگن کشمیر) کے گدّی نشین میاں بشیر صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ اُنہوں نے بھی 'بلھا' ڈرامہ دیکھنے کے لئے کہا۔ کچھ اعلیٰ سرکاری افسران نے بھی گذارش کی۔ ڈاکٹر امتیابھ مٹّو اور خالد حسین نے مدیحہ گوہر صاحبہ کو ڈرامہ دوبارہ اسٹیج کرنے پر آمادہ کرالیا۔ چنانچہ 30 جنوری 2005 کو ''بلھا'' دوبارہ کھیلا گیا۔ میاں بشیر صاحب اپنے کئی مریدوں کے ہمراہ آئے جبکہ گورنر جنرل سنہا اپنی اہلیہ اور گورنر ہاؤس کے عملے کے ساتھ تشریف لائے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہ

رہی۔ڈرامے کے پہلے سین سے ہی میاں بشیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے شروع ہوئے اور آخر تک وہ ''بلھے شاہ'' کی کافیوں کے سحر میں ڈوبے رہے۔ ڈرامہ ختم ہونے پر گورنر جنرل سنہا نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''بُلھا'' ڈرامہ برصغیر کی صوفی پرمپرا کا پرتیک ہے۔ایسے ڈرامے اور سنگیت کے پروگرام دونوں ملکوں میں تواتر سے کرائے جانے چاہیں کیونکہ ہمارا ورثہ، زبان اور کلچر ایک ہے۔دونوں ممالک کے ادیبوں اور فنکاروں کو ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے کی اجازت ہونی چاہئے۔انہوں نے دونوں سرکاروں سے گذارش کہ اعتماد بحالی کے لئے اور رشتوں کو خوشگوار بنانے کے لئے مزید تمدنی پروگرام کرائے جائیں جبکہ حضرت میاں بشیر صاحب نے خالد حسین سے کہا کہ ڈرامے کے سبھی اداکاروں کو وہ کل شام کھانے پر بلانا چاہتے ہیں۔اُن کی طرف سے تمام مہمانوں کو دعوت دے دیں۔ میں نے اور خالد صاحب نے مدیحہ گوہر صاحبہ سے کہا کہ جموں وکشمیر کی ایک برگزیدہ شخصیت نے آپ کو اور اجو کا تھیٹر گروپ کے سبھی کلاکاروں کو کل رات عشائیہ پر بُلایا ہے۔جبکہ صبح ناشتے پر گورنر صاحب نے اُن کو دعوت دی تھی۔ گورنر ہاؤس جموں میں مدیحہ گوہر، امیتا بھ مٹو اور ہم دونوں اُن کے ساتھ گئے۔ناشتہ پر مدیحہ گوہر جی نے کہا کہ وہ بھی ایک میجر جنرل کی بیٹی ہیں اور اُنہوں نے تھیٹر ڈائریکشن کی تعلیم لندن سکول آف ڈرامہ سے حاصل کی ہے تو جنرل سنہا اپنی جوانی کے دِنوں کی باتیں سنانے لگے جب وہ پشاور کی ایک آرمی رجمنٹ میں کیپٹن تھے اور جنرل یحییٰ خان اُن کے سنیئر تھے یعنی میجر۔ پھر وہ جنرل یحییٰ خان کے قصے سنانے لگے کہ کس طرح بلا اجازت وہ اُن کی فوجی موٹر سائیکل لے کر بازار چلے گئے لیکن جنرل سنہا پکڑے گئے کیونکہ موٹر سکائیکل اُن کی تھی، پھر اپنے والد جو اُس وقت کراچی پولیس کے کمشنر تھے، کی سفارش پر معاملہ رفع دفع کردیا گیا تھا۔ایک اور دلچسپ واقعہ اُنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے سنایا کہ

جب جنرل کے ایس تھمیا اور جنرل یحییٰ خان دونوں ہندوستانی فوج میں میجر اور بریگیڈیئر تھے اور جنگی قیدی بنا کر ترکی کے ساحل سمندر پر لائے گئے تھے۔ تو ایک دن میجر یحییٰ خان چپکے سے جنگی کیمپ سے بھاگ نکلے۔ کسی نے اُن کا نوٹس نہیں لیا کیونکہ وہ گورے چٹے، بالکل انگریزوں کی طرح لگتے تھے جبکہ بریگیڈئر کے ایس، تھمیّا کالے رنگ کے تھے۔ اس لئے وہ جنگی کیمپ سے باہر جاتے تو پکڑے جاتے۔ ناشتے پر اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ جنرل سنہا بہت خوش تھے۔ اُنہوں نے اُن دِنوں کو یاد کیا جو انہوں نے پاکستان کے شہروں میں گزارے تھے۔ رات کو میں میاں بشیر صاحب کے دولت خانے ودھا تانگر بٹھنڈی میں مدیحہ گوہر صاحبہ اور اُن کی ٹیم کو لے گیا۔ اُنہوں نے اپنے کچھ دوستوں، سیاسی اور سماجی شخصیات کو بھی دعوت دی تھی۔ دعوت کے لئے کشمیری پکوان ''وازوان'' بنانے کیلئے سری نگر سے خصوصی طور پر وازے (کشمیری کھانے بنانے والے) منگوائے گئے تھے۔ بابا نگری وانگت کے سجادہ نشین میاں بشیر صاحب کے فرزند اور ریاستی سرکار میں وزیر میاں الطاف حسین صاحب مہمانوں کی خدمت خود کر رہے تھے۔ (میاں الطاف ایک درویش صفت انسان ہیں اور میاں صاحب نے اپنی زندگی میں ہی انھیں اپنے اجداد (یعنی حضرت عبداللہ لاروی اور حضرت نظام الدین لاروی) کی گدی کا جانشین نامزد کیا ہے کیونکہ وہ حق اور سچ کی مورت ہیں۔ صوفیانہ شاعری اور عمدہ گائیکی کے شوقین۔ میاں الطاف صاحب میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک گدی نشین میں ہونی چاہیں) وازوان بہت لذیز بنا تھا۔ پاکستانی فنکار پہلی بار وازوان سے آشنا ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد میاں بشیر صاحب نے مدیحہ گوہر کو پشمینہ کا ایک ''دُسہ'' (دوہری چادر) شاہ عنایت کا کردار نبھانے والے مشہور ٹیلی ویژن ایکٹر عاصم بخاری کو پشمینہ کا چوغہ اور بُلھے شاہ کا کردار نبھانے والے سرفراز انصاری کو شیروانی تحفے میں دی۔ مجلس اختتام پذیر ہوئی تو خالد حسین اور میں نے مہمانوں کو یونیورسٹی

گیسٹ ہاؤس میں پہنچایا۔ دوسرے دن اجوکا گروپ کے کلاکار براستہ واہگہ بارڈر لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ (اگست 2021ء کو حضرت میاں بشیر صاحب رحلت فرما گئے۔ اللہ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند کرے۔)

خالد حسین کے بچپن کے دوست اور آئی، اے، ایس (ریٹائرڈ) محمد اسلم قریشی ایک دن اُن کے گھر آئے اور کہنے لگے کہ کچھ دِن پہلے وہ ریاست کے سابق صدرِ ریاست، سابق گورنر، سابق مرکزی وزیر اور انڈین کونسل برائے کلچر ریلیشن کے چیئرمین ڈاکٹر کرن سنگھ جی سے ملنے جھیل ڈل کے کنارے پہاڑی پر بنے اُن کی پیلس میں گئے تھے اور وہاں برصغیر کے مشہور انقلابی اور رومانی شاعر فیض احمد فیض کے سوسالہ جشن ولادت کے سلسلہ میں ایک خصوصی پروگرام جموں میں منعقد کرانے کی بات چلی تو ڈاکٹر کرن سنگھ جی نے کہا کہ وہ فیض کی شاعری کے دلدادہ ہیں اور اگر وہ جموں میں عالمی معیار کا جشنِ فیض پرگروام کروائیں تو وہ انڈین کونسل برائے کلچر ریلیشن کی طرف سے مالی مدد دینے کو تیار ہیں۔ خالد حسین اور اسلم قریشی نے پروگرام کی روپ ریکھا بنائی اور یہ طے ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان سے دس دس معروف شعراء کو مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ فیض صاحب کی بیٹیوں کو بھی تقریب میں شرکت کرنے کیلئے بُلایا جائے اور پاکستان سے مشہور گلوکار غلام علی یا عابدہ پروین کو مدعو کیا جائے۔ خالد حسین کے مشورے سے ''جموں سول سوسائٹی فار آرٹ اینڈ لٹریچر'' کے نام سے ایک ادبی اور ثقافتی تنظیم بنائی گئی جسے سرکار سے رجسٹرڈ کرایا گیا۔ سرپرست ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے پہلے وائس چانسلر جناب مسعود چوہدری کو بنایا گیا جو جموں وکشمیر گوجر ٹرسٹ کے بھی سرپرست تھے اور اُنھوں نے گوجر طبقہ کی تعلیم اور بہبود کے لئے مثالی کام کئے تھے۔ محمد اسلم قریشی کو صدر اور خالد حسین کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مجھے آرگنائزر

اورسیکرٹری چُنا گیا جبکہ اُردو روزنامہ تسکین کے مدیر سہیل کاظمی صاحب کو نائب صدر بنایا گیا۔ ممبران میں ڈاکٹر للت مگوترہ، صدر ڈوگری سنستھا جموں، اردو شاعر بلراج بخشی اور رویندر کول صاحب کو لیا گیا۔ میں نے پاکستان کے شعراء افتخار عارف، امجد اسلام امجد، ایوب خاور، انور مسعود، کشور ناہید، اعزاز، احمد آذر، افضل ساحر، علی اکبر ناطقؔ، منظر نقوی، عشرت آفرین وغیرہ سے رابطہ قائم کیا اور علی اکبر ناطقؔ سے گذارش کی کہ وہ پاکستانی شعراء کے پاسپورٹ، شناختی کارڈ کی فوٹو کاپیاں مجھے میل کر دیں۔ میں نے فیض صاحب کی بیٹی محترمہ سلیمہ ہاشمی سے وٹس ایپ اور ای میل کے ذریعہ رابطہ قائم کیا، وہ بھی بخوشی جموں آنے کے لئے تیار ہوگئیں۔ سِول سوسائٹی کے دفتر کے لئے سہیل کاظمی صاحب نے تسکین Complex میں جگہ فراہم کردی۔ خطوط لکھنے کا تقریباً سارا کام خالد حسین جی نے کیا۔ خطوط کے مضامین کی نوک پلک سنوارنے کی غرض سے کبھی کبھی مسعود چوہدری اور محمد اسلم قریشی نے بھی مفید مُشورے دیئے۔ توسیفی پیغامات کیلئے صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ ہند، وزیراعظم، ریاستی گورنر اور وزیراعلیٰ اور ڈاکٹر کرن سنگھ جی کو خطوط لکھے گئے۔ پاکستانی مہمانوں کو جموں لانے کی اجازت کے لئے مرکزی وزارتِ خارجہ اور داخلہ کے سیکرٹری صاحبان کو لکھا گیا، اور گذارش کی گئی کہ اُنھیں جموں کے لئے ویزا جاری کیا جائے۔ ہندوستان سے بُلائے جانے والے شاعروں سے میں نے رابطہ کیا اور ای میل کے ذریعے دعوت نامے بھی بھیج دیئے۔ خالد حسین اور محمد اسلم قریشی دہلی گئے اور وزارت خارجہ کے دفتر میں گئے جہاں خالد حسین کے ایک دوست شری کے، کے سنہا (آئی، اے، ایس پنجاب کیڈر) جوائنٹ سیکرٹری کے عہدہ پر براجمان تھے۔ اُنہوں نے آدھے گھنٹے میں اجازت نامہ دے دیا۔ پھر وہ دونوں وزارت داخلہ کے سپیشل سیکرٹری شری انل گوسوامی (جموں وکشمیر کیڈر کے آئی، ایس افسر جو بعد ازاں سیکرٹری داخلہ کے عہدے سے ریٹائر

ہوئے) سے ملے۔ اُنھیں جشنِ فیض پروگرام کی پوری تفصیل بتائی اور پاکستانی مہمانوں کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپیاں پیش کیں۔ خالد حسین نے شری انل گوسوامی کے ساتھ کام کیا تھا بلکہ 81-1980ء کے وقت سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے جب خالد حسین ریاسی ضلع کے بلاک ارناس کے بلاک افسر تھے اور انل گوسوامی صاحب ریاسی کے ایس، ڈی، ایم تھے۔ پھر جب خالد حسین ضلع پونچھ کے ڈپٹی کمشنر تھے تو گوسوامی صاحب جموں صوبہ کے ڈویژنل کمشنر تھے۔ اُنہوں نے ہوم منسٹری میں جموں کشمیر سیل کے افسروں کو بلایا اور کہا کہ وہ دونوں افسروں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ اس لئے پاکستانی مہمانوں کو ویزا جاری کرنے کی کارروائی عمل میں لائی جائے اور خالد حسین سے کہا کہ وہ کوئی اپنا نمائندہ دہلی میں چھوڑ جائیں جو اُنھیں یاد دلاتا رہے۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر مشتاق قادری (جو ضلع پونچھ کے رہنے والے ہیں) کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ متعلقہ افسران کے رابطے میں رہیں۔ اِس سے پہلے خالد حسین خود پاکستان گئے اور فرداً فرداً سبھی شعراء سے ملاقات کر کے اُنھیں دعوت نامے دیئے۔ وہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں فیض صاحب کی دُختر محترمہ سلیمہ ہاشمی سے ملے۔ وہ گلوکار غلام علی سے ملے، غلام علی صاحب نے پروگرام کیلئے 12 لاکھ کا معاوضہ طلب کیا۔ جو کہ ہماری بساط سے باہر تھا۔ عابدہ پروین صاحبہ سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن اُنہوں نے 15 لاکھ روپئے کی خطیر رقم مانگی۔ اُن حالات میں خالد حسین جناب فخر زماں (مشہور ناولسٹ اور شاعر) سے اُن کے دولت خانے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ملے جہاں خالد حسین کھانے پر مدعو تھے۔ جب خالد صاحب نے اپنی مشکل بیان کی تو اُنہوں نے پٹیالہ گھرانے کے مشہور گائک اُستاد حامد علی خان صاحب کا نام تجویز کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اپنی گائکی کی وجہ سے مدتوں تک جموں والوں کو یاد رہیں گے۔ پھر اُنہوں نے اُستاد حامد علی خان سے فون پر رابطہ کیا اور اُنہیں اپنے گھر بلایا۔ خان صاحب سے مل

کر ساری بات طے ہوگئی۔ اُن کے ساتھ معاملہ تین لکھ روپئے میں طے ہوا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ اپنے ہمراہ اپنے بیٹے نایاب علی خان اور ماموں جاوید فیض کو لائیں گے۔ جن کے لئے الگ سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ اب سب سے بڑا مسئلہ چندہ جمع کرنے کا تھا۔ مسعود چوہدری صاحب نے تو صاف انکار کر دیا کہ وہ چندے کے معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جب کہ محمد اسلم قریشی نے بیس پچیس لاکھ رقم جمع کرنے کی پیشن گوئی کی اور کہا کہ ساری عمر اُنہوں نے جموں کے صنعت کاروں، سیاسی لیڈروں اور اعلیٰ افسروں کی خدمت کی ہے۔ لہٰذا اُن کے لئے رقم اکٹھا کرنا معمولی بات ہے لیکن وہ سردار سُدرشن سنگھ وزیر سے صرف 31 ہزار روپئے لینے میں کامیاب ہوئے اور اپنے دونوں بیٹوں سے 35 ہزار روپئے لے سکے۔ مسعود چوہدری صاحب کے چھوٹے بھائی محمود چوہدری نے بڑی مشکل سے 20 ہزار روپئے دیئے۔ سہیل کاظمی صاحب نے اپنے ذاتی رسوخ سے ڈائریکٹر جنرل پولیس شری کلدیپ کھڈا سے ایک لاکھ روپئے وصول کیے۔ جبکہ باقی کی ساری رقم خالد حسین نے اکٹھا کی۔ انہوں نے اپنے دوست تاج محی الدین سے دو لاکھ روپیہ، چندی گڈھ کے صنعت کار وجے میتل جی سے ایک لاکھ، نربھے ترہن، وویک مہتہ، سُنیل گپتا، بلدیوراج ڈوگرہ، اجے آنند، چوہدری نذیر احمد اور عوامی نیشنل کانفرنس کے روحِ رواں مظفر شاہ سے پچاس پچاس ہزار روپئے حاصل کئے۔ 5 لاکھ کا چیک انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن نئی دہلی کی طرف سے ڈاکٹر کرن سنگھ جی کی وساطت سے ملا۔ باقی کے 5 لاکھ انہوں نے پروگرام ختم ہونے اور اخراجات کا آڈٹ شدہ تخمینہ دیکھنے کے بعد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ڈی جی پی جناب کلدیپ کھڈا نے پولیس گیسٹ ہاؤس بھی مہمانوں کے ٹھہرنے کیلئے دے دیا، لیکن ہمنے اُس میں ہندوستانی شاعروں کو رکھا جبکہ پاکستانی مہمانوں کیلئے ہوٹل جہلم ریزارٹ باہو بلازہ بک کیا گیا۔ پاکستانی مہمانوں کو لانے کیلئے خالد حسین اور رویندر کول صاحب واہگہ بارڈر

پر گئے۔ افتخار عارف بیماری کی وجہ سے نہ آسکے۔ افضل ساحر بھی کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکے جبکہ امجد اسلام امجد صاحب کو ویزا نہیں مل سکا کیونکہ اُن کے پاسپورٹ میں درج ایڈریس اُن کے فارم کے مطابق نہیں تھا۔ باقی سبھی مہمان وقتِ مقررہ پر واہگہ باڈر پار کر کے آچکے تھے۔ محترمہ سلیمہ ہاشمی کا پیغام مِلا کہ وہ آرٹ کالج کے سالانہ فنکشن کے بعد روانہ ہوں گی۔ اس لئے خالد حسین نے ان کے لئے ایک ٹیکسی کا بندوبست کیا اور کسٹم حُکام سے گذارش کی کہ وہ محترمہ سلیمہ ہاشمی کو ٹیکسی میں جموں کے لئے روانہ کر دیں، جس کے لئے ٹیکسی ڈرائیور کو مقررہ رقم ادا کر دی گئی تھی۔ امرتسر میں دوپہر کا کھانا مشہور صحافی رشمی تلوار کی طرف سے کھلایا گیا۔ اُس کے بعد جموں کا سفر شروع ہوا۔ اُستاد حامد علی خان صاحب کو خالد حسین نے اپنی کار میں بیٹھالیا اور اُنھیں کہنے لگے کہ وہ جموں میں کوئی ڈوگری گیت بھی سنائیں۔ جموں والوں پر اچھا اثر پڑے گا تو وہ کہنے لگے کہ ملکہ پکھراج اُس کے چچا اُستاد عاشق حسین خان کی شاگرد تھیں اور ایک ڈوگری گیت ''پل بھر بھئی جانا'' گاتی تھی۔ اگر اُس گیت کے بول اُنھیں لکھوائے جائیں تو وہ گا دیں گے۔ خالد حسین نے جموں ڈاکٹر للت مگوترہ کو فون ملایا۔ اُس نے پورا گیت لکھوایا۔ پھر خان صاحب کہنے لگے کہ خالد حسین اُن کے ساتھ گائیں تا کہ گانا یاد ہو جائے۔ اُستاد حامد علی خان عالمی شہرت یافتہ پاکستانی کلاسیکل سنگر ہیں۔ اُن کے والد چچا سب اُستاد فنکار تھے۔ فلم مغل اعظم میں اُن کے دادا ابو کے بھائی اُستاد بڑے غلام علی خان نے کلاسیکل گیت گائے تھے۔ اُن کے برادر اُستاد فتح علی اور اُستاد امانت علی تھے۔ امانت علی کے بیٹے اسد امانت علی اور شفقت امانت علی اُن کے بھتیجے ہیں اُن کے اپنے تین بیٹے بھی گاتے ہیں۔ خیر مکریاں تک اُنھیں ملکہ پکھراج کا مشہور نغمہ ''پل بھر بھئی جانا'' یاد ہو گیا۔ راستے میں خالد حسین کو ڈوگری کی شاعرہ، وِجیا ٹھاکر اور پھر ڈپٹی کمشنر کٹھوعہ محترمہ زاہدہ خان کا فون آیا کہ اُنھوں نے کٹھوعہ کے ہائر سیکنڈری

سکول میں مہمانوں کے لئے استقبالیہ رکھا ہے۔ لہٰذا وہ کٹھوعہ میں رک کر جائیں۔ خالد صاحب نے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن ڈی۔سی، صاحبہ نہیں مانیں۔ مجبوراً ہمیں کٹھوعہ میں رُکنا پڑا کیونکہ وہ خود راستہ روک کے بیٹھی تھیں۔ کٹھوعہ ضلع کی پوری انتظامیہ اور پولیس کے افسران و معزز شہری ہائر سیکنڈری سکول میں جمع تھے۔ مہمانوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ گلدستے پیش کئے گئے۔ رنگا رنگ کلچر پروگرام پیش کیا گیا۔ خلوص میں ڈوبی چائے پلائی گئی۔ پاکستانی مہمان ریاست میں داخل ہوتے ہی اس بھرپور سواگت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خالد حسین نے مہانوں کا تعارف کرایا اور ضلع انتظامیہ کے افسران کا تعارف مہمانوں سے کرایا۔ پھر یہ قافلہ جموں کے لئے روانہ ہوا۔ جموں پہنچتے ہی جہلم ریزارٹ میں اخباری اور ٹیلی ویژن چینلوں کے رپوٹروں کی بھیڑ نے پاکستانی مہمانوں کو گھیر لیا اور انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ جن ہندوستانی شعراء کو دعوت دی گئی تھی، اُن کے اسمائے گرامی تھے۔ گلزار، جاوید اختر، ندا فاضلی، وسیم بریلوی، انور جلال آبادی، اشوک ساحل، نواز دیوبندی، فیاض فاروقی (آئی، پی، ایس) سردار پنچھی، طاہر فراز اور خوشبیر سنگھ شاد، جموں وکشمیر کے کسی بھی شاعر کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ جس پر سبھی مقامی شعراء سخت ناراض تھے۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ پاکستانی شعراء کے ساتھ دِن میں اُن کی ملاقات اور شعر وسخن کی محفل سجانے کے لئے تین گھنٹے کا وقت رکھا گیا ہے اور وہ اُن سے شعر وادب پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بضد تھے کہ اُنھیں مشاعرے میں کلام پڑھنے کا موقع دیا جائے جو کہ ناممکن تھا کیونکہ دونوں ملکوں کے شعراء کی تعداد بیس تھی۔ اسی لئے فیصلہ لیا گیا تھا کہ کوئی بھی مقامی شاعر نہیں پڑھے گا۔ پرتپال سنگھ بیتاب تو آپے سے باہر ہو کر بُرا بھلا بھی کہہ رہا تھا۔ ان کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر خلیق انجم، تحریکِ ادب وارانسی کے مدیر جاوید انور، ساہت اکادمی کے اُردو شعبہ سے عارف مسعود اور مشتاق صدف بھی تشریف

لائے تھے ہندوستان میں ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر بھی ''جشن فیض'' کی تقریب میں حصہ لینے آئے تھے۔ کتھک ڈانسر رِچا جین اور پنجابی گائک جاگیر سنگھ بھی اس پروگرام میں شامل تھے۔ چوہدری مسعود کی دیکھ ریکھ میں دعوتی کارڈ تقسیم ہوئے۔ آدھے سے زیادہ دعوت نامے ایس، ایس، پی جناب شریف چوہان نے تقسیم کروائے۔ اور ہمارے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔ چوہدری مسعود صاحب نے ہماری ساری ٹیم کو نظم وضبط میں رکھا۔ محمد اسلم قریشی، خالد حسین اور مسعود چوہدری صاحب وزیر اعلیٰ جناب عمر عبداللہ کو خود مدعو کرنے گئے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اُنہوں نے پاکستانی وہندوستانی مہمانوں کو عشائیہ دینے کا بھی وعدہ کیا۔ اور ''جشن فیض احمد فیضؔ'' کی افتتاحی تقریب کا مہمانِ خصوصی بننا بھی قبول کرلیا۔ 10/دسمبر 2011ء کو جموں یونیورسٹی کے جنرل زور آور سنگھ آڈیٹوریم میں صبح دس بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مسعود چوہدری صاحب نے استقبالیہ پڑھا۔ بعد ازاں وزیر اعلیٰ جناب عمر عبدالہ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے جموں سول سوسائٹی فار آرٹ اینڈ لٹریچر کی تعریف کی اور کہا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان غلط فہمیاں اور دُوریاں ختم ہونی چاہئیں۔ اس مقصد کے لئے ایسے پروگرام کرنے بہت ضروری ہیں۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ یہ کام ریاستی کلچر اکادمی یا جموں یونیورسٹی نے کرنا چاہئے تھا لیکن وہ نہ کرسکے۔ وزیر اعلیٰ نے پاکستانی مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ وہ واپس جاتے وقت ہمارے پیار، خلوص، مہمان نوازی اور امن کی خواہش کا پیغام لے کر جائیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ فیض احمد فیضؔ اور اُن کے دادا ابو شیخ محمد عبداللہ گہرے دوست تھے۔ دادا جان فیض کی شاعری کے دِلدادہ تھے۔ فیض صاحب کے نکاح میں دادا جان اُن کے وکیل تھے اور وہ نکاح سرینگر میں شری امر سنگھ کالج کے رہائشی بلاک میں ہوا تھا۔ جہاں امر سنگھ کالج کے پرنسپل اور فیض صاحب کے ہم زُلف اور پاکستانی پنجاب کے سابقہ مقتول گورنر سلمان تاثیر

کے والد پروفیسر محمد دین تاثیرؔ رہتے تھے۔فیض صاحب کی بیوی ایلیس اور پروفیسر محمد دین تاثیرؔ کی بیگم دونوں سگی بہنیں انگریز تھیں اور صرف انگریزی زبان ہی بول سکتی تھیں جبکہ عمر عبداللہ صاحب کی دادی بیگم اکبر جہاں (مادرِ مہربان) بھی انگریز باپ کی بیٹی تھیں۔وزیر اعلیٰ کے خطاب کے بعد پٹیالہ گھرانے کے استاد حامد علی خان نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔جنرل زور آور سنگھ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔جموں کی سول سوسائٹی، یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیسر، مقامی ادیب اور شعراء اور موسیقی کے پرُستار سبھی ہال میں حاضر تھے۔ریاستی کابینہ کے سبھی وزراء پروگرام دیکھنے اور سننے کے لئے تشریف لائے تھے۔اسمبلی کے اسپیکر اور کونسل کے چیئرمین، انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران جموں یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ورون ساہنی اور ڈاکٹر سُدھیر سنگھ بلوریا، دوردرشن کے ڈائریکٹر شبیر مجاہد پروگرام سے لطف اندوز ہونے کے لئے تشریف فرما تھے۔شبیر مجاہد اور اُن کے نائب ڈاکٹر سوہن لال کول نے پروگرام کو فلم بند کرنے کے لئے کیمرے لگائے تھے۔جبکہ ریڈیو کشمیر جموں نے پروگرام کی ریکارڈنگ کا پورا بندوبست کیا تھا۔اس کے علاوہ نجی ٹیلی ویژن چینل والوں نے بھی اپنے کیمرے لگائے تھے تاکہ دو دِنوں پر مشتمل جشن فیض کی کاروائی کی ویڈیوگرافی کی جاسکے۔تعریفی کلمات کے بعد اُستاد حامد علی خان صاحب نے گانا شروع کیا۔سازندے سبھی مقامی تھے۔صرف خان صاحب کے ماموں جاوید فیض ڈھولک پر اُن کے ساتھ سنگت کر رہے تھے۔استاد حامد علی نے فیض کی غزلیں سنائیں۔پنجابی اور ڈوگری گیت گائے اور آخر میں اپنے بیٹے نایاب علی خان کے ساتھ مِل کر کلاسیکی جُگل بندی سُنائی اِس کلاسیکی بندش میں نایاب علی نے اپنی آواز اور مہارت کا وہ جادو جگایا کہ سارا ہال تقریباً تین منٹ تک تالیاں بجاتا رہا۔اُستاد حامد علی نے لوگوں کی فرمائش پر اپنے بڑے بھائی اُستاد امانت علی کی گائی ہوئی دو غزلیں بھی

سنائیں۔ نیشنل کانفرس کے صوبائی صدر دیویندر رانا کی فرمائش پر اُنہوں نے انشا جی چلو اب کوچ کرو' سنائی۔ اُن کے بعد رچا جین نے فیض کی دو غزلوں پر کتھک ڈانس پیش کیا اور جاگیر سنگھ نے فیض صاحب کی پنجابی نظم ''ربّا میریا'' گا کے سنائی۔ رات نو بجے وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ کی سرکاری رہائش گاہ واقع وزارت روڈ جموں میں مہمانوں کیلئے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں مشہور مقامی اردو شاعر جناب فاروق نازکی نے پاکستانی شاعر انور مسعود صاحب سے کہا کہ ان کے وزیر اعلیٰ ایک آدھ مہینے سے غمگین ہیں (بیوی سے طلاق ہوگئی تھی) اس لئے اُنھیں ہنسانے کے لئے اپنا کوئی مزاحیہ کلام سنائیں۔ انور مسعود صاحب کے کلام سے سبھی محظوظ ہوئے۔ عمر اللہ صاحب تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ پھر ایوب خاور صاحب نے اپنی مشہور زمانہ غزل ''سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام'' سنائی۔ جب انہوں نے غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

تیرے بِنا جو عمر بتائی بت گئی
اب اِس عمر کا باقی حِصہ تیرے نام

تو انور مسعود نے پنجابی میں جگت کی ''رہیند کھوند'' یعنی بچا کھچا حِصہ، تو محفل پھر زعفران زار بن گئی۔ کشور ناہید اور دوسرے پاکستانی شعراء اور ندا فاضلی نے بھی اپنا ایک آدھ شعر سُنایا۔ یوں مشہور وازہ (خانساماں) حاجی غلام محمد المعروف ممہ وازہ کے بنائے ہوئے وازوان کے ساتھ یہ محفل برخاست ہوئی۔ دوسرے دِن کا آغاز فیض احمد فیض کی بیٹی محترمہ سلیمہ ہاشمی کے مضمون سے شروع ہوا۔ اس خوبصورت پیپر میں سلیمہ ہاشمی صاحبہ نے اپنے والد کا سیالکوٹ سے ٹانگے میں جموں آنا اور وہ بھی صرف اپنی محبوبہ ایلیس سے ملنے کے لئے، اُن کی شادی کا احوال۔ پاکستان میں جنرل ایوب خان اور پھر جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں باغیانہ نظمیں لکھنے پر قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا، خاص کر منٹگمری

(ساہیوال) جیل کی روداد، بیٹیوں سے محبت اور بین الاقوامی سطح پر اُن کی عزت افزائی کا ذِکر تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ محترمہ سلیمہ ہاشمی پیپر نہیں پڑھ رہیں بلکہ اپنے والد سے باتیں کر رہی ہیں۔ مشاعرہ شام 5 بجے شروع ہوا جس کی نظامت انور جلال آبادی نے کی۔ سب سے پہلے ملکی شعراء کو دعوت سُخن دی گئی۔ چنانچہ وسیم بریلوی، فیاض فاروقی، نواز دیوبندی، اشوک ساحل، سردار پنچھی، انور جلال آبادی اور نِدا فاضلی صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ گلزار صاحب اور جاوید اختر اپنی فلمی مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکے۔ مشاعرے کے دوسرے حصے میں پاکستانی شعراء نے اپنا کلام سنایا جبکہ نظامت کے فرائض اعزاز احمد آذر مرحوم نے ادا کئے۔ مشاعرے کی صدارت جناب انور مسعود صاحب نے کی۔ جن پاکستانی شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ اُن کے اسمائے گرامی یہ تھے، ایوب خاور اعزاز احمد آذر، منظر نقوی، علی اکبر ناطق، عشرت آفرین اور کشور ناہید، آخر میں انور مسعود نے اُردو اور پنجابی کی سنجیدہ شاعری سنانے کے بعد اپنا مزاحیہ کلام دونوں زبانوں میں سنایا۔ اور پھر فرمائش شروع ہوئی۔ ایوب خاور اور کشور ناہید نے دوبارہ اپنا کلام سُنایا اور انور مسعود صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق مزاحیہ نظمیں ''بنیان''، ''کیہ پکایئے'' وغیرہ سنائیں۔ رات کو قانون ساز کونسل کے چیئر مین شری امرت ملہوترا کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ وہاں فرمائش پر اُستاد حامد علی خان اور نایاب علی نے اپنی من پسند غزلیں اور کلاسیکی رنگ پیش کیا۔ سابقہ ایڈوکیٹ جنرل اور خالد حسین صاحب کے دوست اسلم گونی صاحب نے پاکستانی مہمانوں کو اگلی شام کھانے کی دعوت پر بُلایا۔ جبکہ خالد حسین نے بٹھنڈی میں اپنے گھر سب کو ناشتے پر آنے کی دعوت دی۔ اسلم گونی صاحب نے بھی وازوان سے مہمانوں کی تواضع کی اور وہاں بھی سنگیت اور شعر وشاعری کی محفل جمی۔ چوتھے دِن پاکستانی مہمانوں کے قافلے کو میں یعنی لیاقت جعفری اور خالد حسین لیکر امرتسر کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ جموں وکشمیر کیڈر کے

آئی، پی، ایس افسر اور انگریزی شاعر بسنت رتھ بھی واہگہ بارڈر تک مہمانوں کو چھوڑنے کیلئے آئے تھے۔ رات ہم نے امرتسر میں گذاری اور اگلی صبح یعنی 15 دسمبر 2011ء کو ہم نے پاکستانی مہمانوں کو واہگہ بارڈر پر الوداع کہا اور واپس جموں آ گئے۔ ''جشن فیض احمد فیض'' کا دو روزہ پروگرام نہایت کامیاب اور یادگاری رہا۔ جس کی چرچا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے کئی دِنوں تک جاری رکھی۔ پاکستانی اور ہندوستانی شاعروں کے انٹرویو چھپتے رہے۔ جموں، سرینگر، لکھنؤ، حیدرآباد اور کئی دیگر دوردرشن اسٹیشنوں سے پورے پروگرام کو دکھایا گیا۔ خالد حسین پورے پروگرام میں بہت زیادہ مصروف رہے۔ پیسے کا حساب کتاب، مہمانوں کو مشاعرہ پڑھنے کا نذرانہ دینا۔ اُستاد حامد علی خان کو طے شدہ رقم دینی، غرض مالی معاملات میں وہ بُری طرح اُلجھے رہے۔ اسی لئے وہ پروگرام میں بیک سٹیج ہی کام کرتے رہے۔ شکُر خدا کا کہ کسی مہمان نے کوئی شکایت نہیں کی۔ خالد حسین نے ذاتی طور پر دیپک شرما (ڈرامہ ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر فلوری کلچر) کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے کئی دِن کی محنت سے اسٹیج تیار کیا۔ جناب سہیل کاظمی کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اپنے دفتر میں بیٹھنے اور کام کرنے کی سہولیت بہم پہنچائی اور چائے پانی کا بھی خیال رکھا۔ جناب رونندر کول کا جو خالد حسین کی ذاتی گذارش پر ممبئی سے پروگرام کو کنڈیکٹ کرنے کے لئے آئے تھے۔ اس یادگاری پروگرام کی کامیابی کا سہرا خالد حسین اور محمد اسلم قریشی، سہیل کاظمی، مجھ ناچیز اور ''جموں سول سوسائٹی برائے فن اور ادب'' کے سبھی ساتھیوں کو جاتا ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطان پوری)

بے لباس آئینے

چلتے پھرتے ہوئے مہتاب دیکھائیں گے تمہیں
ہم سے ملنا کبھی پنجاب دیکھائیں گے تمہیں

(راحت اندوری)

جموں و کشمیر میں پنجابی ادبی انجمنیں، مادری زبان اور ادب کے لئے اُتنا کام نہیں کررہی تھیں، جتنا اُنہیں کرنا چاہئے تھا۔ کشمیر میں دہشت گردی پھیلنے سے پہلے یعنی 1990ء تک پنجابی ساہت سبھا سرینگر، تواتر سے ادبی سرگرمیاں کرتی رہتی تھی۔ ہر ہفتے سبھا کی میٹنگ ہوتی۔ جس میں ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات تنقید کے لئے پیش کرتے۔ بھرپور بحث ہوتی اور تخلیق کاروں کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ چلتا اور وہ اپنے فن پارے کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کرتے۔ پنجابی ساہت سبھا کی میٹنگوں میں بڑی خوبصورت کہانیاں پڑھی جاتیں۔ افسانوں کے علاوہ شاعری اور دیگر نثری چیزیں پڑھی جاتیں۔ جہاں ناول، ناولٹ، افسانے، ڈرامے اور دیگر اصناف پر قلمکاروں کی کاوشوں کی سراہا جاتا۔ وہیں شاعری فنی معیار پر پوری نہیں اترتی تھی، جس کی بنیادی وجہ عروض اور چھندوں سے ناواقفیت ہوتی۔ لہٰذا عامطور پر تُک بندی کی جاتی۔ پنجابی کے 90 فیصد شاعر بے وزن شعر کہتے بلکہ لکھتے ہیں۔ 1990ء سے پہلے جتنی بھی ادبی میٹنگیں ہوتیں، ان میں پنجابی کے علاوہ اردو، ہندی، ڈوگری، کشمیری اور پہاڑی کے ادیب بھی شرکت کرتے اور اپنی نگارشات پڑھتے۔ موسم گرما میں اکثر ہندوستان کے مختلف صوبوں سے پنجابی،

ہندی اور اُردو کے ادیب اور دانشور کشمیر آتے تو پنجابی ساہت سبھا والے اُنھیں اپنے پردگراموں میں شرکت کرنے کی دعوت دیتے۔ سنت سنگھ سیکھوں، کرتار سنگھ دُگل، ہر بھجن سنگھ، عطر سنگھ، کلونت سنگھ وِرک، سوہن سنگھ، ستیل، کپور سنگھ گھمن، اجیت کور، دلیپ کور ٹوانہ، مہیپ سنگھ، پریتم سنگھ، جگجیت سنگھ آنند، سادھو سنگھ ہمدرد، پریم پرکاش، ہر بھجن باجوہ، (پنجابی ادیب ودانشور) علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، مظہر امام، قیصر قلندر، رتن سنگھ (اردو) وغیرہ نامور ادیبوں اور شاعروں نے سبھا کے صدر دفتر واقع لگڑ بازار (مائسمہ) کورونق بخشی۔ سبھا اپنا ماہنامہ ''ھیمال'' بھی نکالتی تھی۔ کل ہند پنجابی ادبی کانفرنس 7-8 جولائی 1975) کو کون بھلا سکتا ہے۔ لیکن 1990ء کے بعد کشمیر میں حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ پنجابی ساہت سبھا کا دفتر بند ہو گیا اور مقامی پنجابی ادیبوں کو گوردوارے میں پناہ لینا پڑی۔ کرفیو، کریک ڈاؤن، بم بلاسٹ، گولی باری اور کراس فائرنگ کی وجہ سے ادیب، شاعر اور دانشور کئی مہینے مِل نہیں پاتے تھے۔ ادبی میٹنگیں تقریباً ختم ہوگئیں۔ ادیب گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ خالد حسین بھی پنجابی ساہت سبھا سری نگر کا حاصل تھا۔ اُس نے 1971ء سے سبھا کی میٹنگوں میں جانا شروع کیا اور اُسے ہر بھجن سنگھ ساگر وہاں لیکر گیا تھا جس کی ایما پر خالد حسین نے پنجابی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ 1981 تک لگا تار پنجابی ساہت سبھا کا حصہ رہا اور 1975ء کی کُل ہند پنجابی ادبی کانفرنس کے بعد وہ سبھا کی پہچان بن گیا۔ اُس کے دو پنجابی افسانوی مجموعے ''تے جہلم وگدار ہیا'' اور ''گوری فصل دے سوداگر'' اُن ہی کہانیوں پر مشتمل ہیں جو اُس نے سبھا کی میٹنگوں میں پڑھی تھیں۔ دربار مُوجب جموں ہوتا تو وہ پنجابی لیکھک سبھا جموں، ساہت سبھا رنبیر سنگھ پورہ اور بزم فروغِ اُردو کی ادبی نشستوں میں جایا کرتا۔ جموں وکشمیر میں تقریباً تیس پینتیس پنجابی ادیب اور شاعر ہوں گے۔ نئے لکھنے والے اِکا دُکا ہی نظر آتے

ہیں، لیکن پونچھ کے ایک نوجوان شاعر جو پچھلے 25 سال سے جموں میں رہتا ہے، اُس نے پنجابی شاعری کے حوالے سے اپنا منفرد مقام بنایا ہے اور نہ فقط ہندوستان اور پاکستان بلکہ پوری دُنیا میں بسنے والے پنجابیوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اُس کا نام سوامی انترنیرو ہے اور وہ پنجابی کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان اور پنجابی کی ایک ذیلی بولی پوٹھواری یا پہاڑی میں بھی بڑا خوبصورت کلام کہتا ہے۔ اسی طرح پونچھ کا ہی ایک اور ہیرا لیاقت جعفری ہے جو آج بین الاقوامی سطح پر اُردو پڑھنے، لکھنے اور سُننے والوں میں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگوں اور خاص کر دانشوروں کو اُس کے کئی اشعار ازبر ہیں اور عام بات چیت میں اُس کے اشعار دہرائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بھی پوٹھواری یا پہاڑی میں شعر کہتا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر کمل دیپ سنگھ، ہرجیت سنگھ دیپ، ڈاکٹر رندھیر کور جیسے نئے لکھنے والے اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر مونو جیت، سُریندر نیر اور بلجیت سنگھ رینہ تواتر سے لکھ رہے ہیں اور پنجابی ادبی دُنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک آدھ پرانے ادیب بچے ہوئے ہیں جو شاید اب لکھتے تو نہیں لیکن تقریبات کی صدارت ضرور فرماتے ہیں ورنہ ریاست میں پنجابی کے نام پر اب ہاشم دین کا پنکھا ہی رہ گیا ہے۔ جموں یونیورسٹی میں پنجابی شعبہ پچھلے 46 سالوں سے کام کر رہا ہے لیکن ڈاکٹر دیویندر سنگھ کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس شعبۂ میں بھی کوئی ادبی سرگرمی نہیں ہو رہی۔ نہ کبھی سمینار اور نہ ہی طالب علموں کو یونیورسٹی میں آنے والے مہمان ادیب، شاعر یا محقق سے ملایا جاتا ہے یا اُن کا کوئی توصیفی لیکچر کرایا جاتا ہے تاکہ طالب علموں کا رجحان پنجابی زبان وادب کی طرف بڑھے۔ الغرض سارا پنجابی شعبہ جمود کا شکار ہے۔ یہی حال ادبی انجمنوں کا ہے۔ دوردرشن اور آکاش وانی سے بھی پنجابی پروگرام کم وبیش ختم کردیئے گئے ہیں۔ اس صورتِ حال سے خالد حسین بہت دُکھی تھا۔ ایک دِن وہ میرے پاس آیا اور کہنے

لگا کہ کیوں نہ ایک فعال ادبی تنظیم بنائی جائے اور جموں وکشمیر میں پنجابی میں لکھنے والوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کی تخلیقات پر سمینار کرائے جائیں۔ ملک بھر سے نامور، نقاد، دانشور اور محققین کو بُلایا جائے اور مقامی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر پیپر پڑھائے جائیں تا کہ ہمیں اپنی خامیوں کا پتہ چل سکے اور ان کے مشوروں سے اپنی تحریروں میں بہتری لائی جا سکے اور ہم سب کو پتہ چلے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم چار ادیب اکٹھا بیٹھے اور یوں ''پنجابی ادبی سنگت'' کا جنم ہوا جس میں خالد، ہر بھجن سنگھ ساگر، سرن سنگھ اور میں یعنی ڈاکٹر سوشیل شرما تھے۔ نہ کوئی صدر، نہ جنرل سیکرٹری اور نہ کوئی عہدے دار۔ اس چوکڑی نے پہلا سمینار ہر بھجن سنگھ ساگر کی کہانیوں پر کروایا۔ اُس کی کتابیں مضمون نگاروں کو بھیجی گئیں۔ پنجاب، ہریانہ اور دہلی سے پنجابی الوچک پرچے پڑھنے آئے۔ اسی طرح کنول کشمیری، پروفیسر پریم سنگھ، سرن سنگھ، بلجیت رینہ، گورچرن سنگھ گلشن اور سریندر نیر کی تخلیقات پر الگ الگ سمینار کرائے گئے۔ ان میں ملک بھر کے پنجابی سکالروں نے حصہ لیا۔ ان تمام پڑھے گئے مضامین کو ریاستی کلچر اکادمی کے پنجابی جریدے ''شیرازہ پنجابی'' میں قسط وار چھپوایا گیا۔ اسکے علاوہ پنجاب سے چھپنے والی کئی پنجابی میگزینوں میں بھی یہ پیپر چھپے۔ جن کی وجہ سے ریاست کے ادیبوں کی بیرون ریاست پہچان بنی۔ پنجابی ادبی سنگت کی طرف سے ایک تحقیقی جریدہ لوک وانی جاری کیا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے یہ بند کرنا پڑا گیا۔ ریاستی کلچرا کادمی نے خالد حسین کے افسانوی سفر پر تین روزہ سمینار جموں کے کندن لال سہگل ہال میں کرایا۔ جس میں ملک بھر سے نامی گرامی دانشور اور تنقید نگاروں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر دیپک منموہن سنگھ (چنڈی گڑھ) ڈاکٹر ستیندر سنگھ نور (نائب صدر ساہتہ اکادمی نئی دہلی) ڈاکٹر روندر کمار (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر رویل سنگھ (سکریٹری پنجابی اکادمی اور نقاد، نئی دہلی)، ڈاکٹر سرُ جیت

(صدر شعبہ پنجابی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ) ڈاکٹر جوگندر سنگھ راہیؔ (سابقہ صدر شعبہ پنجابی گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر)، ڈاکٹر رمیندر کور (صدر شعبہ پنجابی، گورونانک دیو یونیورسٹی)، ڈاکٹر ہرجیت سنگھ، ڈاکٹر سکھدیو (صدر شعبہ پنجابی، پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ)، ڈاکٹر دیویندر کور (امرتسر)، ڈاکٹر برجندر نسرالی، ڈاکٹر صنوبر، ڈاکٹر انورادھا، ڈاکٹر کمل دیپ، ڈاکٹر رندھیر، ڈاکٹر پرمندر سنگھ (سابقہ ہیڈ آف انگلش ڈیپارٹمنٹ گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر، جاوید قدوس (سابقہ ہیڈ اُردو شعبہ کشمیر یونیورسٹی جنہوں نے خالد حسین کی اردو کہانیوں کے بارے میں مفصل پرچہ پڑھا) ان سب دانشوروں نے خالد حسین کی کہانیوں کے موضوعات، پیش کاری، فنی چابک دستی، شاعرانہ زبان کا استعمال، محاوروں اور علامتوں کے بارے میں پرچے پڑھے۔ ان کے اسلوب پر بات کی گئی۔ مضامین میں ایسی ایسی پرتیں کھولی گئیں، جن سے شاید افسانہ نگار بھی ناواقف ہو۔ سمینار کے تیسرے دِن کی کاروائی ضلع ادھم پور کی تحصیل لاٹی کے صحت افزا مقام دُھونہ میں خالد حسین کے سسرال گھر میں ہوئی جو جموں سے 150 کلومیٹر دور ہے دُھونہ چنہنی سُدھ مہادیو اور وہاں سے مان تلائی (جہاں دھریندر برہمچاری نے آشرم بنایا تھا) آشرم سے 25 کلومیٹر آگے پڑتا ہے۔ یہ علاقہ گلمرگ اور یوس مرگ سے کسی بھی طور کم خوبصورت نہیں ہے۔ یہاں دیوداروں کے جھرمٹ میں ادبی محفل سجائی گئی اور باقی کے پرچے پڑھے گئے۔ ان تمام مضامین کو یکجا کر کے میں نے کتاب تیار کی اور ''خالد حسین دا کتھا جگت،'' کے عنوان سے چھپوائی جو ریسرچ سکالروں کے لئے ایک ریفرنس بُک بن چکی ہے۔ ریاستی کلچرا کادمی نے بھی یہ مضامین لڑی وار پنجابی شیرازہ میں شائع کئے تھے۔ پنجابی ادبی سنگت'' نے پاکستان کے مشہور پنجابی ناول نگار اور شاعر فخر زمان صاحب کو جموں بُلا کر اُن کے ساتھ ایک پروگرام کروایا۔ جس کی صدارت جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امیتابھ مٹو نے کی اور

کشمیر ٹائمز کے مدیر جناب وید بھسین مہمانِ خصوصی تھے۔ یہ پروگرام جموں یونیورسٹی کے چھوٹے ہال میں منعقد ہوا۔ خالد حسین کی سرپرستی میں ادبی سنگت نے کئی کتابیں چھاپیں۔ جموں کشمیر کے فنکاروں، صحافیوں، شاعروں، افسانہ نگاروں کے انٹرویو کئے جو جالندھر سے چھپنے والے پنجابی روزنامہ ''نواں زمانہ'' میں چھپے۔ جن لوگوں کے انٹرویو میں نے کئے اُن میں کشمیری زبان کے معتبر شاعر اور بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ اور ساہتہ اکادمی انعام یافتہ جناب رحمان راہیؔ، انگریزی روزنامہ ''کشمیر ٹائمز'' کے چیف ایڈیٹر جناب وید بھسین، سردار پرتپال سنگھ بیتابؔ، نرسنگھ داس دیو جموال (ڈوگرہ ادیب) ہر بھجن سنگھ ساگر، کنول کشمیری، سرن سنگھ اور خالد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ خالد حسین کا انٹرویو شاہ مکھی (اردو رسم الخط) میں ڈاکٹر پروفیسر عاشق رحیل نے روزنامہ ''خبراں'' لاہور میں شائع کیا۔ یہ سبھی انٹرویو بعد ازاں میں نے ''ساہت سنواد'' کے نام سے کتابی صورت میں چھاپے۔ ان انٹرویوں کی وجہ سے ریاست کے کشمیری، ڈوگری، اردو اور پنجابی ادیبوں کی جان پہنچان پنجابی دنیا سے ہوئی۔ پنجابی ادبی سنگت نے جموں میں دوبار پنجابی لوک گیتوں کا رنگا رنگ پروگرام بھی کرایا۔ جبکہ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور نارتھ زون کلچر سنٹر پٹیالہ کی شراکت سے ایک بہت بڑا ثقافتی پروگرام جموں میں کرایا۔ ساہت اکادمی نئی دہلی کی مالی مدد سے پنجابی سمینار سرینگر میں کرایا۔ جس میں کشمیر کے اردو اور کشمیری ادیبوں نے بھی شرکت فرمائی۔ جن میں جناب فاروق نازکی، ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، خالد بشیر احمد، رُخسانہ جبیں عزیز حاجنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پنجابی ادبی سنگت کے پروگرام دراصل گھر پھونک تماشہ دیکھنے والی بات رہی کیونکہ مالی بوجھ کوئی بھی بانٹنے کو تیار نہ تھا۔ ڈھیرے ڈھیرے ''پنجابی ادبی سنگت'' بھی کاغذوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ مجالس کے لئے 80 فیصد خرچہ خالد حسین کو برداشت کرنا پڑتا جس سے وہ دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی پنجابی زبان

اورادب کی ترقی کے لئے اُس کا جنون کبھی کم نہ ہوا۔اس بات کا ثبوت ڈاکٹر اروندر سنگھ امن ایڈیشنل سیکرٹری کلچرا کادمی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مجھے سنایا کہ جب مردم شماری کے اہلکار نے خالد حسین کو اُن کی مادری زبان کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ''پنجابی'' جب اُس نے پوچھا کہ دوسری زبان کون سی ہے تو جواب مِلا کہ ''پنجابی'' جب اُس نے پوچھا کہ تیسری زبان کون سی ہے تو جواب ملا کہ اُردو ہے۔خالد حسین کے فن اور شخصیت کے بارے میں ریاستی کلچرا کادمی نے ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کیا۔اسی طرح بدایوں سے نکلنے والے ماہنامے ''لمحے لمحے'' کا بھی ایک خصوصی شمارہ اُن کے اردو افسانوں کے حوالے سے شائع ہوا۔جبکہ ''تحریک ادب وارانسی اور ''نگینہ'' سرینگر کے خصوصی گوشے بھی ان کے اردو ادب اور فن کے حوالے سے شائع ہو چکے ہیں۔آج وہ ہم سے بچھڑ چکے ہیں جس کا ہم سب کو دُکھ ہے، افسوس ہے۔ہم دعا گو ہیں کہ وہ وہاں بھی اپنے ادبی حلقہ احباب میں رہیں اور پر سکون رہیں ۔

مجھ کو کبھی غُرور سے نسبت نہیں رہی
یہ سانپ آستیں میں پلنے نہیں دیا

مومن کافر میں کیا جانوں

اردو کا شعر ہے

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں
(اقبالؔ)

خالد حسین اپنی آزاد خیالی اور مذہبی ٹھیکیداروں بارے منفی سوچ کی وجہ سے مذہب کی غلط تشریح کرنے والے نام نہاد مولوی صاحبان اور کٹّر پنتھی دھرم گورو اور سوامی جن اُن سے دُکھی رہتے تھے۔ اُن کا یہی نظریہ دیگر مذاہب کے شدّت پسند لیڈروں کے بارے میں بھی تھا۔ اسی لئے خالد حسین کو پنڈت پُجاری اور 'ملا' بخاری، کانٹوں کی طرح چُبھتے تھے کیونکہ وہ اندھ وشواسی پر یقین نہیں رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ دلیل کے ساتھ آدمی اپنی بات منوائے۔ جبھی تو اُن کے دوست احباب اور عزیز واقارب اُنھیں باغی سرپھرا پاگل اور مرتد کہتے تھے۔ وہ اپنی بات کُھل کر اور صاف لفظوں میں کرنے کے عادی تھے۔ چھل فریب اور لحاظ داری اُن کی خصلت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر الزامات کے بھنور میں پھنسے رہتے۔ اوپر سے سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اُن کا بیٹا شدّت پسندوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا اور بالآخر جیل کی کال کوٹھری میں ٹوٹ گیا۔ کئی سالوں تک وہ بیٹا اُن کی ہتھیلی کا چھالا بنا رہا کیونکہ اُس نے خالد حسین کی سوچ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے دل ودماغ پر کئی خراشیں لگی تھیں۔ دھرم اور سیاست کے نام پر اپنی لیڈری چمکانے والے انھیں بدنام

کرتے رہتے اور خفیہ ایجنسیوں سے اُس کی شکایتیں کرتے رہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں بھی خالد حسین کی پوسٹنگ ہوئی۔ خفیہ اداروں کے کارندے اُن کا پیچھا کرتے رہتے اور اُن کی پوری خبر رکھتے۔ ان باتوں کا میں چشم دید گواہ ہوں کیونکہ میں نے اُن کے ماتحت کام کیا ہے اور اُن کی صاف گوئی کا ہمیشہ سے شیدائی رہا ہوں۔ میرا نام بھولا ناتھ ہے۔ یہ جنوری 1993ء کی بات ہے جب خالد حسین راجوری ضلع کے اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ تعینات تھے۔ ایک دِن ''آئی، بی'' کے دو افسر دفتر آئے اور ہندو ملازموں سے پوچھنے لگے کہ اُن کا افسر خالد حسین کیسا آدمی ہے؟ یہ جانتے ہوئے کہ خالد حسین علاقے کے دورے پر گئے ہیں، وہ دفتر میں آئے تھے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ غیر مسلم ملازموں کے ساتھ اُن کا سلوک کیسا ہے؟ وہ اُنھیں تنگ تو نہیں کرتے؟ کیا وہ بھارت مخالف باتیں کرتے ہیں۔ پاکستان اور کشمیر مسئلے کے بارے میں اُن کا نظریہ کیا ہے؟ کیا وہ اُگر وادیوں کے ہمدرد ہیں ؟ جب ہم نے کہا کہ سبھی ملازموں کے ساتھ اُن کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے اور وہ ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم نے اُن کے مُنھ سے کبھی ملک دشمن باتیں نہیں سُنیں، تو وہ ہمارے بیان لیکر چلے گئے۔ بالکل اسی طرح کی پوچھ گچھ ڈوڈہ اور پونچھ میں بھی کی گئی جب وہ وہاں اپنے انتظامیہ فرائض انجام دے رہ تھے۔ ہر جگہ غیر مسلم ملازموں نے خالد حسین کے بارے میں اچھے بول بولے تھے۔ ادب اور ادیبوں کے ساتھ گہرا رشتہ رکھنے کے کارن خالد حسین جہاں بھی جاتے، وہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری رکھتے۔ 1987ء میں جب وہ اے، سی، ڈی ڈوڈہ تھے تو اُنھوں نے وہاں ولی محمد اسیر کشتواڑی اور محمد اسحاق زرگر کے ساتھ مل کر آل انڈیا اردو مشاعرہ کروایا، جس میں ہندوستان بھر سے شعراء تشریف لائے تھے۔ تین شاعر خالد کفایت، عارف حلیم اور رمضان سعید مالیر کوٹلہ سے آئے تھے۔ خالد کفایت خالد حسین صاحب کا بہت اچھا دوست تھا اور علم عروض کا ماہر

بھی۔ مشاعرے کے اختتام پر مالیر کوٹلہ سے آئے تینوں دوست خالد حسین کے پاس کچھ دنوں کے لئے رک گئے۔ دراصل ماسٹر رمضان سعید اُن دِنوں قرآن پاک کا پنجابی ترجمہ کر رہا تھا، جو اصل میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اُردو ترجمہ سے اخذ کیا گیا تھا۔ وہ پنجابی میں ترجمہ کئے ہوئے چند سپارے ساتھ لایا تھا تا کہ خالد حسین کو ترجمہ سنایا جائے اور زبان وبیان کے حوالے سے خامیوں کو دور کیا جاسکے۔ وہ سب اکٹھے بیٹھتے اور ایک سپارے پڑھتے جاتے۔ لیکن خالد حسین نے اُن سے کہا کہ وہ قرآن مجید کا عربی متن اور اس کا اردو ترجمہ بھی پڑھتے جائیں۔ خالد حسین پہلے عربی میں آیات پڑھتے پھر مودودی صاحب کا کیا ہوا ترجمہ پڑھتے اور آخر میں پنجابی ترجمہ پڑھتے اور ضرورت کے مطابق پنجابی کا ٹھیٹھ لفظ ڈھونڈ کر دیتے۔ ترجمے میں فارسی اور اُردو کے الفاظ کو کم سے کم کر کے اُن کے بدلے پنجابی زبان اور اُس کی ذیلی بولیوں سے الفاظ منتخب کر کے اُنھیں استعمال کرنے کیلئے کہتے۔ یوں خالد حسین کی سرپرستی میں تین سپاروں کے ترجمے کی زبان میں ضروری سُدھار کیا گیا اور خالد صاحب نے کہا کہ باقی کا ترجمہ بھی اُسی طرح کیا جائے۔ رمضان سعید کو پنجابی ترجمہ کرنے میں تقریباً دو سال لگ گئے۔ جب بھی اُسے ضرورت پڑتی تو وہ خالد حسین سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے مشورے لیتا۔ پنجابی قرآن مجید جماعت اسلامی ہند نے اپنے خرچے پر چھپوایا اور رسمِ اجرا کے موقع پر خالد حسین کو بھی بُلایا گیا۔ خالد حسین اُن دِنوں ضلع جموں کے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ یوم آزادی کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف تھے جب اُنھیں مالیر کوٹلہ سے خالد کفایت کا فون آیا کہ 16 راگست 1998 کو پنجابی قرآنِ پاک کی تقریب رونمائی دِن 11 بجے اسلامیہ ہائر سیکنڈری سکول مالیر کوٹلہ میں ہوگی اور اُن کی شمولیت اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اس فنکشن کے ایک مُقرر ہیں۔ 15 راگست کی پریڈ ختم ہوتے ہی خالد حسین مالیر کوٹلہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ تقریب رُونمائی کی صدارت

مرکزی وزیر زراعت سُرجیت سنگھ برنالہ کر رہے تھے جبکہ مہمانِ خصوصی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر تھے۔ خالد حسین نے اپنی تقریر میں کہا کہ اپنی مادری زبان میں قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا انتہائی اہم ہے کیونکہ ہمارے لوگ عربی زبان نہیں جانتے۔ پنجابی (گورمکھی) زبان میں یہ ترجمہ غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی ایک نایاب تحفہ ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے پیغام اور اسلام کی عظمت کے بارے میں جان سکیں گے اور مذہبی منافرت پھیلانے والی شدّت پسند قوتوں کے عزائم سے بھی عام لوگ واقف ہو سکیں گے۔ خالد حسین نے اپنی ماں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اُن کی ماں پچھلے پچاس سالوں سے قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہی ہے لیکن اُسے قرآنی آیات کا مفہوم بالکل نہیں پتہ، جب ایک دفعہ اُنہوں نے ماں سے پوچھا کہ جب وہ عربی الفاظ کے معنی نہیں جانتی ہیں تو پھر کیوں پڑھتی ہیں۔ تو ماں نے جواب دیا تھا کہ اللہ کا کلام پڑھنے سے ثواب ملتا ہے۔ جبکہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اسے'' پڑھو، سمجھو، غور وفکر کرو پھر عمل کرو۔ لیکن طوطے کی طرح آیات کو رٹ لینا اور مطلب نہ جاننا، کوئی ثواب نہیں بلکہ اگر غلط پڑھا جائے تو گناہ ہے۔ شاید وہاں خفیہ ایجنسیوں کے لوگ بھی رپورٹینگ کر رہے ہوں گے۔ اُنہوں نے مرکزی وزارت داخلہ کو خالد حسین کے خلاف رپورٹ بھیجی اور لکھا کہ متذکرہ تقریب میں خالد حسین نے بھارت سرکار کے خلاف زہر اُگلا اور اُگروادیوں کے حق میں بولا ہے۔ مرکزی وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری نے ایک خفیہ چِٹھی جموں وکشمیر کے چیف سیکرٹری اشوک جیٹلی صاحب کو لکھی اور چِٹھی کے ساتھ آئی، بی، پنجاب سے حاصل ہوئی رپورٹ کی کاپی بھی نتھی کر دی۔ چیف سیکرٹری صاحب نے صوبہ جموں کے ڈویژنل کمشنر بلدیو سنگھ جسوال کو انکوائری کرنے کے لئے کہا۔ دوسری طرف ریاستی خفیہ محکمہ سی، آئی، ڈی نے بھی اپنے طور پر انکوائری کرنی شروع کر دی۔ وہ خالد حسین کے سرکاری ڈرائیور پی، ایس، او، اور وائرلیس آپریٹر سے پوچھتے کہ اُن کا افسر

بار بار پنجاب کیا لینے جاتا ہے؟ وہاں وہ کس کس سے ملتا ہے؟ اُس کا تعلق کس دہشت گرد تنظیم سے ہے؟ وہ سرکاری کار کی تلاشی لیتے۔ وائرلیس سیٹ کو نکال کر اُسے چیک کرتے۔ کبھی ڈِکی کھول کر دیکھتے۔ ایک دِن خالد حسین کا ڈرائیور اُنھیں کہنے لگا کہ وہ سی، آئی، ڈی کے اعلیٰ افسران سے کیوں نہیں بات کرتے پولیس کے اہلکار اُنھیں بار بار تنگ کرتے ہیں۔ تو خالد صاحب کا جواب ہوتا کہ اُن سے جو پوچھا جائے۔ اُس کا وہ صحیح صحیح جواب دیں۔ سچ کہنے میں کیسا ڈر۔ صرف اِس بات کا دھیان رہے کہ وہ کسی کو اس بارے کچھ نہ بتائیں۔ وہ لوگ اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ اُنہیں کرنے دیں۔ وہ لوگ تیل دیکھیں اور تیل کی دھار دیکھیں۔ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے دیں۔ ورنہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے کی بدنامی ہوگی۔ خالد حسین نے کہا کہ جب وہ اُنھیں بُلائیں گے تو وہ خود اُنھیں جواب دیں گے۔ پھر ایک دِن ڈویژنل کمشنر جموں بلدیو سنگھ جسوال صاحب نے خالد حسین کو اپنے دفتر میں بُلایا اور اُن کے سامنے مرکزی وزارت داخلہ کی رپورٹ اور چیف سیکرٹری صاحب کی چٹھی رکھ دی اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا اُس نے مالیر کوٹلہ میں بھارت سرکار کے خلاف کوئی تقریر کی ہے؟ جب خالد حسین نے انکار کیا اور کہا کہ یہ سب بکواس ہے تو جسوال صاحب نے ثبوت مانگا۔ خالد حسین نے ڈویژنل کمشنر کے ٹیلی فون سے ہی اُس پروگرام کے منتظمین سے مالیر کوٹلہ بات کی اور ساری بات بتائی اور کہا کہ اگر پروگرام کی آڈیو یا ویڈیو ریکارڈنگ کی سی، ڈی کل صبح تک اُنھیں بھیج دی جائے تو مہربانی ہوگی۔ دوسرے دِن صبح مالیر کوٹلہ سے ویڈیو کیسٹ آ گئی جسے لے کر خالد حسین ڈویژنل کمشنر جموں کے دفتر پہنچے اور کیسٹ اُن کے حوالے کی۔ جو کیسٹ پلییر پر چلائی گئی۔ جسوال صاحب نے پوری کیسٹ دیکھی۔ خالد حسین کی تقریر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں تھا۔ جو بھارت سرکار کے خلاف اور اُگروادیوں کے حق میں کہا گیا ہو۔ جسوال صاحب بہت خوش ہوئے۔ وہ خالد حسین کے بے تکلیف

دیرینہ دوست تھے۔ دونوں نے مرزا محمد افضل بیگ صاحب کے ساتھ اکٹھے کام کیا تھا۔ اُنھیں شک تھا کہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر خالد حسین نے کچھ اُلٹا سیدھا نہ کہہ دیا ہو، جس کی وجہ سے وہ بھی فکر مند تھے۔ جسوال صاحب اُسی وقت اپنی کُرسی سے اُٹھے۔ کیسٹ کوٹ کی جیب میں ڈالی اور چیف سیکرٹری صاحب کے دفتر چلے گئے جہاں ڈائریکٹر جنرل پولیس ڈاکٹر گوبچن جگت بھی بیٹھے تھے۔ سب نے اکٹھے بیٹھ کر وہ کیسٹ دیکھی اور خوش ہوئے۔ جٹیلی صاحب نے ویڈیو کیسٹ کی کاپی اپنی چٹھی کے ساتھ مرکزی داخلہ سیکرٹری کو بھیجی اور خالد حسین کے بارے میں تعریفی کلمات بھی لکھے۔ .... ایک دِن خالد حسین کو چیف سیکرٹری صاحب نے اپنے دفتر میں بُلایا اور اُن کے کام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ پونچھ جانے کے لئے تیار رہے کہ کیونکہ پونچھ ضلع میں اُنھیں اُس جیسے تجربہ کار ڈپٹی کمشنر کی ضرورت ہے۔ نفرت، چغل خوری اور ذاتی عناد کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد حسین ضلع پونچھ کا ڈپٹی کمشنر بن گیا۔

1990ء میں جب خالد حسین اے، سی، ڈی پونچھ تھے تو ایک سابقہ ممبر اسمبلی اور ماہر دل بدلو (نیشنل کانفرنس جمع کانگرس جمع بھارتیہ جنتا پارٹی جمع پی ڈی پی برابر ہے۔ ایم، ایل، سی اور وائس چیئرمین گوجر بکروال ترقیاتی بورڈ) اپنے کچھ حواریوں کو ساتھ لے کر خالد حسین کے دفتر میں آدھمکا اور کہنے لگا کہ میرے اِن پانچ ورکروں کو بھی پنچایت کے ترقیاتی کام دیئے جائیں جبکہ اُس کی سفارشی چٹھیوں پر اُس کے ساٹھ سے زیادہ ورکروں کو مختلف پنچایتوں میں ترقیاتی کام دیئے جاچکے تھے۔ خالد حسین نے اُس کے مزید ورکروں کو کام دینے سے صاف انکار کر دیا اور بدتمیزی کرنے پر اُنھیں دفتر سے باہر جانے کے لئے کہہ دیا، خالد حسین کے رویے کو سابقہ ممبر اسمبلی نے اپنی ہتک سمجھا اور ایک وفد لیکر گورنر گریش چندر سکسینہ صاحب کو ملا اور خالد حسین کے خلاف الزام لگایا کہ وہ دہشت گردوں کا سرپرست

ہے اور پاکستان سے آنے والے ہتھیار اور گولہ بارود اپنی سرکاری جیپ میں اُگروادیوں تک پہنچاتا ہے۔ نیز اُس کا بیٹا ملی ٹینٹ ہے اور اُسکے پاس پونچھ میں رہ رہا ہے۔ گورنر صاحب نے شکایت نامہ اپنے مشیر اور صلاح کار وید پرکاش جی کو انکوائری کیلئے بھیج دیا اور لکھا کہ "یہ ایک سنجیدہ الزام ہے اس کی فوراً انکوائری کرائی جائے۔ تفتیش مکمل ہونے تک خالد حسین کو معطل کر کے سیکرٹریٹ میں اٹیچ کر دیا جائے۔ اُس وقت محکمہ زراعت اور دیہی ترقی کے کمشنر وجے بقایا (آئی، اے، ایس) تھے۔ اُنہوں نے خالد حسین کو شکایت بارے بتایا اور اپنے دفتر میں طلب کیا۔ خالد حسین نے وہ سارے سفارشی رقعے ساتھ لئے اور بقایا صاحب کے دفتر میں پیش ہو گیا۔ کمشنر صاحب نے وہ شکایتی درخواست خالد حسین کے سامنے رکھ دی جس پر گورنر صاحب اور اُن کے مشیر نے کاروائی کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب وجے بقایا صاحب نے اصل معاملہ جاننا چاہا تو خالد حسین نے سارا قصہ بیان کیا اور ثبوت کے طور پر وہ ساری پرچیاں سامنے رکھ دیں جن میں سابقہ ممبر اسمبلی نے اپنے منظور نظر ورکروں کو پنچایت کے ترقیاتی کام دینے کے لئے کہا تھا۔ جب خالد حسین اپنے کمشنر موصوف کو شکایت کنندہ کی دیگر کرتوتیں سُنا رہا تھا تو اُسی وقت پونچھ اور راجوری کے سپیشل کمشنر ڈاکٹر سُدھیر سنگھ بلوریہ اور ضلع ترقیاتی کمشنر پی، دھر چکرورتی بھی بقایا صاحب کے کمرے میں وارد ہوئے۔ جب انھیں ساری بات بتائی گئی تو دونوں نے خالد حسین کے حق میں چٹھیاں لکھیں اور بتایا کہ کس طرح سابقہ ممبر اسمبلی تمام ضلع افسروں کو بلیک میل کرتا ہے۔ اُنہوں نے خالد حسین کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا کھُل کر ذکر کیا کہ کس طرح اُس نے نوجوان لڑکوں کو دہشت گردی سے دور رکھنے کے لئے پونچھ میلہ 1990 کروانے میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ کُل ہند مشاعرے کروائے۔ گیت سنگیت کی محفلیں سجائیں۔ وڈالی بھائیوں اور قوالن چنچل بھارتی کو پونچھ جیسے دور دراز اور پسماندہ ضلع میں پہلی بار بلایا اور اُن

کے گیت سنگیت کے پروگرام کرائے۔ اُنہوں نے شکایت کو ذاتی عناد، من گھڑت، جھوٹ اور انتقامی لکھا۔ اِن دونوں چٹھیوں کا حوالہ دیتے ہوئے وجے بقایا صاحب نے فائل پر نوٹ لکھا اور گورنر کے مشیر وید پرکاش صاحب کو بھیج دیا۔ وید پرکاش صاحب نے بھی اپنی رائے لکھ کر مسل گورنر گریش سکسینہ صاحب کو بھیج دی۔ گورنر صاحب نے مسل پڑھنے کے بعد فائل بند کرنے کا حکم دیا اور یوں یہ قصہ ختم ہو گیا۔

اسی طرح جب خالد حسین جنوری 1993ء میں راجوری کے اے، سی، ڈی تھے تو ایک بد بخت حرامی نے درہال بلاک کے بی، ڈی، او ریاض زرگر کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر بلاک کے دو کاموں کا ورک آرڈ حاصل کر لیا تھا۔ نہ تو کام مکمل ہوا تھا اور نہ ورک آڈر کے مطابق کام ہو رہا تھا بلکہ سریا اور سیمنٹ بھی بیچ دیا گیا تھا، اور پھر ایک دِن وہ غنڈہ بلاک افسر کے گھر گھس کر پستول کی نوک پر اُس سے اُن کاموں کی رقم مانگنے لگا اور چیک دستخط کرنے کیلئے ڈرانے دھمکنے لگا۔ ریاض زرگر ایک شریف اور فقیرانہ طبیعت کا افسر تھا اُس نے چیک پر تو دستخط کر دیئے لیکن اُس نے وائرلیس کے ذریعہ ساری روداد خالد حسین کو بتا دی اور خود بھی دوسری صبح اُن کے سرکاری کوارٹر پر حاضر ہو کر رونے لگا خالد صاحب نے بنک منیجر کو چیک ردّ کرنے کے لئے کہا اور ریاض زرگر کو لیکر ڈی، سی، پرمود جین (آئی، اے، ایس) اور ایس، ایس، پی، فاروق احمد سے ملا اور بتایا کہ کس طرح ایک نامی غنڈے نے پستول کی نوک پر بی، ڈی، او سے چیک پر دستخط کرائے ہیں۔ چیک کینسل ہو گیا۔ اُس غنڈے کو رقم نہیں ملی بلکہ اُس کے خلاف ایف، آئی، آر درج ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد وہ ریاض زرگر اور خالد حسین کا جانی دشمن بن گیا اور خفیہ اداروں میں دونوں کے خلاف شکایتیں کرنے لگا کیونکہ وہ فوج کا مخبر تھا اور اُس نے کئی افسروں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ اُس کی غنڈہ گردی سے عام لوگ بھی تنگ تھے لیکن ڈر کے مارے بولنے سے کتراتے تھے۔

یوں سمجھیں کہ وہ درہال بلاک کا اکھنوانی تھا۔ اُس نے خالد اور ریاض زرگر کے خلاف فوج کی خفیہ ایجنسی کو لکھتی شکایت کی کہ یہ دونوں افسر پاکستان نواز ہیں اور معصوم بچوں کو ورغلا کر دہشت گردی کی تربیت کیلئے سرحد پار بھیجتے ہیں۔ ریاست میں کام کرنے والے سبھی خفیہ ادارے حرکت میں آگئے اور چھان بین کرنے لگے۔ اسی دوران خالد حسین اور ریاض زرگر کا تبادلہ ضلع ڈوڈہ میں دوبارہ ہوگیا۔ تفتیش کا سلسلہ وہاں بھی چلتا رہا کیونکہ درہال کے فوجی مخبر کا ایک نزدیکی رشتے دار ڈوڈہ میں رہتا تھا اور وہ بھی بلاک افسر تھا اور اُس نے آرمی کے افسران کے ساتھ گہرے تعلقات بنالیے تھے۔ ایک دن ریاض زرگر کو، جو اُس وقت گھٹ بلاک کا بی، ڈی، او تھا فوجی بریگیڈیر نے آرمی کیمپ میں بُلایا اور اُسے دھمکی دی کہ جلد اُسے اور خالد حسین کو گرفتار کرلیا جائے گا کیونکہ وہ معصوم لڑکوں کو ورغلا کر پاکستانی مقبوضہ کشمیر ٹریننگ کے لئے بھیجتے ہیں۔ تین چار گھنٹے اُسے حراساں کیا گیا۔ آرمی کیمپ سے ریاض زرگر سیدھا خالد حسین کے پاس آیا۔ وہ گبھرایا ہوا تھا اور آتے ہی رونے لگا اور کہنے لگا کہ بریگیڈیر جیسوال نے اُسے گرفتار کرنے اور جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ خالد حسین اُسے لیکر ڈپٹی کمشنر عبدالرشید پرے سے مِلا، جس نے بریگیڈیر کو خط لکھا کہ اُس نے کس حیثیت اور کس کی اجازت سے ریاض بی، ڈی او کو بلایا اور ضلع انتظامیہ کو اس کی اطلاع تک نہ دی۔ ڈی، سی، صاحب کی چٹھی لیکر خالد حسین خود برگیڈیر سے ملا اور اُسے سمجھایا کہ یہ سب ذاتی عناد کی وجہ سے ہے۔ ورنہ شکایت میں کوئی سچائی نہیں ہے، لیکن بریگیڈیر جیسوال کا اصرار تھا کہ اُن دونوں نے لڑکوں کو ٹریننگ کے لئے پونچھ کے راستے سرحد پار بھیجا ہے۔ جب خالد حسین نے ثبوت کے لئے پوچھا تو آرمی افسر کہنے لگا کہ اُنہوں نے بانہال میں چار لڑکے پکڑے ہیں جو پاکستان سے تربیت حاصل کر کے آئے ہیں اور انٹیروگیشن میں اُنہو ںنے آپ دونوں کا نام لیا ہے۔ جب خالد حسین نے اُن لڑکوں کو روبرو لانے کے لئے کہا

تو اُس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا اور وہ اناپ شناپ بولنے لگا اور اپنی وردی کا رُعب دِکھانے لگا۔ خالد حسین نے اُسے بے باکی سے تبایا کہ یہ سارا معاملہ وہ ریاست کے چیف سیکریٹری کے نوٹس میں لائیں گے اُن سے گذارش کی جائے گی کہ کورکمانڈر سے التماس کی جائے کہ وہ اس سارے معاملے کی غیر جانبدارانہ انکوائری کرائیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے چیف سیکرٹری صاحب کو اس سلسلہ میں ایک مفصل چٹھی لکھی اور پھر ایک آدھ مہینے کے بعد بریگیڈئر جیسوال کی تبدیلی کسی اور جگہ کردی گئی۔

پونچھ میں ہی جب خالد حسین ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے تو ریاستی سرکار کی طرف سے ''رہبر تعلیم'' نام کی ایک سکیم لاگو کی گئی۔ ملی ٹینسی کی وجہ سے دُور دراز اور پہاڑی علاقوں کے اسکول کئی سالوں سے بند پڑے تھے کیونکہ دہشت گرد کارروائیوں کی وجہ سے ملی ٹینٹوں اور سیکورٹی دستوں اور فوج کے جوانوں کے درمیان مقابلہ آرائی معمول کی بات تھی۔ پہاڑوں پر جنگجوؤں کا بسیرا تھا اور وہ فوجی کیمپوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے عام لوگوں کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اساتذہ ڈر کے مارے سکول نہیں جاتے تھے اور سکولوں کو تالے لگے تھے۔ چنانچہ سرکار کی ہدایت کے مطابق جو سکول بند پڑا تھا، وہاں اُسی گاؤں کے پڑھے لکھے نوجوان کو ٹیچر لگایا جانا تھا تاکہ بچے تعلیم حاصل کرسکیں۔ خالد حسین ریاستی سرکار کی گائڈ لائن کے مطابق امیدواروں کا انتخاب کررہا تھا اور قابلیت کے حساب سے ٹیچروں کی لسٹ بنارہا تھا۔ ایک بار سورن کوٹ کے ایم، ایل، اے اور وزیر مملکت مشتاق بخاری صاحب نے خالد حسین سے کہا کہ ان کی ایک رشتے دار لڑکی کو مڑھا سکول میں ٹیچر لگایا جائے۔ خالد حسین نے صاف جواب دے دیا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ آپ کی رشتے دار سورن کوٹ میں رہتی ہے جبکہ سکول مڑھا میں بند پڑا ہے۔ نیز گائڈ لائن کے مطابق اُسی گاؤں کا تعلیم یافتہ اُمیدوار لگے گا۔ اس انکار سے پہلے بھی ایک واقعہ ہو گذرا

تھا جو ایم، ایل، اے صاحب کے چچا زاد بھائی اور سورن کوٹ کے بلاک میڈیکل افسر ڈاکٹر ممتاز بخاری سے متعلق تھا۔ اُس نے بغیر اختیارات کے 45 ناجائز تقرریاں کی تھیں۔ جن میں اپنی بیوی کو بھی مِڈ وائف کی آسامی پر لگایا تھا۔ جب یہ اطلاع خالد حسین کو ملی تو اُنھوں نے بلاک میڈیکل افسر کے دفتر کا سارا ریکارڈ ضبط کرلیا تھا۔ اور اُس کے خلاف کیس تیار کر کے خود ویجی لینس کمشنر راجندر ٹِکو سے ملے تھے اور اُنھیں سارے ثبوت حوالے کئے تھے جس کی وجہ سے ممتاز بخاری کے خلاف انکوائری شروع ہوگئی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر وزیر مملکت خالد حسین سے دُکھی تھے اور اُنھوں نے اُن کے خلاف ویجی لینس کمشنر کو درخواست دی اور لکھا کہ رہبرِ تعلیم کے تحت جو استاد لگائے گئے ہیں۔ اُس میں خالد حسین نے فی اُمیدوار بیس ہزار روپئے رشوت لی ہے۔ دوسرا الزام یہ لگایا کہ انہوں نے ملی ٹینٹوں کو بندوق کے لائسنس جاری کئے ہیں جس کے لئے کرائم برانچ نے انکوائری شروع کردی۔ اپنے دو ورکروں کے ذریعے ہائی کورٹ میں خالد حسین کے خلاف رشوت لینے اور اساتذہ کو بھرتی کرنے میں بے ضابطگیوں کے الزام میں مقدمہ شروع کروا دیا یعنی ایک غلط کام نہ کرنے کا خمیازہ تین تین جگہ بھگتنا پڑا۔ ایسی ہی درخواستیں ڈائریکٹر جنرل پولیس گوربچن جگت اور چیف سکریٹری صاحب کو بھی بھیجی گئیں۔ ملی ٹینٹوں کا حمایتی اور اُنھیں گن لائسنس جاری کرنے کے الزامات بڑے تشویش ناک تھے۔ گوربچن جگت جی نے ہریانہ سے پولیس کی ایک خصوصی ٹیم منگوائی اور اس سارے معاملے کی خفیہ تفتیش کرائی۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد وہ ٹیم واپس چلی گئی۔ لیکن ایس، ایس، پی پنچ سکسینہ اور ڈی، ایس، پی ہیڈکوارٹر جناب سردار خان نے خالد حسین کو بتایا کہ ہریانہ سے ایک پولیس ٹیم آئی تھی جو اُن کے بارے میں انکوائری کر رہی تھی اور وہ ٹیم مطمئن ہوکر گئی ہے۔ ہائی کورٹ نے بھی کیس خارج کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اُمیدواروں کو منتخب کرنے میں شفافیت سے کام

لیا گیا ہے۔ دس پندرہ دِنوں کے بعد چیف سیکریٹری صاحب نے خالد حسین کو بُلایا اور اُن کے کام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی الزام تراشیاں ملازموں پر لگتی رہتی ہیں لیکن ایمان داری اور ضابطے کے مطابق اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے والوں کو صرف اپنے مالک سے ڈرنا چاہیے۔ ڈاکٹر گوربچن جگت جی نے بھی اُن کے کام کو سراہا۔

2005 میں جب خالد حسین پاکستانی انتظام والے کشمیر کا دورہ کر کے واپس آئے تو سری نگر کے وائی اڈے پر سابقہ آئی، اے، ایس افسر گوہر احمد نے اُن سے پوچھا کہ وہ اب کب جینوا اور ویانا جا رہے ہیں۔ خالد حسین نے جواباً کہا کہ اُنہیں وہاں کون لے جائے گا تو گوہر احمد نے کہا آئی، بی والے۔ کیونکہ وہ اُن کا ایجنٹ ہے۔ جب خالد حسین نے کہا کہ گوہر صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو اُنہوں نے بڑے طنزیہ اور غُصیلے انداز میں بات کرتے ہوئے کہا کہ انھیں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کیونکہ آزاد کشمیر میں دیئے گئے اُن کے بیانات ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ اس سب کے باوجود خالد حسین نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ کبھی کسی کے لئے دل میں کوئی رنجش نہیں رکھی۔ جب میرے سالے کوشل کمار شرما کا انٹرویو (Viva) تھا تو میں اُن کے پاس گیا تا کہ وہ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین سید اختر مرتضیٰ صاحب سے کوشل کی سفارش کریں کیونکہ اختر صاحب اور خالد حسین میں دوستانہ تعلق تھا۔ اس طرح خالد حسین کے ریڈر گھنشام سنگھ نے بھی کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان پاس کیا تھا لیکن اُسے خدشہ تھا کہ Viva میں اُسے فیل نہ کر دیں۔ اس لئے خالد حسین نے اُس کی بھی سفارش کی۔ پبلک سروس کمیشن کے دوسرے ممبر سرن سنگھ خالد حسین کے ادیب دوست تھے۔ خالد صاحب گھنشام کو لیکر دونوں کے پاس گئے۔ خدا کی مرضی اور اُن کا مقدر کہ دونوں منتخب ہو گئے۔ کوشل کے پی، ایس میں اور گھنشام کے، اے، ایس میں آ گیا۔ گھنشام سنگھ دو بار پہلے Viva میں فیل ہو چکا تھا۔ سید اختر مرتضیٰ صاحب دِلدار انسان تھے

اور یاروں کے یار۔ وہ آج اس دُنیا میں نہیں ہیں لیکن اُن کے لگائے ہوئے دونوں پودے آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ خالد حسین نے کبھی دھرم رنگ، نسل، ذات برادری یا زبان کی وجہ سے کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی ہمیشہ غریبوں کی مدد کی۔ کیونکہ انہوں نے خود غربت دیکھی تھی۔ پرماتما اُنہیں شانتی دے۔

مخالفت سے میری شخصیت سنورتی ہے
میں دُشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں
(بشیر بدرؔ)

خودفریبی سی خودفریبی ہے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اُس کا دشمن آسماں کیوں ہو
(غالبؔ)

خالد حسین جوانی میں قدرے جذباتی اور غُصیلی طبیعت رکھتا تھا۔ وہ نہ تو غلط بات کرتا اور نہ ہی سُنتا تھا۔ جوانی کے اُن ہی جوشیلے دِنوں میں جب 1965ء کی بھارت پاک جنگ عروج پر تھی تو ہندو کٹر پنتھی لیڈر بھارتی مسلمانوں کو دھمکیاں دے رہے تھے۔ جن سنگھ (بھارتیہ جنتا پارٹی) اور اُس کے نظریاتی گورو راشٹریہ سیوک سنگھ کے لوگ مسلمانوں کو پاکستانی، غدار، اور بھارت وِرودھی کہتے تھے (بالکل آج کی طرح) یہ بات مسلمانوں کو کانٹوں کی طرح چبھتی تھی لیکن اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ڈرے سہمے رہتے اور اکثریت کی نفرت، الزام تراشیوں اور طنزیہ باتوں کا جواب نہیں دیتے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو بھارتی اخباریں، پاکستان کی ہار، اُس کی فوجوں کو خاک چٹانے اور سبق سکھانے والی خبروں سے بھری ہوتیں جبکہ حقیقت شادیانے بجانے والی نہیں تھی۔ 1965ء کی جنگ فیصلہ کُن نہیں تھی۔ ہندوستانی فوج کے اُس وقت کے سربراہ جنرل جے، این چوہدری کے بقول یہ لڑائی ماسوائے گولہ بارود ضائع کرنے کے علاوہ بے نتیجہ رہی تھی۔ دونوں ملکوں نے جیتے ہوئے علاقے اور جنگی قیدی واپس کردیئے تھے۔ اپنی کتاب "The brave deeds of Indian Jawans." میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ دونوں فوجیں انگریزی کی

تربیت یافتہ تھیں۔لہٰذا ایک دوسرے کے داؤ پیچ سے واقف تھیں۔جنگی چالوں میں ماہر تھیں۔بھارتی فوجیں سیالکوٹ لاہور، نارووال اور شکر گڈھ کے اندر گھس گئی تھیں اور تقریباً پانچ سو گاؤں پر قبضہ کر لیا تھا۔لاہور میں تو اچھوگل نہر تک بھارتی فوجیں پہنچ گئی تھیں۔ساتھ میں جموں وکشمیر میں حاجی پیر کی پہاڑی پر بھی قابض ہوگئی تھیں جبکہ پاکستانی فوج چھمب جوڑیاں پر قبضہ کر کے اکھنور پُل سے صرف پانچ کلومیٹر دور تھی۔واہگہ، کھیم کرن اور فاضلکا کے کچھ گاؤں پر قبضہ کرنے کے بعد پاکستانی فوج راجستھان کے باڑمیر، جیسلمیر کے تقریباً ہزار مربع کلومیٹر کے ریگستانی علاقہ پر قابض ہوگئی تھی۔گو کہ فوجی اعتبار سے یہ علاقہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن تاشقند معاہدہ ہوتے ہی دونوں ملک اپنی اپنی سرحد کے اندر آگئے تھے۔اس کے باوجود ہماری اخباریں شہ سُرخیاں لگا رہی تھیں۔حقیقت بیان کرنے کے لئے خالد حسین نے ایک مضمون لکھا جو دہلی اور جالندھر سے شائع ہونے والے اُردو اور ہندی اخبار ''پرتاپ'' میں چھپا۔جس میں بین الاقوامی فوجی ماہرین کے اعداد وشمار دیئے گئے تھے جو اُنہوں نے ہند۔پاک جنگ کے حوالے سے شائع کئے تھے۔پھر 1972ء کے اختتام پر راشٹریہ سیوک سنگھ کے پردھان گورو گولوالکر جی سری نگر آئے اور شیتل ناتھ مندر میں ہندو بھگتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارت صرف ہندوؤں کا دیش ہے۔مسلمان بھارت سے نکل جائیں اور پاکستان چلے جائیں یا عرب ملکوں میں ورنہ اُنھیں عرب مہاساگر میں پھینک دیا جائے گا۔وہ بیان دے کر ناگپور چلے گئے لیکن کشمیر میں بوال کھڑا ہوگیا۔ہڑتال کی کال دی گئی۔دُکانیں بند ٹرانسپورٹ بند اور جلسے جلوس شروع ہوگئے۔نعرے لگنے لگے ''انڈین ڈاگز گو بیک'' بہت دِنوں تک کشمیر کی مذہبی اور سیاسی ہانڈی اُبلتی رہی۔بڑی مشکل سے ریاستی سرکار نے حالات پر قابو پایا۔مسلمانوں کو پاکستان بھیجنے یا بحرۂ عرب میں پھینکنے کے بیانات جن سنگھ اور آر، ایس، ایس کے کئی دیگر

لیڈران بھی وقتاً فوقتاً دیتے رہے۔ ان بیانات سے دُکھی ہو کر خالد حسین نے ایک آرٹیکل لکھا، عنوان تھا، ''ہندوستانی مسلمان ایک سوال ایک جواب'' یہ آرٹیکل سب سے پہلے روز نامہ ''ملاپ'' جالندھر کے دسمبر 1972ء کے شمارے میں چھپا تھا اور پھر یہی مضمون مولوی عباس انصاری صاحب نے 1973ء میں اپنے ماہنامہ ''سفینہ'' میں چھاپا تھا۔ اس مضمون میں خالد حسین نے سندھو تہذیب سے متعلق تاریخی حوالہ جات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کئی قوموں، نسلوں اور مذہبی عقیدوں کے ماننے والوں کا ملک ہے۔ ہم سب کا نسلی تعلق مقامی آریائی اور درد گروپ سے ہے۔ اس سے پہلے شمالی ہندوستان میں دراوڑ نسلی گروپ رہتا تھا یہاں، ہندو، جین، بدھ پھر ہندو مسلمان اور عیسائی مذاہب کا غلبہ رہا۔ بدھ مت یا گندھارا تہذیب وتمدن نے تو اڑھائی ہزار سال تک ہندوستان کو اپنے زیر اثر رکھا۔ نالندہ اور ٹیکشلا کے آثار اس بات کا ثبوت ہیں۔ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، افغانستان، انڈونیشا، چین، منگولیا اور وسط ایشیاء کے مما لک میں گندھارا تمدن ہر جگہ آج بھی موجود ہے۔

گندھارا تہذیب سے پہلے مہر گڑھ (9 ہزار سال پرُانی تہذیب، پاکستان) بنّی (7 ہزار پرانی تہذیب پاکستان) موہن جو دوڑو (5 ہزار سال پرُانی تہذیب، پاکستان) ہڑپہ، (5 ہزار سال پرُانی تہذیب، پاکستان) راکھی گڈھ (5 ہزار سال پرُانی تہذیب، ہریانہ) بھارت کے آثار دیکھ کر پتہ چلتا ہیکہ آریہ لوگ یا تو ہجرت کر کے سندھو گھاٹی میں آئے یا یہیں کے ہی مقامی لوگ تھے۔ بال گنگا دھر تلک نے اپنی کتاب ArcticHome in the vedas جو 1903ء میں چھپی، میں لکھا ہے کہ آریہ نارتھ پول سے ہجرت کر کے سنٹرل اشیا سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ یہی تھیوری گورو گولوالکر کی بھی ہے جو اُنہوں نے اپنی کتاب we or our nation hood میں لکھی ہے۔ جو 1939ء میں چھپی اور وہ

بھی مانتے ہیں کہ آریہ لوگوں نے ہجرت کی اور ہندوستان میں آباد ہوئے۔ لیکن جو انسانی پنجر (کنکال) راکھی گڈھ اور مہر گڈھ میں برآمد ہوئے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پنجر مقامی لوگوں کے ہیں۔ اصل باشندے شکار کر کے اپنا جیون گذارتے تھے جن کو شمالی ہندوستان سے کھڈیر کر جنوب کی طرف دھکیل دیا گیا۔ خاص کر انڈومان اور نکوبار میں جہاں آج بھی یہ لوگ آباد ہیں۔ ہڑپن تہذیب کے لوگ جنوب میں آباد ہیں۔ اگر یہ تھیوری مان لی جائے تو پھر ہم سب کو شمالی ہندوستان کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اسلام کی عمر تو محض 15 سو سال کی ہے۔ جبکہ کشمیر میں اسلام نے سب سے آخر میں یعنی چودھویں صدی عیسوی میں دستک دی اور وہاں کی 95 فید مقامی آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان تاجر (عرب) کیرالا کی موپلا بندرگاہ پر ساتویں صدی عیسوی میں اُترے۔ محمد بن قاسم عرب حملہ آور 712 عیسوی میں سندھ کے ساحل پر اُترا اور سندھ اور ملتان پر قبضہ کیا۔ پھر مسلمان صوفی دسویں اور گیارہویں صدی میں آئے۔ اگر تلک اور گولوالکر صاحب کی تھیوری کو مان لیا جائے تو پھر ہندوؤں کو بھی بھارت چھوڑ کر اپنے ہزاروں سال پرانے علاقوں میں واپس چلے جانا چاہئے اور یہاں کے اصل باشندوں یعنی دراوڑوں کو پاکستان سمیت پورا شمالی ہندوستان دے دینا چاہیئے۔ اِس لئے ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ، ہندو، مسلمان، سکھ یا عیسائی اور بُدھ بننے سے نسل نہیں بدلتی۔ ساجھا ورثہ، زبان اور رہن سہن نہیں بدلتا۔ آپ برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ڈی، این، اے ٹسٹ کرائیں تو سب کا خُون ایک ہی نسل ہونے کو ثابت کرے گا۔ اس لئے برصغیر کے مسلمانوں کو بھی آریہ ورت کے پریوار کا اٹوٹ انگ مان لینا چاہیئے۔ رہی بات پاکستان بننے کی یا بنانے کی تو اس کے لئے سبھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی، غربت اور جہالت بھی دیش کی تقسیم کے لئے ایک وجہ تھی۔ برصغیر ہند کی تقسیم کے لئے جہاں

قائداعظم محمد علی جناح کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے وہاں پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کا رول بھی مثبت نہیں رہا، اور یہ سب تقسیم کے فارمولے کو حتمی شکل دینے میں شریک تھے۔ مان لیں کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر محمد علی جناح نے دیش کی تقسیم کرائی لیکن دیش کو آزادی دِلانے والے مہاتما گاندھی تو آخری دم تک تقسیم کے خلاف تھے اور وہ نتھو رام گوڈسے کے فلسفے کو یکسر رد کرتے ہوئے ہندو اور مسلمانوں کو بھائیوں کی طرح رہنے کے لئے کہتے رہے لیکن ہندو مسلم بھائی چارہ کا نعرہ ہی اُن کی شہادت کا کارن بنا۔ پھر اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے نام پر بننے والا پاکستان 25 سال کے اندر ہی دو پھاڑ کیوں ہوگیا اور برصغیر کا یہ دوسرا بٹوارہ کس نے کرایا اور کیوں کرایا۔ اور تیسرا ملک کیسے وجود میں آیا۔ اصل میں دھرم کبھی بھی انسانوں کو جوڑنے کا کام نہیں کرتا۔ بلکہ زبان کلچر، نسل اور تہذیب وہ مضبوط اکائیاں ہیں جو دُنیا کے ممالک میں انسانوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ ایران، افغانستان، عراق، سعودی عرب، سنٹرل ایشیا کے مسلم ممالک سب کی اپنی اپنی زبانیں ہیں۔ اپنا کلچر ہے۔ اپنی اپنی خوراک ہے، رہن سہن ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے علاوہ بُدھ، جین، عیسائی، سکھ اور پارسی وغیرہ کا اپنا اپنا کلچر ہے۔ کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مادری زبان ایک ہے۔ اسی طرح یوپی، پنجاب، ہریانہ، راجستھان، بہار، گجرات یعنی سبھی ریاستوں میں رہنے والے ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں،، بودھوں اور سکھوں وغیرہ کی اپنی اپنی مادری زبانیں ہیں ماسوائے دھرم کے باقی اُن میں کچھ بھی الگ نہیں ہے۔ للہٰذا مذہب کے نام پر نفرت پھیلانا چھوڑ دیں۔ ہمارا ملک خوبصورت پھولوں کا ایک باغ ہے۔ اس کو اُجاڑنے کی بجائے مزید خوبصورت بنایا جائے۔ سیاست کے لئے مذہب کو استعمال نہ کیا جائے۔ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ مذہبی منافرت تباہی لائے گی۔ انارکی پھیلائے گی۔ جس کا فائدہ دشمن دیشوں کو ہوگا۔ اس لئے سیاسی، سماجی، مذہبی لیڈروں،

مولوئیوں، پجاریوں اور سوامیوں کو نفرت پھیلانے والی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ خالد حسین کا مضمون جو ''سفینہ'' میں چھپا تھا۔ میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ میرا نام اشتیاق حسین کاظمی ہے لیکن ادبی حلقوں میں میری پہچان خورشید کاظمی کے نام سے ہے۔ میں انڈین فارسٹ سروس کا ریٹائر افسر ہوں۔ میری آخری پوسٹنگ چیف کنزویٹر آف فارسٹ جموں تھی۔ شعروشاعری کا شوق مجھے بچپن سے تھا کیونکہ میرے والد مرحوم سید فتح حسین شاہ کاظمی بھی شاعر تھے اور گھر کا ادبی ماحول مجھے بھی راس آ گیا تھا۔ چنانچہ میں بھی شعر کہنے لگا۔ میں جموں کی اردو ادبی تنظیم ''انجمن فروغ اُردو'' کا جنرل سیکریٹری بھی ہوں اور انجمن کی طرف سے ادبی پروگرام کروانے میں میرا اہم رول رہتا ہے۔ میں نے خالد حسین کی تقریباً سبھی اُردو اور پنجابی کہانیاں پڑھی ہیں اور میرا ماننا ہے کہ خالد حسین افسانوی ادب میں اپنی زبان بیان اور لہجے کی وجہ سے الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اُن کی کتابوں کو پڑھ کر میں نے اُن کے فن پر انگریزی اور اُردو میں مضامین بھی لکھے ہیں۔ خالد حسین کی کہانیاں کسی خاص فرقے یا طبقے کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ بلکہ مظلوم کی دادرسی کرتی ہیں اور ظالم کو ظلم کرنے سے روکنے کا کام کرتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں امن شانتی اور پیار محبت کی بات کرتے تھے لیکن جب نفرت کی آگ بھڑکانے والے کٹّر وادی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف زہر اُگلتے ہیں تو وہ دُکھی ہو جاتے تھے۔ خالد حسین ایک بار ایسے پروگرام میں مدعو تھے، جہاں جموں کو الگ ریاست بنانے کے بارے میں مقررین کو اپنی اپنی رائے رکھنی تھیں۔ جب خالد حسین کو بولنے کے لئے کہا گیا تو اُنھوں نے مذہبی بنیاد پر جموں وکشمیر کی تقسیم کی مخالفت کی اور کہا، ''پاکستان تو مذہب کی بنیاد پر بنا تھا لیکن کیا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سب ٹھیک ہے؟ کیا پاکستان مسلمانوں کی جنت بن گیا ہے؟ کیا وہاں مذہب مسلک، زبان اور علاقے کی وجہ سے فساد نہیں ہوتے؟ کیا وہاں قرآنی ہدایات کے مطابق لوگوں کو انصاف مل رہا ہے؟

شیعہ سنی، بریلوی، دیوبندی، سندھی، مہاجر، پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سرائیکی کے نام پر فساد نہیں ہوتے؟ ہر مسلک والا دوسرے کو کافر نہیں کہتا؟ کیا وہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق نظام چل رہا ہے؟ اسی طرح کیا دیگر مسلم ممالک میں بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کارِ سرکار چلتا ہے۔ نہیں، بالکل نہیں، کیوں کہ زبان اور کلچر انسانوں کو جوڑتا ہے۔ اس لئے ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے نام پر ریاست کے ٹکڑے نہیں ہونے چاہئیں۔ ہندوستان کے آئین میں اور ملک کے سیکولر ڈھانچے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہمارے مرکزی سیاست دانوں کا موقف ہے کہ ریاست جموں وکشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے تو اس اٹوٹ انگ کو توڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جو لوگ جموں کو زبان اور کلچر کے نام پر الگ صوبہ بنانا چاہتے ہیں اُن کو یہ بات پلے باندھ لینی چاہئے کہ جموں میں رام بن، ڈوڈہ اور کشتواڑ (چناب ویلی) اور پونچھ، راجوری (پیر پنچال ویلی) مسلم اکثریتی علاقے ہیں جہاں کا کلچر اور بولی الگ ہے۔ گوجر بکروال گوجری زبان بولتے ہیں۔ پونچھ اور راجوری کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی زبان بولی جاتی ہے جبکہ رام بن، ڈوڈہ اور کشتواڑ اور ریاسی کے پہاڑی علاقوں میں کشمیری اور سراجی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جو ہندو بھائی، اپنی اکثریت کے بل بوتے پر الگ ریاست چاہتے ہیں وہ دراصل ڈکسن پلان کی حمایت کرتے ہیں۔ جس کے مطابق دریائے چناب دونوں ملکوں کے درمیان قدرتی سرحد بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کا فائدہ جموں کے عوام کو نہیں بلکہ سیاسی طور پر پاکستان کو ہوگا۔ اِس لئے ریاست کو متحد رہنا چاہئے۔ ہر خطے کو اُس کی آبادی کے مطابق رقوم ملنی چاہئیں۔ تاکہ اقتصادی نابرابری کا سوال نہ اُٹھایا جاسکے جب کہ میری نظر میں ایسا بالکل نہیں ہے، کیونکہ مرکزی منصوبہ بندی کمیشن پیسے کی تقسیم برابری کی بنیاد پر کرتا ہے۔ ہاں! سیاسی نابرابری کے احساس پر سرکار کو توجہ دینی چاہئے۔ لیکن 2014ء کے بعد مرکزی حکومت میں جو تبدیلی آئی۔ اس نے تو یہ احساس ختم

کرنے کے لئے ضروری قدم اُٹھانے شروع کردیئے ہیں۔ اور بالآخر 5/اگست 2019 کو دفعہ 370 بھی ختم کردی گئی۔ اور 35۔ اے بھی اور جموں کشمیر کو ریاست کے بدلے مرکزی علاقہ بنادیا گیا ہے۔ اسی طرح لداخ کو بھی مرکزی علاقے میں تبدیل کردیا گیا ہے اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے جموں و کشمیر کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ لیکن بات پھر بھی نہ بنی۔ بے اطمینانی اور بداعتمادی اُسی طرح قائم ہے۔ کشمیریوں میں یہ گہرا تاثر پایا جاتا ہے کہ انھیں کبھی بھی اپنی پسند کی سرکار بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہاں کی حکومت اور وزیراعلیٰ ہمیشہ ''میڈاِن انڈیا'' ہی رہا۔ جبکہ جموں والوں میں یہ احساسِ کمتری ہے کہ 70 سالوں سے ریاست پر کشمیری سیاست دانوں کا غلبہ رہا ہے۔ یہی سوچ لداخ کی بھی تھی۔ خیر اب ہمیں اُمید کرنی چاہئے کہ مرکزی علاقے بنانے سے شاید سیاسی حالات میں بہتری آئے گی۔ جس کی اُمید بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر کے حالات تو جوں کے توں دِکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جموں میں مرکزی سرکار کے فیصلے کے خلاف منفی آوازیں اُبھر رہی ہیں، کیونکہ جو بھی باہر والا زمین جائیداد خریدے گا یا کاروبار کرے گا، یا کارخانے لگائے گا۔ وہ جموں، کٹھوعہ، سانبہ اور اُدھم پور کے علاوہ کہیں اور نہیں جائے گا۔ جبکہ مقامی لوگ بے روزگار اور بے گھری کا شکار ہوں گے۔ ایسا جموں کے بیشتر لیڈر کہہ رہے ہیں اور عوام میں بے چینی پھیلا رہے ہیں۔''

خالد حسین کے خیالات سے مجھ جیسے کئی بزرگ اور تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان بھی متفق تھے۔ جو لوگ پچھلی کئی دہائیوں سے جموں کو الگ ریاست بنانے کی تحریک چلا رہے تھے وہ یونین ٹیرٹری بنائے جانے کے فیصلے کے خلاف کھُل کر بیانات دے رہے تھے۔

خالد حسین کے مضامین اور افسانے ملک اور بیرونِ ملک چھپتے رہتے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا وہ ایک جانا پہچانا نام تھے۔ اُن کے ریڈیائی، اخباری اور ٹیلی ویژن انٹرویو ہندوستان اور پاکستان میں چھپتے اور نشر ہوتے رہتے تھے۔

گھریلو محاذ پر بھی خالد حسین نے کامیابی سے اپنی ذمے داریاں نبھائیں۔ بہن بھائیوں کی مدد کی۔ اُن کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ خُداوند برحق کی حمد وثنا سے لبریز گائتری منتر اور قرآن پاک کی سورۂ رحمن کو وہ انسانوں کے لئے پند ونصیحت کا خزانہ سمجھتے تھے۔ وید، پران، اُپنشد، سامی کتابیں، سنت، رِشی منیوں اور صوفیائے کرام کا کلام اُن کے لئے انسان کو انسان سے محبت کرنے کا پیغام تھا۔ کائنات اُن کا گھر تھا اور مخلوقِ خدا اُنکی ہم مذہب تھی۔ دھرم کو ذاتی اور سیاسی فوائد کے لئے استعمال کرنے کو وہ گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سامراجیت کی بربریت نے دُنیا کو ایک خاردارِ جنگل بنادیا ہے۔ خود پرستی منافرت، عداوت اور جنونی سیاست نے ہر طرف تباہی مچائی ہوئی ہے۔ بھگوان کے مندر اور خدا کے گھر خوف وہراس کے مرکز بن گئے ہیں۔ حیوانی اور جنونی نظریات کا اظہار کھلم کھلا ہو رہا ہے۔ نام نہاد جمہوریت کھوکھلا سیکولرازم اور کمزور قانون انسانی ذہن ودل کے لئے ناسور بن چکے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں آج کے عہد کا المیہ ملتا ہے۔ ملک کی تقسیم کے زخم ملتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان کی دائمی رنجش کی وجہ سے کشمیر میں پھیلی تباہی اور بدامنی کی داستانیں ملتی ہیں وہ کہتے تھے کہ زمین کبھی تقسیم نہیں ہوتی البتہ اس کو تقسیم کرنے والے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان میں امن اور دوستی کے خواہاں تھے۔ وہ طالبانی نظریاتی اسلام اور بجرنگی اور ترشولی دھرم کی بجائے سنتوں اور بھگتوں کا ہندو دھرم چاہتے تھے۔ صوفیوں اور درویشوں کا اسلام چاہتے تھے۔ خداوند کریم اُن کی روح کو سکون بخشے۔

باغباں تُو نے اگر اپنی روش نہ چھوڑی
خوش نما پھولوں کا گلدستہ بکھر جائے گا

صدق، صبُوری، کلمہ پاک

گئے دِنوں کا سراغ لے کر کِدھر سے آیا کِدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کرگیا وہ
(ناصر کاظمی)

1978ء بیچ کا سب سے کم عمر انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا افسر محمد اقبال کھانڈے تھا۔ وہ شکل اور عقل میں بے مثال تھا۔ اُس کا من میٹھے پانی کا چشمہ تھا اور میٹھے پانی کی فطرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُسے سونے چاندی کے برتن میں رکھا جائے یا مٹی کے مٹکے میں۔ اُس کا دِل پارسا تھا۔ وہ مکروفریب کی دکانیں چلانے والے لوگوں کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ تُرش رو نہیں تھا۔ اسی لئے اُس کی باتوں کا شہد میٹھا ہوتا تھا۔ وہ خودغرض اور پاکھنڈیوں سے دُور بھاگتا تھا لیکن پرُخلوص دوستوں کو گلے لگاتا تھا۔ وہ خوش نما، خوش اخلاق اور خوش گلو تھا۔ اُس کے من کی خوبصورتی کا اعتراف اُس کے نکتہ چیں بھی کرتے تھے۔ ایمانداری اور دیانتداری میں وہ یکتا تھا۔ بے خوفی اور بے باکی اُس کا شیوہ تھا۔ خالد حسین کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی جب خالد ضلع ڈوڈہ کا پروجیکٹ افسر، ضلع ترقیاتی ایجنسی تعینات ہوا اور اقبال کھانڈے وہاں بطور ڈپٹی کمشنر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چوں کہ ضلع ترقیاتی ایجنسی کا چیئرمین بھی ڈپٹی کمشنر یا ضلع ترقیاتی کمشنر ہی ہوتا ہے، اس لئے خالد حسین کو ضروری احکامات لینے کے لئے اقبال کھانڈے کے پاس تقریباً ہر زور جانا پڑتا۔ اقبال کی طبیعت میں رومانیت تھی۔ اُسے اچھی شاعری سے اُنس تھا۔ اچھے سنگیت

کا وہ رسیا تھا خاص کر کشمیری، موسیقی کا وہ دلدادہ تھا اور اکثر اپنی خوبصورت آواز میں کشمیری گلوکاروں کے گائے ہوئے نغمے سناتا۔ وہ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی بڑی۔ عزت کرتا۔ اُسے بہن تنویر جہاں نے بتایا تھا کہ خالد حسین پنجابی اور اردو کا افسانہ نگار ہے اور اُس کی تخلیقات ہندوستان اور پاکستان کے ادبی جریدوں میں چھپتی رہتی ہیں تو اُن دونوں میں قربتیں بڑھتی گئیں۔ اقبال کھانڈے محفل پرست تھا اور پرُخلوص یاروں کا یار۔ تقریباً ہر شام اُس کی سرکاری رہائش گاہ پر دوستوں کی محلفیں لگتیں۔ جس میں جام و مینا کے دور چلتے اور اقبال کھانڈے سُرور میں حبہ خاتون، مہجور، دینا ناتھ نادم، احد زرگر اور غلام نبی ڈولوال کشتواڑی کے گیت گاتا۔ ہندی فلموں کے نغمے اور غزلیں بھی گاتا۔ اکثر اپنی دلکش آواز میں پاکستانی شاعر کی یہ نظم سناتا۔

اب کے سال پُونم میں
جب تُو آئے گی ملنے
ہم نے سوچ رکھا ہے
رات یوں گذاریں گے
دھڑکنیں بچھا دیں گے
شوخ تیرے قدموں میں
ہم نگاہوں سے تیری
آرتی اُتاریں گے
اب کے سال پُونم میں
جب تُو آئے گی ملنے

پوری محفل پر مستی چھا جاتی۔ دن کو دفتر میں ڈٹ کر کام کرنا۔ عوامی وفود سے ملنا۔ اُن

کے جائز کاموں کے لئے افسروں کو ہدایات دینا، ضلعی افسروں کی میٹنگیں کرنا۔ دُور دراز پہاڑی اور پسماندہ علاقوں کا دورہ کرنا اور نادار لوگوں کی دادرسی کرنا اور شام کو رنگ ونور کی محفل سجانا۔ اقبال کھانڈے شاید پہلا ڈپٹی کمشنر تھا۔ جس نے دو بار پاڈر کا پیدل سفر کیا اور ایک بار مڑھوا اور واڑون کا تین روزہ پیدل دورہ کیا۔ پھر واڑون سے مرگن پہاڑ کو پار کر کے ضلع اننت ناگ کے آخری گاؤں لہنون تک پیدل گیا۔ اہم محکموں کے ضلع افسران اُس کے ہر دورے میں ساتھ ہوتے۔ خالد حسین پر اُس کی نظر عنایت زیادہ رہتی کیونکہ وہ ہر دورہ کے دوران اُس کا ہمسفر رہتا۔ اقبال کی میز پر جو بھی مِسل آتی، وہ اُسی وقت اُس کا نپٹارا کر دیتا۔ اُس کی میز ہمیشہ خالی ہوتی۔ وہ دفتر سے تب تک باہر نہیں نکلتا جب تک کہ ساری فائلیں نہ دیکھ لیتا۔ سوم رس پینے کے باوجود اُس نے کبھی شراب کو اپنے حواس پر سوار نہیں ہونے دیا بلکہ خماری میں اُس نے عوام کے حق میں بہترین فیصلے کئے جس کی وجہ سے وہ لوگوں میں ہر دلعزیز تھا۔ کیونکہ اقبال کھانڈے کی وجہ سے اُن کا کام کبھی نہیں رُکتا تھا بشرطیکہ وہ جائز ہو۔ اُس نے اپنے پورے سروس کیئریر میں کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا، چاہے کتنا بھی سیاسی یا سماجی دباؤ کیوں نہ ہو۔ مال و دولتِ دُنیا اور رشتے ناطے اُس کے فرائض میں کبھی حائل نہیں ہوئے۔ 1987ء کے ریاستی انتخابات میں بطور ڈسٹرکٹ الیکشن افسر اس نے کسی کی بھی سفارش کو نہیں مانا اور اپنی مرضی کے مطابق پولنگ اور پرزائیڈنگ افسر تعینات کئے۔ ایک تحصیل یا بلاک میں کام کرنے والے ملازموں کو دوسری تحصیل اور بلاک میں الیکشن ڈیوٹی پر لگایا، جس کی وجہ سے سیاسی لیڈر اور امیدوار اُس سے بدظن ہو گئے لیکن اُس نے شفافیت سے الیکشن کروایا اور پھر وہی اُمیدوار اُس کے گن گانے لگے جو الزامات لگا رہے تھے۔ 1987ء کے الیکشن کے بعد اُس کا تبادلہ بطور ڈائریکٹر سکول ایجوکیشن کشمیر کر دیا گیا۔ چارج لیتے ہی اقبال نے ٹیچرز کی اٹیچمینٹ ختم کر دی۔ جس کا اثر تقریباً

پانچ سو اُستانیوں پر پڑا جو بڑے افسروں کی بیویاں، بہنیں یا بیٹیاں تھیں۔ بہت ہنگامہ ہوا لیکن اقبال اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور کوئی سفارش نہیں سنی۔ پھر اُس نے اخباروں میں اشتہار چھپوایا اور لکھا کہ جو ٹیچر کبھی بھی اپنی تحصیل میں ڈیوٹی نہ دے سکا ہو اور وہاں جانا چاہتا ہو، وہ درخواست دے۔ اسی کے ساتھ اُن اساتذہ کی فہرست بنائی گئی جو دس یا اُس سے زیادہ عرصہ تک ایک ہی سکول میں تعینات تھے اور پھر آٹھ ہزار کے قریب اساتذہ کو تبدیل کر دیا گیا۔ جس میں اقبال کی اپنی والدہ بھی شامل تھی۔ جو تقریباً بیس سالوں سے ایک ہی سکول میں ڈیوٹی دے رہی تھی۔ اقبال بڑا اصول پرست تھا۔ اُس نے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ آئی، اے، ایس میں آنے کے بعد اقبال نے پہلا پنگا غلام محمد شاہ المعروف گل شاہ سے لیا جو 1985ء میں وزیر اعلیٰ تھا۔ ڈریس کوڈ پر گل شاہ نے اقبال کو شدھ کشمیری مغلظات سے جب نوازا تو اقبال کھانڈے نے ترکی بہ تُرکی جواب دیا اور انگریزی بلاغت کا ثبوت دیتے ہوئے چنندہ لفاظی کا استعمال کیا اور استعفیٰ لکھ کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری بار ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وزارت کے ایک وزیر راجند سنگھ چب سے کھینچا تانی ہوگئی۔ وہ اپنے ایک منظور نظر کی تبدیلی اُس کی پسند کی جگہ پر کرانا چاہتا تھا جبکہ اقبال کا کہنا تھا کہ جس جگہ وہ ملازم تعینات ہے، وہاں گئے اُسے کچھ مہینے ہی ہوئے ہیں اس لئے تبادلہ نہیں ہوسکتا۔ اس بات پر کشیدگی اتنی بڑھی کی منتری صاحب مستعفی ہو گئے۔ 1990ء میں جب مرکزی سرکار نے گورنر جگموہن کو دوسری بار جموں وکشمیر میں تعینات کیا اور فاروق عبداللہ نے اپنی وزارت کا استعفیٰ دے دیا تو گورنر راج لگنے کے بعد عنانِ حکومت جگموہن کے ہاتھ میں آگئی۔ اُس نے اُگروادیوں کو ختم کرنے کے لئے عام اور نہتے لوگوں پر بھی ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ دہشت گرد اور دہشت گردی تو ختم نہ ہوسکی لیکن عام لوگ مرنے لگے۔ اُن کے گھر جلنے لگے۔ غیرت و آبرو نیلام ہونے لگی۔ سرکاری آتنک شروع ہو گیا۔ کشمیریوں کو

سبق سکھانے کی باتیں گورنر صاحب کھلم کھلا کرنے لگے اور جلوسوں پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ یہ حالات دیکھ کر اقبال کھانڈے نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس وقت وہ ڈائریکٹر ٹورازم تھا۔ جب گورنر جگموہن کو خبر ملی تو اُس نے اقبال کھانڈے کے دوستوں کو بلایا اور سمجھایا کہ وہ اقبال کو استعفیٰ دینے سے روکیں۔ انل گوسوامی (آئی، اے، ایس) پرویز دیوان (آئی اے ایس) اور اقبال کی ایک صحافی دوست نے دو دِنوں کی مغز ماری کے بعد اقبال کو منالیا کہ وہ استعفیٰ نہیں دے گا، لیکن گورنر صاحب سے کہہ دیں کہ وہ بے گناہ کشمیریوں کا قتلِ عام بند کریں اور اپنی کاروائیاں صرف اُگروادیوں تک محدود رکھیں تا کہ بھارت کا نام دنیا میں بدنام نہ ہو۔

ایک دِن گورنر جگموہن نے اقبال کو گورنر ہاؤس بُلایا اور پوچھا کہ اُس کی جگہ اگر اقبال ہوتا تو وہ کیا کرتا۔ اقبال کھانڈے جواب دیا کہ وہ اپنا حکم ڈائریکٹر جنرل پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اعلیٰ افسران کو دیتا اور شام کو ان سے رپورٹ طلب کرتا۔ ریاستی پولیس پر وہ اعتبار کرتا اور ان سے خفیہ اِن پُٹ لیتا۔ نہ کہ پیرا ملٹری فورس کو سارے اختیارات دے دیتا۔ جن کو نہ تو کشمیر کے سیاسی پس منظر کی جانکاری ہے اور نہ ہی عوام کی نفسیات کا پتہ ہے۔ اقبال نے کہا کہ اگر وہ ہوتا تو گورنر بنا رہتا۔ خود حوالدار نہیں بنتا۔ پولیس کے ایس، ایچ، او کو طلب نہیں کرتا بلکہ ڈی، جی کو بلاتا۔ جواب سُن کر گورنر جگموہن خاموش ہو گئے تھے۔

میرا نام راجہ محمود احمد ہے۔ مجھے اور میرے دوست عجب سنگھ کو خالد حسین نے ہی اقبال کھانڈے کے ساتھ ملایا تھا اور کہا تھا کہ یہ دونوں خالد حسین کے بے لوث دوست ہیں۔ خوشی غمی میں ساتھ نبھانے والے۔ شروع شروع میں خالد حسین ہم دونوں کو لیکر کھانڈے صاحب کے گھر لے جاتا۔ جہاں دارو کے ساتھ ساتھ لطیفوں کی محفل سے سب

لطف اندوز ہوتے۔ ہمارے ایک اور دوست انجینئر شیخ تحسین مصطفی (ریٹائرڈ چیف انجینئر) بھی اقبال کھانڈے کے دوست تھے۔ بس اقبال سمیت ہم پانچ پیارے تقریباً روز شام یا چھٹی والے دِن دوپہر کو اکٹھے بیٹھتے اور گپ شپ کرتے۔ مندرجہ بالا ساری باتیں اقبال کھانڈے نے خالد حسین اور ہم سب کو بتائی تھیں۔

اقبال کھانڈے دوبار وزیر اعلیٰ کا پرنسپل سیکرٹری بھی رہا۔ فاروق عبداللہ اور مفتی محمد سعید کے ساتھ۔ وہ کبھی کسی دباؤ میں نہیں آیا۔ اُسنے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ چیف منسٹر یا دیگر منسٹروں کو بھی غلط کام کرنے سے روکا۔ اسی وجہ سے اُسے ایک بار مرکز میں ڈیپوٹیشن پر بھیج دیا گیا اور دوسری بار اُسے جبری چھٹی پر بھیجا گیا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا لیکن اپنی ایمانداری پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

ایک بار خالد حسین سرکاری کام کے سلسلہ میں دہلی گیا اور وہاں کشمیر ہاؤس چانکیہ پوری، اقبال کھانڈے کو ملنے کے لئے چلا گیا۔ فلیٹ میں صرف اُس کا نوکر جمال تھا۔ جمال نے بتایا کہ آج کل کڑکی کا دور چل رہا ہے۔ کشمیری کُلچے اور چائے پی جارہی ہے۔ کنٹین والوں نے کھانا دنیا بند کردیا ہے۔ چھ سات دِن سے صاحب نے دارو بھی نہیں پی ہے کیونکہ دارُو خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ صاحب دفتر بھی پیدل جاتا ہے۔ اُن کے پاس سرکاری کار بھی نہیں ہے۔ کار دینے سے چیف سیکرٹری صاحب نے منع کردیا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔'' خالد حسین اُسی وقت بازار گیا۔ اقبال کھانڈے کی من پسند شراب کا ایک کریٹ خریدا اور جمال کو دیا۔ کنٹین میں جاکر بل ادا کیا اور اُنھیں کہا کہ وہ دوبارہ کھانا دنیا شروع کریں۔ جب اقبال کا ڈیپوٹیشن ختم ہوا اور وہ واپس جموں آیا تو اُسے محکمہ صحت کا کمشنر لگایا گیا۔ خالد حسین اُس کو ملنے اُس کے سرکاری کوارٹر پر گیا اور اُسے باہر گھومنے کے لئے کہا۔ وہ مان گیا اور کہنے لگا کہ ہری نواس ہوٹل میں بیٹھ کر دارو پیتے ہیں۔ جب وہ دنوں

چلنے لگے تو اقبال نے میلا سا خان سوٹ پہنا تھا اور نائلن کی باتھ روم چپل پاؤں میں پہنی تھی۔ خالد حسین نے اُسے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا تو وہ بولا کہ اُس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ سارے کپڑے جیکٹس اور کوٹ، بوٹ اور چپلیں وہ کشمیر ہاؤس کے ملازموں میں بانٹ آیا ہے۔ خالد حسین اُسے رگھو ناتھ بازار میں مونا لیزا کے شوروم میں لے گیا جہاں اقبال نے دو پتلونیں اور دو ٹی شرٹیں پسند کیں۔ مونا لیزا کے شوروم میں ہی اُس نے کپڑے تبدیل کئے اور پھر باٹا شُوز کی دکان سے اُس نے ایک بُوٹ پسند کیا۔ خالد حسین نے دونوں جگہ بل ادا کیا اور پھر ہری نواس چلے گئے۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو اقبال نے خالد حسین کو ساری رقم واپس کردی جو اُس نے دہلی اور جموں میں خرچ کی تھی۔

ایک بار کچھ فیکٹری مالکان کا جھگڑا ختم کرانے کے لئے خالد حسین ریٹز (Ritz) ہوٹل جموں میں ثالثی کا کردار ادا کر رہا تھا کیونکہ دونوں فیکٹری مالکان نے خالد حسین پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے اُسے ثالث قبول کیا تھا۔ معاملات طے ہونے کے بعد اُنہوں نے خالد حسین کو کھانے کے لئے روک لیا اور خود شراب پینے لگے۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن وہ پیئے جا رہے تھے۔ اتنے میں خالد حسین کو اُس کی اہلیہ بھابی نسیم کا فون آیا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو خالد نے مذاق میں کہہ دیا کہ اُن کو اُگروادیوں نے اغوا کرلیا ہے اور رہائی کے لئے دو کروڑ روپے مانگ رہے ہیں۔ نسیم بھابی نے مجھے فون کیا۔ میں نے اقبال کھانڈے، تحسین مصطفی، عجب سنگھ اور تاج محی الدین کو فون پر اطلاع دی کہ خالد حسین اغوا ہو چکا ہے اور اغوا کار دو کروڑ روپئے مانگ رہے ہیں ورنہ اُسے قتل کردیں گے۔ خالد حسین کے مذاق نے پورا جموں ہلا دیا۔ تاج محی الدین جو منسٹر تھا، اُس نے پولیس کے سربراہ کو فون کردیا۔ اُدھر اقبال کھانڈے نے چیف سیکرٹری سے رابطہ کیا اور خالد حسین کی رہائی کے لئے ضروری قدم اٹھانے پر زور دیا۔ اقبال نے عجب سنگھ سے کہا کہ وہ فوراً دو کروڑ روپئے کا بندوبست

کرے۔اب رات کے 11 بجے رقم کا کیسے انتظام ہو۔اتنے میں عجب سنگھ نے خالد حسین کوفون کیا تو اُس نے کہا کہ وہ ہوٹل ریٹز میں کھانا کھا رہا ہے۔عجب سنگھ نے پوچھا کہ تم کو کسی نے اغوا کیا ہے۔جب خالد حسین نے کہا کہ بالکل نہیں، تو اُس نے خالد حسین کی بات اقبال کھانڈے سے کرائی لیکن اُسے یقین نہیں آیا۔اُس نے میزبانوں سے بات کرانے کے لئے کہا۔اُنہوں نے یقین دلایا کہ خالد حسین کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے لیکن اقبال کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔اُسنے کہا کہ وہ خالد حسین کو لیکر اُس کے گھر آئیں۔رات کے بارہ بجے وہ اقبال کھانڈے کے گھر پہنچے جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔اقبال کھانڈے کو اطمینان ہوا اور جب اُسے خالد حسین نے بتایا کہ اس نے مذاق کیا تھا تو سبھی دوستوں نے خالد حسین کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ناقابل بیان ہے۔دوستوں کے لئے فکر مند ہونا اقبال کھانڈے کی بہت بڑی خوبی تھی۔خالد حسین کی بیٹی ڈاکٹر ھما کی شادی کے دِنوں میں وہ اپنی بیگم اور شیشن جج کنیز فاطمہ بھابی کے ساتھ روز آتا اور دیر تک گانے گاتا۔تنویر جہاں اور اُس کا خاوند شوکت بھائی، عجب سنگھ، تاج محی الدین خالد دُرانی اور میں سب مل کر شادی کے انتظامات میں مصروف رہتے اور رات کے کھانے کے بعد مقامی گلوکاروں کے گانے سنتے اور اقبال اُن کی سُر میں سُر ملاتا۔تاج محی الدین نے تو اپنا پورا گھر شادی کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ دوستوں کے سکھ دُکھ میں ہمیشہ شامل ہوتا۔

زندگی نے اقبال کھانڈے کو شدید جھٹکے دیئے۔اُن دِنوں وہ کمشنر صحت اور میڈیکل ایجوکیشن تھا، جب اُسے چھاتی میں لگاتار درد ہونے لگا۔ڈاکٹروں نے اُسے دہلی جا کر ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیا۔آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ نے اُسے ممبئی ہسپتال منتقل ہونے کے لئے کہا جہاں کینسر اور پھیپھڑوں کے ماہر ڈاکٹر ڈیسائی نے اُس کے دوبارہ ٹسٹ لئے اور پایا کہ اُسے پھیپھڑوں کا کینسر ہے اور اُس نے آپریشن کر کے دائیں پھیپھڑے کا آدھا حصہ کاٹ

کر باہر نکال دیا۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ مہینے تک ممبئی ہسپتال کے ڈاکٹر ڈیسائی کے زیر علاج رہا
اُس کی اہلیہ کنیز فاطمہ صاحبہ نے جی جان سے اُس کی تیمارداری کی۔ خالد حسین، تحسین مصطفی،
عجب سنگھ اور میں دوبار جموں سے ممبئی اُس کی عیادت کے لئے گئے۔ ہسپتال سے اُسے چھٹی
دے دی گئی اور کہا گیا کہ وہ دو چار مہینے کسی صحت افزا مقام پر گذارے۔ چھ مہینے کے بعد
اقبال کھانڈے نے دوبارہ چھاتی میں شدید درد محسوس کیا اور وہ دوبارہ ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس
گیا۔ ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد ڈاکٹر ڈیسائی نے کہا کہ کینسر پسلیوں تک پھیل چکا ہے۔ اُس
نے اقبال کی دو پسلیاں بھی کاٹ دیں۔ جب درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا تو اُس نے کہا کہ اقبال
کے پاس صرف تین چار مہینے بچے ہیں۔ اس لئے اسے واپس لے جائیں۔ بھابی کنیز فاطمہ
نے ڈاکٹر ڈیسائی سے گذارش کی کہ وہ اقبال کو امریکہ کے سب سے بڑے کینسر ہسپتال کے
لئے ریفر کردیں لیکن اُس کا کہنا تھا کہ وہاں جو کینسر کا معروف ڈاکٹر بھینس ہے، وہ اُس
کا شاگرد ہے۔ اُسی نے ڈاکٹر بھینس کو پڑھایا ہے۔ وہ مجھ سے سیانا ڈاکٹر نہیں ہے لیکن اقبال
کی اہلیہ نے اُسے مجبور کردیا اور بالآخر ڈاکٹر ڈیسائی نے اُسے امریکہ کے کینسر ہسپتال کے لئے
ریفر کردیا۔ اقبال جموں آیا لیکن اُس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا۔ چیف سیکرٹری اشوک جیٹلی
نے خالد حسین کو فون کر کے کہا کہ وہ پاسپورٹ دفتر جائے اور اقبال کا پاسپورٹ بنوائے۔
پاسپورٹ افسر نے کئی Formalities پوری کرنے کے لئے کہا۔ اُن کو پورا کرنے میں دو
دن گئے۔ پھر اُس نے سی، آئی، ڈی کی رپورٹ مانگی۔ خالد حسین نے چیف سیکرٹری صاحب
سے دوبارہ فون پر بات کی اور بتایا کہ پاسپورٹ افسر بار بار اڑچنیں ڈال رہا ہے۔ اتنے میں
سی، آئی، ڈی کے انسپکٹر جنرل کی دستخط شدہ رپورٹ بھی بذریعہ فیکس آئی۔ جیٹلی صاحب نے
دہلی میں وزارت خارجہ کے سیکرٹری سے بات کی اور اقبال کی حالت کے بارے میں بتایا۔
اُنہوں نے پاسپورٹ افسر کی کھینچائی کی تو شام کے پانچ بجے پاسپورٹ مل گیا۔ جب اقبال

سے پوچھا گیا کہ وہ دیکھ بھال کے لئے اپنے ساتھ کس کو لے جانا چاہتا ہے تو اُس نے انل گوسوامی صاحب کا نام دیا جو اُس کا بیچ میٹ بھی تھا اور دوست بھی۔ ریاستی سرکار نے اقبال کی اہلیہ کو بطور خدمت گار اور انل گوسوامی صاحب کو معاون کے طور پر جانے کی اجازت دے دی۔ امریکہ پہنچنے پر ڈاکٹر بھینس نے اقبال کا اچھی طرح سے معائینہ کیا۔ جدید مشینوں سے اُس کے ٹیسٹ لئے گئے اور اُس نے بتایا کہ اقبال کو کینسر نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ سگریٹ نوشی کرنے کی وجہ سے اُس کے ایک پھیپھڑے پر کالے داغ پڑ چکے تھے جسے ڈاکٹر ڈیسائی نے کینسر سمجھ لیا۔ اُس نے اقبال کے زخم کو پانی سے دھونے کے لئے کہا اور ایک سفید رنگ کی چھوٹی سی ٹیبلٹ روزانہ کھانے کے لئے دی۔ جس شخص کو ڈاکٹر ڈیسائی نے کہا ہو کہ وہ صرف تین مہینے کا مہمان ہے۔ اُسے جب پتہ چلے کہ اُسے تو کینسر ہے ہی نہیں، اُس کی خوشی کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بھینس نے اُسے تنبہ کی کہ وہ سگریٹ نوشی بالکل بند کر دے ورنہ اُس کی زندگی جا سکتی ہے۔ دارُو کے لئے پوچھنے پر ڈاکٹر بھینس نے کہا کہ اول تو دارُو پینا چھوڑ دو۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو ایک آدھ پیگ لے لیا کرو۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ یوں ایک مہینہ گذار کر تینوں واپس جموں آ گئے۔ اقبال کا علاج سرکاری خرچے پر ہوا تھا لیکن انل گوسوامی صاحب نے سرکار سے کوئی پیسہ نہیں لیا بلکہ امریکہ جانے، آنے اور رہنے کا سارا خرچہ خود برداشت کیا۔ اقبال مکمل صحت یاب ہو کر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اور مختلف محکمہ جات کی سربراہی کرنے لگا۔ مفتی محمد سعید صاحب نے اُسے اپنا پرنسپل سیکرٹری بنایا تو وزیر اعلیٰ کے دفتر کے کام میں تیزی آ گئی۔ کوئی بھی فائل اقبال کے میز پر رُکتی نہیں تھی لیکن جن کو اُلٹے پلٹے کام کروانے ہوتے تھے وہ بند ہو گئے اور اقبال کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور مفتی صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ اقبال کو تبدیل کر دیں کیونکہ وہ کسی کی سنتا ہی نہیں ہے۔ مفتی سعید صاحب نے اُسے منصوبہ بندی محکمے کا پلاننگ کمشنر تعینات کر دیا۔ لیکن اُس کے خلاف سازشیں جاری

رہیں جس کا انجام یہ ہوا کہ اقبال کو ایک ایسے جرم میں پھنسایا گیا جو اُس نے کیا ہی نہیں تھا اور یہ سب اُس وقت ہوا جب غلام نبی آزاد ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دِن ہم تحسین مصطفی کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ وہاں اقبال کھانڈے کا دوست اور تحسین کا رشتے دار ڈاکٹر شاہد مغل آیا اور کہنے لگا کہ دہلی میں اُس کا ایک دوست سی، بی، آئی کے دفتر میں افسر ہے اور وہ بتا رہا تھا کہ 48 گھنٹے کے اندر اندر اقبال کھانڈے کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اُس پر الزام ہے کہ اُس نے ایک لڑکی کی عصمت دری کی ہے۔ اُس کے خلاف سی، بی، آئی نے کیس درج کر لیا ہے۔ خالد حسین اور تحسین نے اقبال سے فون پر بات کی اور بتایا کہ اُس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ لٰہذا وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرے۔ اقبال کھانڈے نے چیف سیکرٹری شری وجے بقایا سے دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے قریبی رشتے دار اور جنرل ایڈمنسٹریشن محکمہ کے کمشنر خورشید گنائی سے ملا۔ اُسنے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جبکہ اُن کو پتہ تھا لیکن چیف منسٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ اقبال کو نہ بتایا جائے۔ گرفتاری سے پہلے اقبال کھانڈے سری نگر ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ بورڈ کی میٹنگ میں بطور پلاننگ کمشنر حصہ لینے کے بعد اپنے سرکاری بنگلے کی طرف جا رہا تھا کہ سی، بی، آئی والوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور الزام یہ لگایا گیا کہ دو سال پہلے اُس نے رقم دے کر ایک ویشیا سے ہمبستری کی ہے۔ اُس ویشیا نے سی، بی، آئی میں شکایت درج کرائی ہے۔ ایسے ہی الزام دو وزیروں پر بھی لگائے گئے اور اُن کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ جس میں ایک رمن مٹو تھے اور دوسرے غلام احمد میر تھے جنہیں کانگریس جماعت کا ریاستی صدر بنانے کے چرچے عام تھے۔ سی، بی، آئی کے سری نگر دفتر واقع ھمہاما میں اقبال کو لایا گیا اور اُسے انٹیروگیٹ کیا گیا۔ پھر ان تینوں کو سری نگر کی سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں وہ پچاس دن رہے۔ خالد حسین، عجب سنگھ اور میں کئی بار اُسے جیل میں جا کر ملتے رہے۔ 50 دن کے بعد اُن کی

ضمانت پر رہائی ممکن ہوئی۔اور عدالت میں مقدمے کی کاروائی شروع ہوئی۔اقبال کھانڈے سینئر موسٹ آئی،اے،ایس افسر ہونے کی وجہ سے چیف سیکرٹری کے عہدے کا اُمیدوار تھا جبکہ غلام احمد میر کانگریس صدر بننے کا (آجکل وہ کانگریس کا ریاستی صدر ہے) اسی لئے سازشیوں نے ایک ویشیا اور اُس کی دلالن کو موٹی رقم دے کر میر صاحب اور اقبال کے خلاف بیان دلوایا گیا تھا۔ملزموں کی درخواست پر مقدمہ پنجاب اور ہریانہ ہائی کورٹ میں ٹرانسفر کیا گیا۔خالد حسین اقبال کو لیکر چندی گڈھ گیا۔جہاں اُس کے کئی ادیب دوست رہتے تھے۔ اُن سے مشورہ کر کے ایک نامی گرامی وکیل کیا گیا۔اکثر پیشیوں پر خالد حسین اور علی محمد وٹالی صاحب (ریٹائرڈ ڈی،آئی،جی) چندی گڈھ جاتے۔بالآخر پنجاب ہائی کورٹ نے مقدمہ خارج کر دیا۔جب یہ خبر جموں پہنچی تو خالد حسین اور میں رات کے 9 بجے جموں سے چندی گڈ ھ کے لئے روانہ ہوئے اور صبح دم کشمیر گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے جہاں رمن مٹو، غلام احمد میر اور قبال کھانڈے ٹھہرے تھے۔مبارکبادیاں اور خوشیاں بانٹی گئیں اور پھر واپس جموں چلے آئے۔کچھ ہی دِنوں کے بعد چیف سیکرٹری مادھو لال کو مرکز میں بھیج کر وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ نے محمد اقبال کھانڈے کو جموں و کشمیر کا چیف سیکرٹری مقرر کر دیا۔خالد حسین اُس روز پنجابی یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے پٹیالے میں تھا۔خبر ملتے ہی وہ سیمینار کو چھوڑ کر جموں کے لئے روانہ ہوا اور چار بجے جموں کے سیکریٹریٹ میں جا کر اقبال کو مبارک دی اور دونوں گلے مل کر پرسکون ہوئے۔

2011ء میں اقبال کی زندگی میں ایک اور بڑا زلزلہ آیا۔اُس کا لختِ جگر شادی میں شرکت کرنے کے بعد واپس سری نگر آرہا تھا کہ اُس کی کار ایک درخت سے جا ٹکرائی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔اِس ناگہانی المیے اور صدمے سے اقبال پوری طرح سے ٹوٹ گیا۔جوان بیٹا مرجائے تو ماں باپ کا دِل مرجاتا ہے۔جوان بیٹے کی وفات کے غم میں وہ

دوبارہ شراب نوشی کرنے لگا اور سگریٹ پینے لگا۔ غم غلط کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو دھوئیں میں اُڑانے لگا۔ اُسے پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین کا عہدہ دینے کی پیش کش کی گئی۔ مشیر بنانے کے لئے کہا گیا لیکن وہ نہ مانا اور ریٹائر ہوتے ہی گھر آ گیا۔ شراب اور سگریٹ نوشی کی وجہ سے بیس سال کے بعد اُسے دوبارہ کینسر نے آن دبوچا۔ اُسے ہسپتال داخل کیا گیا۔ پھر کبھی گھر اور کبھی ہسپتال آنا جانا لگا رہا۔ کینسر اُس کے اندر پھیلنے لگا وہ خالد حسین سے کہتا کہ وہ مرنے کے لئے تیار ہے۔ پھر اللہ اُس کی جان قبض کیوں نہیں کرتا۔ کیوں اُسے تکلیف دے رہا ہے۔ شاید اللہ نے اُس کی سن لی، اور بالآخر اُس کی روح جسم سے پرواز کر گئی اور اُسے گھر کے سامنے قبرستان میں ساجد کی قبر کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اللہ مغفرت کرے۔ اقبال ایک درویش صفت انسان تھا۔ صوفی منش بندہ تھا۔ ہمارے لئے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

لکھ لکھ بدیاں، سوسو طعنے، سبھے سِر تے سہیے
توڑے سِرونجے دھڑ نالوں، تاں بھی حال نہ کہیئے
سخن جنہاں دا ہووے دارُو، حال اُتھائیں کہیئے
نال سجن دے رہیئے
شاہ حسینؒ

(ترجمہ) لاکھ بُرایاں، سو سو طعنے، سب سر پر سہنا
تمہارے دھڑ سے سر الگ کردیں تو بھی حال نہ کہنا
سخن وری علاج ہو جن کا، حال اُنہی سے کہنا
ساتھ سجن کے ساتھ رہنا

تصاویر

والدہ بتول بیگم اور اہلیہ نسیم فردوس کے ساتھ

پاکستانی صحافت کی منفرد آواز جناب مجیب الرحمٰن شامی، 'دنیا' ٹیلی ویژن کے اجمل جامی اور صحافی
طاہر سرور میر کے ساتھ

گورودوارہ رتن گڑھ، علی بیگ، (ضلع میر پور) میں سابقہ بیوروکریٹ اور میر پور کی ثقافتی شخصیت
شوکت مجید ملک کے ساتھ
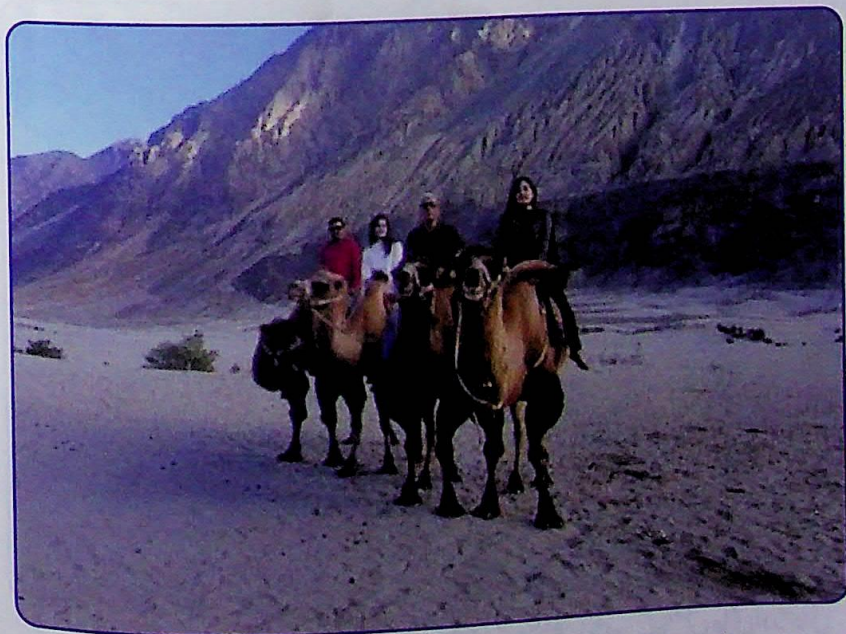
نُوبرا ویلی (لداخ) کے سرد صحرا ہندر میں اپنی پوتیوں کے ہمراہ اُونٹ کی سواری کرتے ہوئے

لاہور میں اُردو پوائنٹ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے

جشن فیض کے موقعہ پر مسعود چودھری، اسلم قریشی، سہیل کاظمی، رویندر کول،
جاوید راہی اور لیاقت جعفری کے ساتھ لی گئی تصویر

لاہور میں مشہور پنجابی ناول نگار اور سابقہ وزیر فخر زماں کے ساتھ

فلم، ٹیلی ویژن اور تھیٹر کے مشہور اداکار سہیل احمد بٹ کے ساتھ (لاہور)
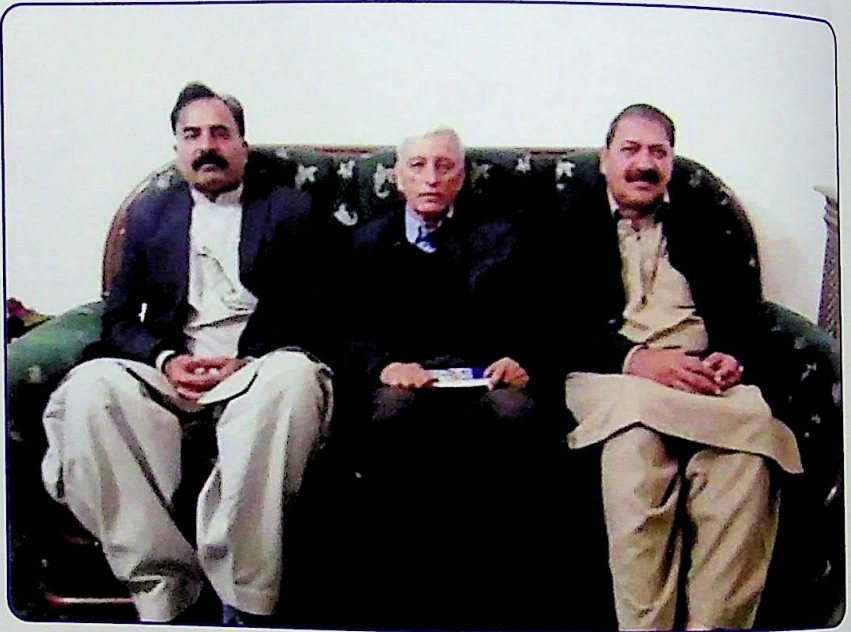
امراضِ جلد کے ماہر ڈاکٹر اظہر محمود جنہوں نے پنجابی ادب میں پی ایچ ،ڈی کی ڈگری حاصل کی اور جو بہترین گلوکار بھی ہیں (گجرات ،مغربی پنجاب)

میر پور میں جسٹس عبدالمجید ملک کی طرف سے دیئے گئے ظہرانے میں شرکت کرتے ہوئے

سعادت حسن منٹو کی بیٹی نزہت صاحبہ اور افضل ساحر کے ساتھ ایک عشائیہ میں (لاہور)
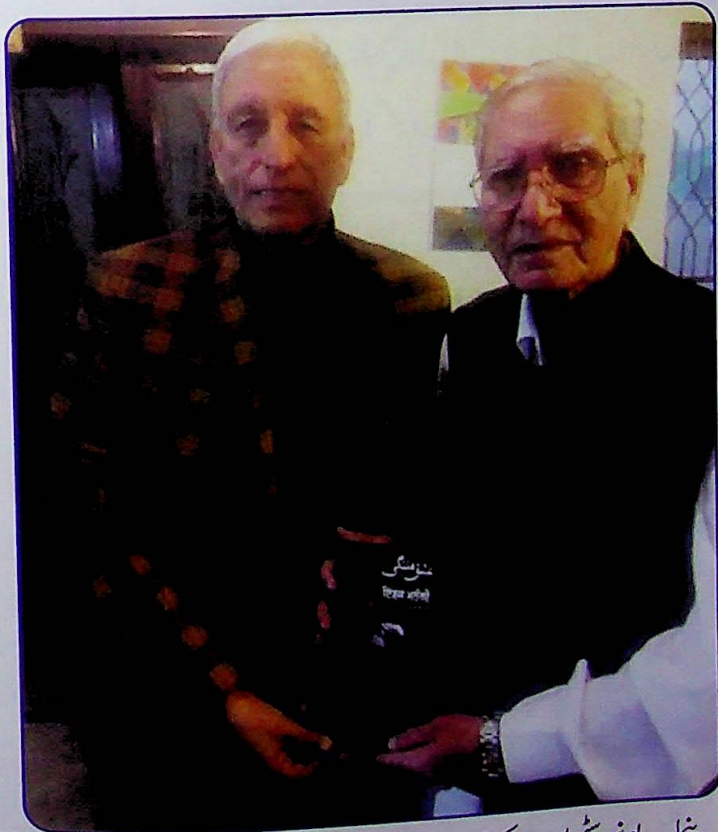
پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ پنجابی کے پہلے صدر ڈاکٹر شہباز ملک کے ساتھ
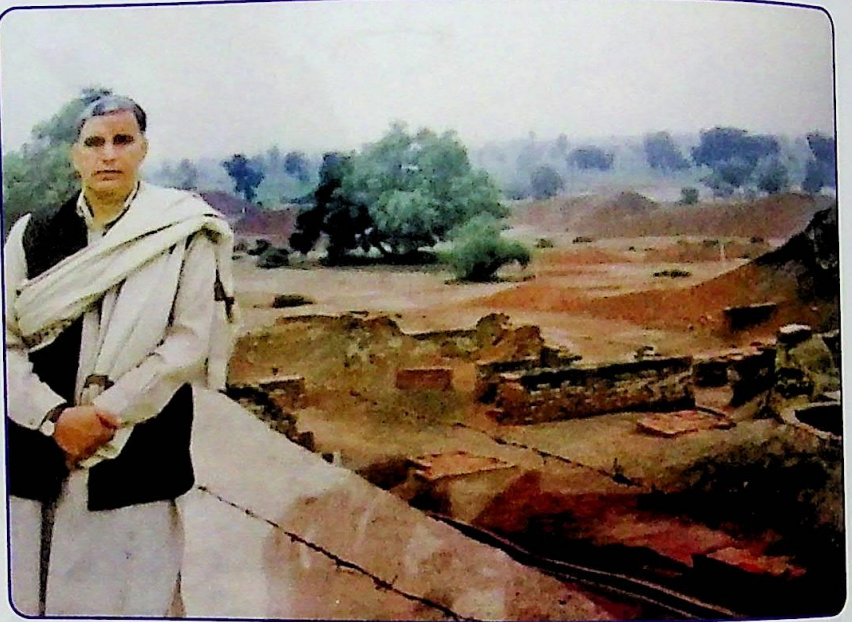
ہڑپہ میں پانچ ہزار سال پرانے آثار دیکھتے ہوئے (ضلع ساہیوال، مغربی پنجاب)
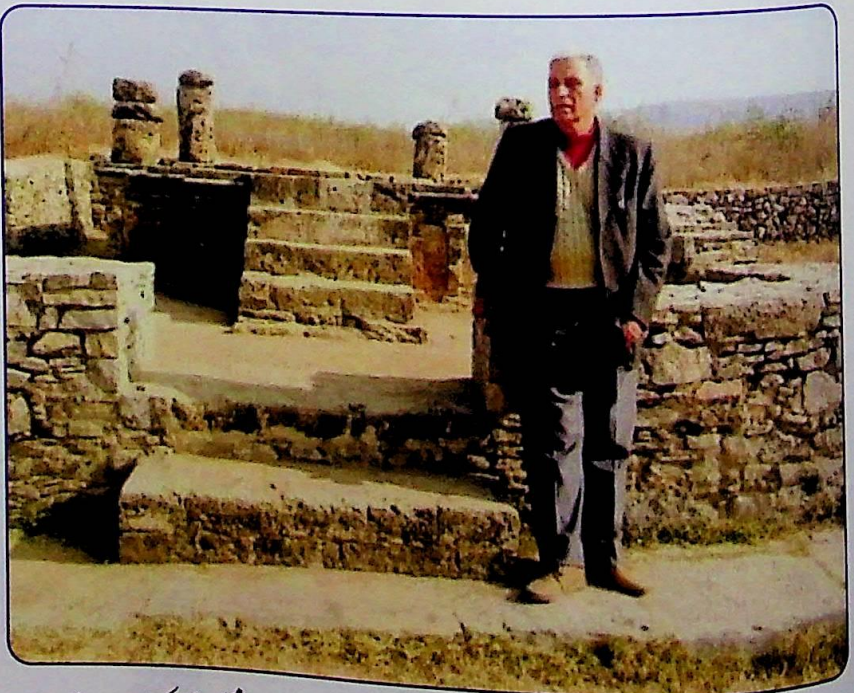
ٹیکسلا میں گندھارا تہذیب کے آثار دیکھتے ہوئے، (پس منظر میں محل کے کھنڈرات)
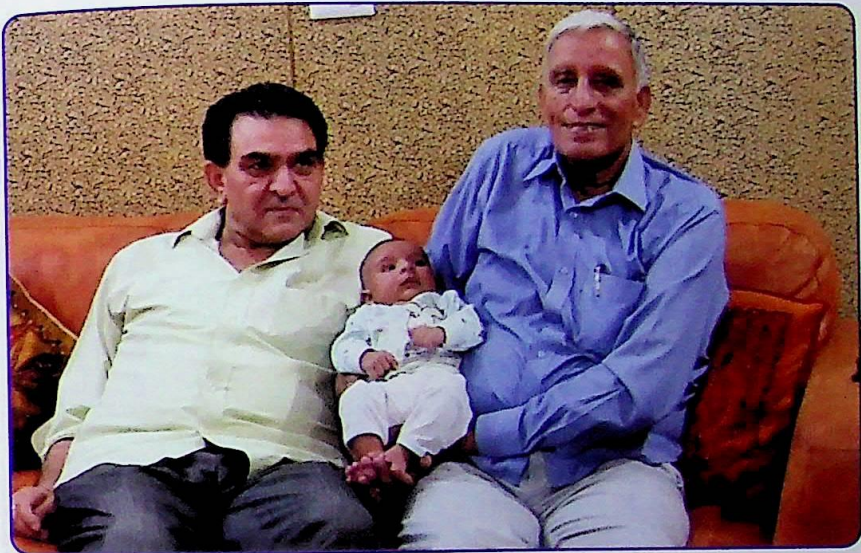
دو ماہ کا فارِس اپنے دادا اور پڑنانا کی گود میں
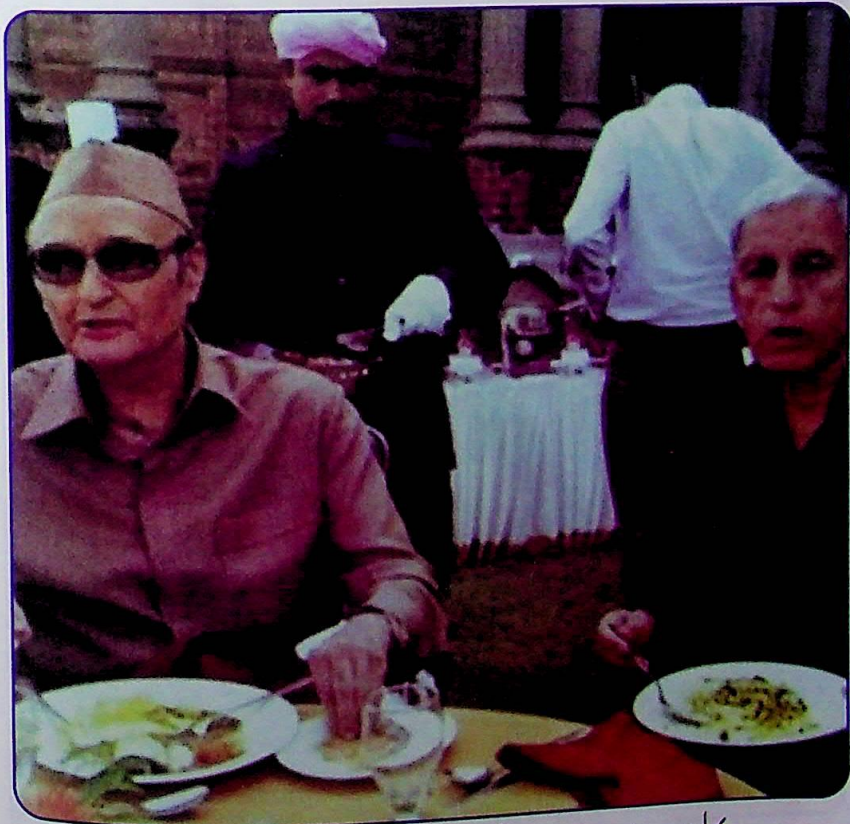
پہلے صدرِ ریاست اور سابقہ مرکزی وزیر و گورنر ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ

بحیثیت ڈپٹی کمشنر پونچھ ایک فوجی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے

دادی تاج بیگم، چچا عبدالکریم اور پھوپھی زاد بہنیں کشور اور منوّر (ایک نایاب تصویر)
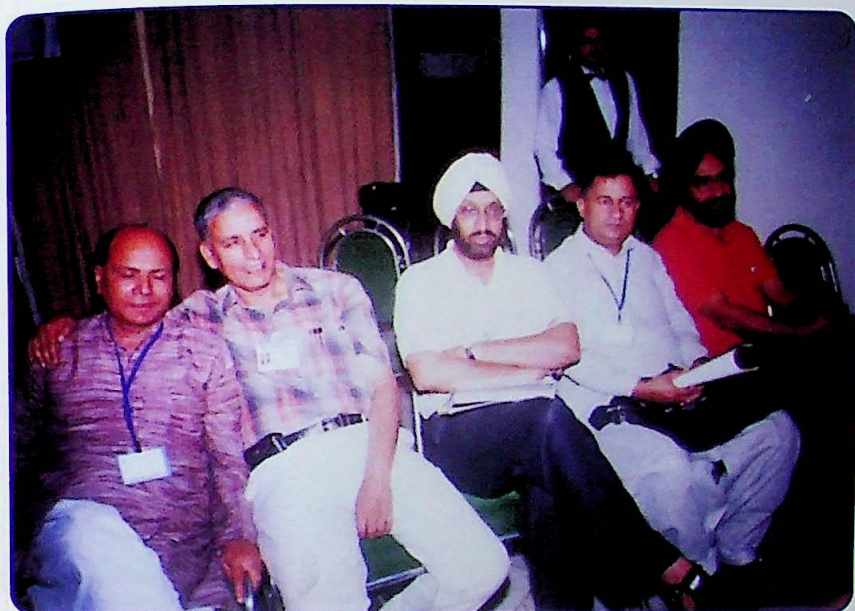
لاہور میں پاکستانی ادیبوں مشتاق کنول مرحوم اور نین سُکھ کے ساتھ
پرنسپل اوتار سنگھ سِدھو اور بیبا بلونت کے ہمراہ
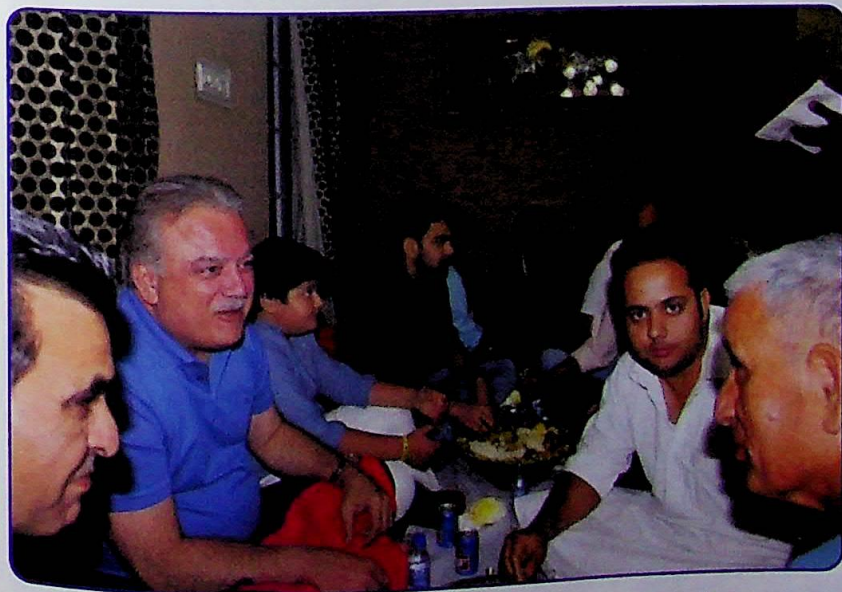
پاکستان کے ممتاز صحافی اور بہوشا فاروق بیگ کے چچا جناب محسن بیگ
جموں میں اہل خانہ کے ساتھ وازوان کا لطف اٹھاتے ہوئے۔
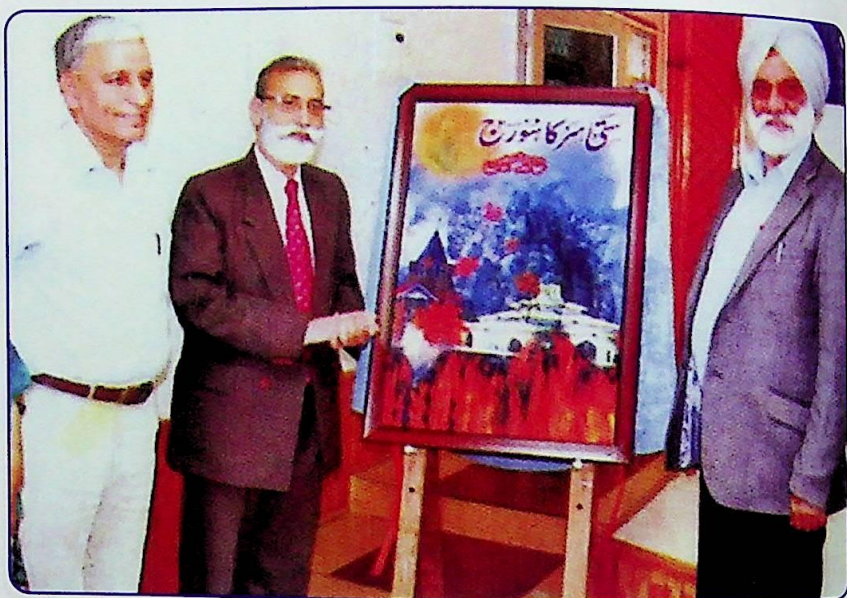
ڈاکٹر سدھیر سنگھ بلوریہ سابقہ چیف سکریٹری اور وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی جموں اور
ڈاکٹر موہن پال سنگھ ایشر وائس چانسلر جموں یونیورسٹی "ستی سر کا سورج" کی نقاب کشائی کرتے ہوئے
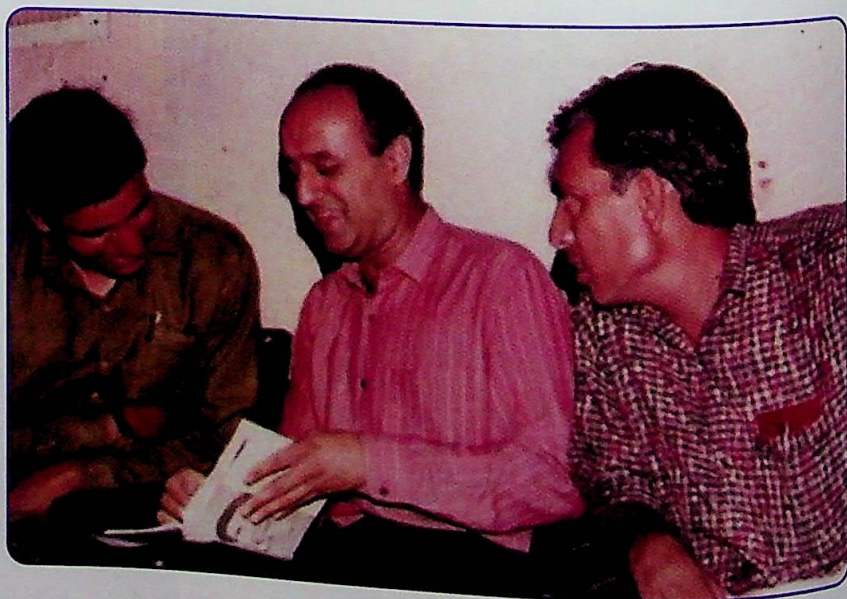
جناب پرویز دیوان (آئی اے ایس) اور خالد کفایت "اشتہاروں والی حویلی" کا اجراء کرتے ہوئے
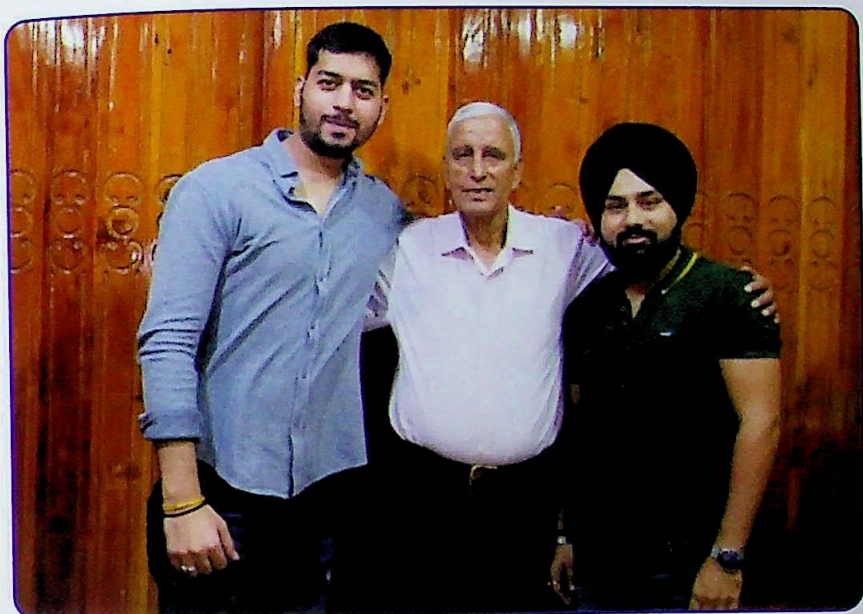
عزیزی مومن کاظمی ایڈوکیٹ اور منیندر سنگھ کپور ایڈوکیٹ کے ساتھ

ہند پاک پنجابی ادیبوں اور فنکاروں کے ساتھ فلیٹی ہوٹل لاہور میں (۲۰۰۴ء)

خالد حسین کے بچے یاسیر عمران، ڈاکٹر سمیہ تبسم، ڈاکٹر ہما تبسم اور ذاکر حسین
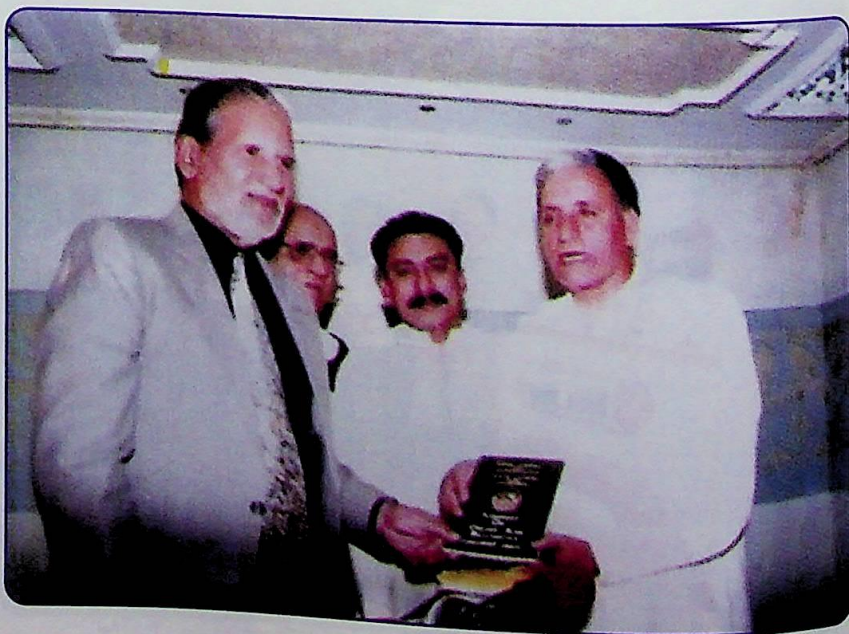
پاکستانی انتظام والے کشمیر کی سپریم کورٹ کے سابقہ جسٹس جناب عبدالمجید ملک کے ہاتھوں عزت افزائی
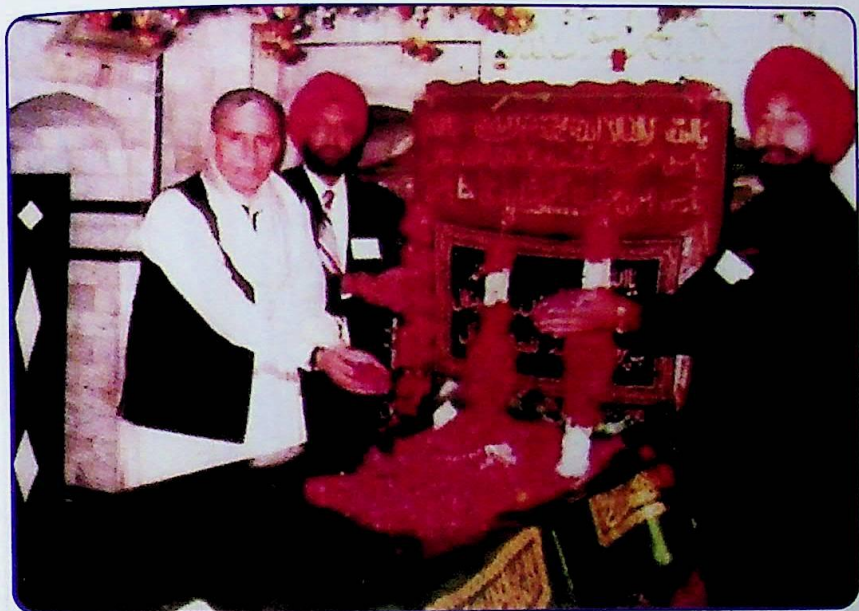
بُلھے شاہ (قصور) کے مزار پر پھولوں کے چادر چڑھاتے ہوئے
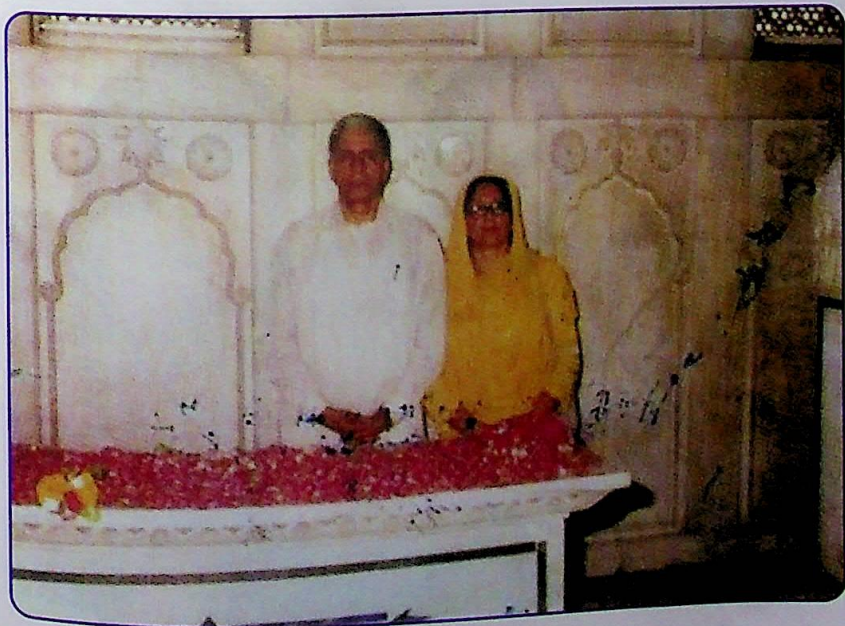
علامہ اقبال کے مزار پر اہلیہ کے ساتھ (لاہور)

۷/جولائی ۱۹۷۵ءکوسرینگر میں کل ہند پنجابی کانفرنس کے موقعہ پر
وزیراعلیٰ پنجاب مرحوم گیانی ذیل سنگھ کا استقبال کرتے ہوئے

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی گولڈن جوبلی کے موقعہ وزیراعلیٰ پنجاب پرکاش سنگھ بادل اور
وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ کے ہاتھوں پنجابی ادب کی خدمات کے اعتراف میں نوازے جانے پر

ذاکر اور یاسر کی بیگمات
عاصمہ اقبال بٹ
اور ثنا فاروق بیگ

جموں کشمیر کے سابقہ گورنر شری این این ووہرا کو اپنی کتابیں پیش کرتے ہوئے

کون دِلوں کی جانے ہُو

اُگ رہا ہے دَر و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

زندگی میں کچھ وارداتیں، حادثے اور انہونی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو انسانی عقل اور دانش قبول نہیں کرتی لیکن جس شخص کے ساتھ ایسے سانحے ہو گذرے ہوں، وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آج کے سائنسی دور میں ایسے حادثے کیونکر ہوتے ہیں۔ بچپن میں نانا، نانی اور دادا، دادی بچوں کو ڈرانے کے لئے بھوت پریت، جنّات اور ڈائنوں کے قصّے سنایا کرتے تھے۔ لیکن جب کوئی بندہ اپنی آنکھوں سے حیران کن اور انہونی گھٹنا دیکھے تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا یہ سب ربّی بھید ہیں۔ خدائی راز ہیں یا کچھ اور۔ خالد حسین کے زندگی نامے میں بھی ایسے کچھ واقعات ہوئے ہیں جن کا ذکر کرنا قارئین کی دلچسپی کے لئے ضروری ہے۔ میرا نام محمد فاروق بیگ ہے۔ میں خالد حسین کا سمبندھی ہوں۔ میری بیٹی اُن کے بیٹے کے ساتھ بیاہی گئی ہے اور میں خالد حسین کے ساتھ بیتے اُن حادثوں کا چشم دید گواہ ہوں۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب خالد حسین اُستاد محلے کی اندر والی چھوٹی مسجد کے سامنے محکمہ کسٹوڈین کے الاٹ شُدہ دو کمروں میں رہتے تھے۔ ٹین کی چھت والے کمرے کو انہوں نے رسوئی بنایا تھا اور کوٹھری نما دوسرے کمرے کو سونے کا کمرہ۔ میرا گھر اُن سے بالشت بھر دور تھا، کہ وہ حادثہ ہوا، جس کا میں ذکر کرنے جا رہا ہوں۔ یہ 1967ء کے جولائی مہنے کی بات ہے۔ برسات جوبن پر تھی۔ تب خالد بھائی اور نسیم بھابی کی ایک ہی اولاد تھی یعنی اُن کی بیٹی سمعیہ تبسم جو اُس

وقت دس ماہ کی تھی اور برسات کی جھڑی سات دِن سے لگی ہوئی تھی۔ بارش رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دریائے توی میں طغیانی آ گئی تھی۔ لوگوں کے کچے پکے مکان، کوٹھے اور دیواریں ڈھیہ رہی تھیں۔ پکی چھتوں سے بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ خالد حسین کی کوٹھری پکی اینٹوں سے بنی تھی لیکن چھت لکڑی کی تھی جس پر منوں مٹی ڈالی ہوئی تھی۔ چھت کا شہتیر بہت پرُانا تھا اور کڑیوں کو دیمک لگی ہوئی تھی۔ ایک رات جب خالد حسین، بھابی نسیم اور سمی سوئے ہوئے تھے تو خالد حسین نیند سے جاگ پڑے۔ انھیں لگا کہ کسی نے اُن کی ٹانگ کو بستر سے گھسیٹا ہے۔ اُنہوں نے بجلی جلائی لیکن وہاں سب ٹھیک تھا۔ وہ دوبارہ سو گئے تو کچھ دیر بعد اُن کو نیند میں چھت کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ پھر اُٹھے۔ بجلی کا سوئچ آن کیا لیکن کمرہ بالکل ٹھیک تھا۔ صرف ایک کونے میں پتھر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گرا تھا۔ خالد حسین چھاتہ لیکر چھت پر گئے۔ لگاتار بارش کی وجہ سے چھت پر پانی جمع ہوا تھا۔ انہوں نے ہاتھوں سے پانی نکالا اور نیچے اُتر آئے اور سو گئے۔ ابھی نیند پوری طرح غالب بھی نہیں ہوئی تھی کہ پھر وہ منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ چھت گر گئی ہے۔ خالد حسین نے بھابی نسیم کو اُٹھایا اور فوراً کمرے سے باہر نکلنے کے لئے کہا اور خود سمی بیٹی کو گود میں لے لیا۔ جُوں ہی وہ کمرے سے باہر نکلے اُسی وقت چھت گر گئی۔ ایک بھیانک آواز نے سارے محلے کو جگا دیا اور شور مچ گیا کہ خالد حسین، نسیم فردوس اور سمعیہ تبسم ملبے کے نیچے دب کر مر گئے ہیں۔ سبھی ہمسائے دوڑے تا کہ ملبہ ہٹایا جائے اور اُنھیں نکالا جائے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے کہ خالد حسین، نسیم بھابی اور سمی رسوئی والے کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ پاس پڑوس والوں نے کمرے سے ملبہ باہر نکالا۔ کچھ نوجوان ملبے کو باہر چوک میں پھینکنے لگے۔ بستر اور دیگر سامان برآمدے میں رکھا، اور کمرے کو دھو کر صاف کیا۔ نئے شہتیر اور کڑیاں خرید کر دوبارہ چھت بنائی گئی اور اُس پر مٹی سے لیپ کیا گیا اور اوپر سے ترپال ڈالی گئی تا کہ پانی کمرے کے اندر نہ آئے اور یوں خالد

حسین دوسری رات پھر اپنے ہی کمرے میں سوئے۔ جب میں نے خالد بھائی سے پوچھا کہ بھائی جان یہ حادثہ کیسے ہوا تو اُنہوں نے ساری بات سنائی۔

اسحاق صاحب ایک درویش تھے۔ وہ کشتواڑ کے رہنے والے تھے اور اُن کے والد "شاہ اسرار الدین" درگاہ کے سیوادار تھے۔ نو سال کی عمر میں وہ معذور ہو گئے تھے۔ معذوری کی حالت میں وہ شاہ اسرار الدین کی زیارت میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے اور جب اُنھیں کوئی غیبی بشارت ہوئی تو وہ درگاہ سے باہر آئے اور لوگوں کے دُکھ کم کرنے کے لئے خدمت کرنے لگے۔ وہ کشمیری زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ اُن کا صوفیانہ کلام اپنے مرشد کی شفقت حاصل کرنے کے لئے ہوتا یا حمد یہ نعتیں لکھتے۔ اسی وجہ سے اُن کی دوستی خالد حسین کے ساتھ پڑ گئی۔ وہ خالد بھائی کو اپنا کلام سناتے اور رائے مانگتے۔ خالد بھائی پنجابی، اُردو کے علاوہ کشمیری زبان اچھی طرح سے بول سکتے تھے اور کشمیری شاعری کو سمجھ بھی لیتے تھے۔ خالد بھائی نے للیشوری المعروف للہ ماں اور شیخ نور الدین ولی المعروف نُندرشی کے بیشتر شلوک کشمیری سے پنجابی زبان میں ترجمہ کئے تھے۔ اسی وجہ سے اسحاق صاحب اُن کی عزت بھی کرتے تھے اور محبت بھی۔ اسحاق درویش گرمیوں میں کشتواڑ آجاتے اور سردیاں جموں میں گلشن گراؤنڈ کے پولیس کوارٹروں میں رہنے والے ایک ڈی، ایس، پی، کشمیری پنڈت بھائی دھر صاحب اور اُن کی پتنی اسحاق صاحب کی بہت خدمت کرتے۔ اُنھیں نہلاتے، کپڑے تبدیل کرتے اور پھر لابی میں اُنھیں کرُسی پر بٹھا دیتے جہاں حاجت مند لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہو چکی ہوتی۔ وہ کسی کو پانی دم کر کے دیتے۔ کسی کو کچھ پڑھ کر پھونک مار دیتے، اور یہ معمول کا سلسلہ تھا۔ ایک بار میرے بھائی کی بچی اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ سکول سے کہیں چلی گئیں۔ بچیوں کی عمر آٹھ اور نو سال کے درمیان تھے۔ میری بھابی رو رو کر بین کرنے لگی۔ ہر طرف گھر کے افراد

اور رشتے دار بچیوں کو ڈھونڈنے لگے لیکن اُن کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ جب خالد حسین کو پتہ چلا تو وہ ہماری بھابی اور ماں کو لیکر اسحاق صاحب کے پاس گئے۔ اسحاق صاحب کافی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر بولے "وہ بچیاں بالکل ٹھیک ہیں اور ایک متبرک جگہ پر ٹھہری ہیں۔ تم کل تین بجے آنا انشاء اللہ بچیاں گھر پہنچ جائیں گی" صبح ہوتے ہی ہماری بھابی خالد بھائی سے کہنے لگی کہ وہ اُسے اسحاق صاحب کے پاس لے جائیں۔ خالد حسین اُس کو لیکر اسحاق درویش کے پاس ساڑھے دس بجے پہنچ گئے۔ تو وہ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ اُنہوں نے تین بجے آنے کے لئے کہا تھا۔ آپ لوگ پہلے کیوں آگئے۔ پھر کہنے لگے کہ وہ گاڑی موڑ رہے ہیں۔ وہ اللہ کی پناہ میں ہیں۔ جاؤ گھر جا کر بچیوں کا انتظار کرو۔ یہ تینوں بچیاں پکنک منانے امرتسر گولڈن ٹیمپل گئی تھیں کیونکہ اُن کی سکھ سہیلی نے اُنہیں کہا تھا۔ وہ بچیاں اپنی سکول کی وردی میں تھیں۔ جب وہ گولڈن ٹیمپل پہنچیں تو سیواداروں نے اُن سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہیں۔ جب بچیوں نے بتایا کہ وہ جموں سے ماتھا ٹیکنے اور ارداس کرنے کے لئے آئی ہیں اور جب سیواداروں نے اُن کی پیٹھ پر سکولی بستے بھی دیکھے تو سمجھ گئے کہ بچیاں ماں باپ کو بتائے بغیر آگئی ہیں۔ سیواداروں نے انھیں لنگر میں کھانا کھلایا۔ اور دربار صاحب کے مہمان خانے میں اُنھیں سونے کے لئے کمرہ دیا اور خود اُن کی حفاظت کرنے لگے۔ اُنہوں نے مقامی پولیس کو بھی اطلاع دے دی۔ پولیس کے افسروں نے ان تینوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا لیکن اُنھیں محسوس نہیں ہونے دیا۔ دوسرے دِن اُن کو جموں جانے والی بس میں سیواداروں نے بٹھا دیا اور پولیس والے اپنی جیپ میں بس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایس ایس پی ٹریفک رفیقی صاحب نے لکھن پور سے اُنھیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور ٹھیک تین بجے بچیوں کو اُن کے گھر میں اُتارا۔

خالد حسین کے بچپن کے دوست نصیر احمد میر کا بیٹا جمیل پڑھنے میں بہت تیز تھا۔ ہر

امتحان میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوتا۔ جب وہ بی، اے، فائنل کا پہلا پرچہ دینے کے لئے گیا تو امتحان کے ہال میں سوال نامہ پڑھتے ہوئے وہ اپنے ناخن سے دانت کُھرچنے لگا تو دانت سے خون نکلنے لگا۔ خون اتنا زیادہ بہنے لگا کہ نگران نے ڈاکٹر کو بلا لیا لیکن خون بند نہ ہوا۔ آخر اُسے ہسپتال داخل کرایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اُس کے سارے ٹیسٹ کئے لیکن خون نکلنے کی وجہ یا کسی بیماری کا پتہ نہیں چلا۔ نصیر احمد میرا اپنے بیٹے جمیل کو پی، جی، آئی چندی گڑھ لے گیا۔ وہاں بھی اُس کے سارے ٹیسٹ ٹھیک نکلے۔ امتحان ختم ہوتے ہی اُس کے دانتوں سے خون نکلنا بند ہو گیا لیکن جمیل کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ اگلے سال جب وہ دوبارہ امتحان دینے گیا تو پھر دانتوں سے خون نکلنے لگا۔ جمیل پرچہ دیئے بغیر ہی گھر آ گیا۔ اُسے لیکر نصیر خالد حسین کے پاس آیا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ خالد بھائی اُسے لے کر فوراً اسحاق درویش کے پاس گئے۔ اُس نے پانی سے بھری بوتل منگوائی اور کچھ کلمات پڑھ کر پھونکیں مارنے لگا۔ پھر اُس نے بوتل نصیر احمد کو دیتے ہوئے کہا کہ جتنے دن جمیل کا امتحان جاری رہے گا، اُتنے دِن پانی کی بوتل جمیل کے کمرے میں رہے اور وہ اُسے دیکھ کر امتحان دینے جائے۔ جمیل نے ویسے ہی کیا۔ سارے پرچے اُس نے اطمینان سے دیئے لیکن پہلا پرچہ نہ دینے کی وجہ سے اُسے مذکورہ پرچہ پھر دینا پڑا۔ جب وہ فارغ ہوا تو اسحاق صاحب کی ہدایت کے مطابق اُس نے بوتل کا سارا پانی پی لیا۔ جمیل آج سرکاری ٹیچر ہے۔ شادہ شُدہ ہے اور شاید تین بچوں کا باپ بھی۔

عزیز صاحب ضلع رام بن کی تحصیل گُول کے رہنے والے ایک کامل درویش تھے۔ اُن کے مریدوں میں غلام قادر مغل بھی شامل تھے۔ جو خالد حسین کے دوست تھے۔ جب خالد حسین پونچھ میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے تو اُنہوں نے مغل صاحب سے ہی چارج لیا تھا جو اپنی شرافت اور درویش طبیعت کی وجہ سے پورے پونچھ میں عزت و احترام سے یاد

کئے جاتے تھے۔ وہ اکثر خالد بھائی کو عزیز صاحب کے قصے سنایا کرتے۔ ایک بار غلام قادر مغل عزیز صاحب کو لیکر خالد بھائی کے گھر اُستاد محلے میں تشریف لائے۔ جرنیلی سڑک اور خالد حسین کے مکان کے درمیان ایک پارک ہے جسے نگروٹہ پارک کہتے ہیں۔ جب عزیز صاحب اور مغل صاحب کو پارک کے اندر سے لایا گیا تو وہ کہنے لگے "تم مجھے قبروں پر چلا رہے ہو"۔ خالد بھائی نے جواب دیا، "نہیں سائیں جی! یہ سرکاری پارک ہے۔ قبرستان نہیں ہے تھوڑا آگے چل کر ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جو پارک کی دیوار کے ساتھ بنا تھا اور کہا، "اس مکان کے باتھ روم کے نیچے ایک بزرگ فقیر کی قبر ہے۔ مکان کے مکین اُس قبر کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مکان مالکن کا خاوند اور بیٹے مر چکے ہیں۔ اگر انہوں نے غسل خانہ بند نہیں کیا اور قبر کو بحال نہیں کیا تو اور جانی نقصان ہوسکتا ہے۔ اُسے جا کر سمجھا دو"۔ کھانا کھانے کے بعد خالد حسین نے اُن سے عرض کی کہ وہ گجر نگر والا مکان فروخت کرنے کی کوشش بڑی دیر سے کر رہے ہیں لیکن مکان بِک نہیں رہا، تو عزیز صاحب نے جواباً کہا "کیسے بِکے گا۔ تم نے وہاں درویشوں کی دو قبروں کو اُکھاڑ کر اُن کے کنکال (پنجر) کو دریا میں پھینکوا دیا تھا۔ تم نے اُس مکان میں بڑا عذاب بھی سہا لیکن تمہیں عقل نہیں آئی کہ تمہارے اور تمہارے اہل خانہ کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ تمہاری لاپرواہی اور لاتعلقی نے تمہیں تیزاب میں نہلایا تھا۔ ابھی بھی وہاں ایک پیرو مرشد کی قبر موجود ہے۔ تم مجھے کل وہاں لے چلو۔ میں خود موقع ملاحظہ کروں گا۔" دوسرے دن عزیز صاحب کو لیکر خالد بھائی گجر نگر والے مکان میں گئے۔ عزیز صاحب نے پورے مکان کا جائزہ لیا۔ پھر بیس منٹ والا کمرہ کھولنے کے لئے کہا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ اُنہوں نے وہاں فاتحہ پڑھی۔ اور پھر خالد بھائی سے کہا کہ "Basemant" کو پوری طرح سے دُھو کر صاف کرو اور کھڑکیاں اور دروازہ اُکھاڑ کر دیوار چڑھا دو اور اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دو۔ تمہارا مکان

بک جائے گا۔'' ایسا ہی ہوا۔ ایک مہینے کے اندر اندر مکان فروخت ہوگیا۔ یہ بات سچ تھی کہ بیس منٹ کی کھدائی کے دوران مزدوروں کو دو کنکال ملے تھے ایک مکمل انسانی جسم کا پنجر تھا اور دوسرا آدھا۔ وہ خالد بھائی سے پوچھنے لگے کہ ان کا کیا کرنا ہے تو خالد حسین نے کہا کہ دریا بُرد کر دیں۔ اس بات کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ خالد بھائی کی اہلیہ یا بچوں کو بھی نہیں۔ ایک دِن محلے کے ایک 80 سالہ بزرگ سے جب خالد بھائی نے پوچھا کہ کیا نگروٹہ پارک کبھی قبرستان ہوا کرتا تھا تو اُس بزرگ نے جواباً کہا تھا کہ 1947ء کی شورش میں جب جموں شہر اور گردونواح میں مسلمانوں کا قتل عام جاری تھا تو لوگ ڈر کے مارے ریہاڑی قبرستان کی بجائے اس پارک میں شہیدوں کو دفنانے لگیتھے اور شاید تین سو کے قریب مسلمان یہاں دفن ہیں۔ عزیز صاحب نے جس مکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُس کی مالکن کو کچھ دِنوں کے بعد خالد حسین نے بُلایا اور پوچھا کہ کیا اُن کے گھر میں کوئی موت واقع ہوئی ہے تو وہ کہنے لگی کہ ایک بیٹے نے آگ میں جل کر خودکشی کر لی تھی۔ خاوند سڑک حادثے میں مر گیا تھا اور چھوٹا بیٹا کینسر کے کارن چل بسا۔ خالد حسین نے اُسے عزیز درویش کی بات سنائی تو وہ رونے لگی۔ اُس نے غسل خانہ تڑوا دیا۔ وہاں دوبارہ قبر بنائی اور ہر جمعرات کو وہ وہاں اگربتیاں اور چراغ جلاتی۔ خالد حسین نے اِس قسم کے کئی اور ایسے واقعات بھی دیکھے تھے جن پر اعتبار کرنا نہ دل و دماغ مانتا ہے اور نہ ہی موجودہ سائنس، لیکن جو وہ کہتے تھے وہ بھی حقیقت تھی، جس کو کیسے جھٹلایا جا سکتا تھا۔

کون سُنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش

(مومان خان مومنؔ)

نرک نِو اس

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گذر گئی
دُنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں
(مصطفی زیدی)

ڈاکٹر سادھوسنگھ ہمدرد ایک بڑھیا انسان تھے۔ روزنامہ ''اجیت'' پنجابی کے مالک اور مدیرِ اعلیٰ اور ''اجیت بھون'' جالندھر کے مختارِ کل۔ یاروں کے یار، قوم کے غم خوار اور اچھی شاعری کے پرُستار۔ اُستاد لبھو رام، جوشؔ ملسیانی، نکودری کے ہونہار شاگرد۔ لہٰذا اُستادی شاگردی کا رشتہ حضرتِ داغؔ دہلوی سے جُڑتا تھا۔ داغؔ سکول کے شاگرد، زبان اور بیان کی باریکیاں، سادہ اور خوبصورت لفظوں کے استعمال کا فن خوب جانتے ہیں۔ مزید یہ کہ وزن، بحر یعنی عروض کی طرف خاص دھیان دیتے ہیں۔ شاعری اکثر روایتی اور رومانی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی تخیّل میں بھی جِدّت دِکھائی دیتی ہے۔ سادھوسنگھ ہمدرد اُردو اور پنجابی میں شعر گوئی فرماتے تھے۔ اخبار کے دفتر میں شام چھ بجے تک اخبار نویسی کرتے اور پھر ''اجیت بھون'' میں شعر و سخن کی محفل ہوتی۔ جس میں اُن کے گورو بھائی اور شاگرد اپنا فصیح کلام پیش کرتے۔ سامعین میں خالد حسین حاضر خدمت ہوتے اور آخری شاعر تک سماعت کا حوصلہ رکھتے لہٰذا ہمدردؔ صاحب کے منظورِ نظر بن گئے تھے۔ پھر جب خالد حسین جموں و کشمیر سرکار کے عوامی رابطہ افسر بن کر جالندھر آئے تو ملاقاتوں کے سلسلے میں مزید گرم جوشی آ گئی۔ اُن دِنوں ہمدردؔ صاحب کے تعلق سے ایک لطیفہ بہت مشہور ہوا۔ لطیفہ یوں سُنایا جاتا تھا کہ ایک بار ہمدردؔ

صاحب کو دِل کا دورہ پڑا۔ اُنھیں فوری طور پر ہسپتال میں داخل کرایا گیا، وہ بے ہوش تھے اُن کے شاگرد اور دوست فکر مند تھے۔ کیونکہ اُن کے فرزندِ ارجمند برجندر ہمدرد (جو والد کی فوتگی کے بعد روزنہ اجیت '' کے مدیر اعلیٰ بنے اور جو خوبصورت دِل اور دماغ کے انسان ہیں) اخباری کاغذ کا کوٹا بڑھانے کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔ اُنھیں اطلاع دی جا چکی تھی اور وہ دہلی سے جالندھر کے لئے روانہ بھی ہو چکے تھے۔ دوستوں کو یہ فکر لاحق تھی کہ برجندر ہمدرؔد کے آنے تک سادھو سنگھ ہمدرؔد جی کو کیسے زندہ رکھا جائے۔ آخر ایک شاعر دوست اور ماہر نفسیات نے یہ ذمے داری قبول کی کہ برجندر کے آنے تک وہ ہمدرؔد صاحب کو مرنے نہیں دیں گے۔ وہ ہسپتال کے اُس خصوصی کمرے میں گیا جہاں ہمدرد جی بے ہوش پڑے تھے۔ اُس نے کمرہ بند کیا اور ہمدرؔد صاحب کے بستر پر بیٹھ گیا اور اُن کے ہاتھ اور ماتھا چوم کر اُن کی شاعری کی تعریف کرنے لگا اور اُن کے کچھ رٹے رٹائے اشعار بھی سنانے لگا۔ ہمدرد صاحب کے جسم مبارک میں معمولی سی ہلچل ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔ '' آپ جیسا شاعر مائیں کبھی کبھی ہی پیدا کرتی ہیں۔ آپ اردو شاعری کے میرؔ ہیں اور پنجابی کے وارث شاہ فقیر ہیں'' اپنی تعریفیں سن کر ہمدرد صاحب نے آنکھیں کھولیں اور اُسے بٹھانے کے لئے کہا۔ دوست شاعر نے اُنھیں بٹھایا اور تکیے پیٹھ اور سر کے پیچھے رکھتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ داغؔ سکول کی شان ہو۔ پنجابی قصہ گو ہاشم، قادر یارؔ اور مقبل آپ کے سامنے گھروِنچی بھی نہیں ہیں جس پر آپ کی عارفانہ شاعری کی گاگر رکھی جا سکے۔ اس لئے گذارش ہے کہ کچھ سنایئے تاکہ روح کی پیاس بُجھ سکے، دوست شاعر نے ہمدرد صاحب کو اُن کی بیاض پیش کی اور ہمدرد صاحب اپنا کلام سنانے لگے۔ دوست واہ واہی کرتا رہا، مکرّر کی گردان پڑھتا رہا۔ صبح جب برجندر نے کمرے کا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا کہ اُن کے باپو جی ہشاش بشاش ہیں اور کم بخت شاعر دوست بے ہوش بستر پر پڑا ہوا تھا۔ واہیگورو ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرؔد کو سورگ میں جگہ دے

تا کہ وہ وہاں بھی اپسراؤں کو اپنا کلامِ بلاغت سناتے رہیں۔

ہمدرؔد صاحب سے جُڑے لطیفے کو بیان کرنے کا مقصد کا یہ بتانا تھا کہ خالد حسین کے ساتھ بھی بالکل اسی نوعیت کا حادثہ 1973ء میں ہو گذرا تھا۔ مختصر تفصیل یوں ہے کہ خالد حسین اور ہر بھجن سنگھ ساگر امرتسر میں کل ہند پنجابی کانفرنس میں شمولیت کرنے کے لئے گئے تھے۔ وہاں خالد حسین کے دوست اور پنجابی کے مشہور ناول نگار موہن کاہلوں کانفرنس میں مل گئے۔ وہ ان دِنوں ویرکہ میں ریلوے کی پٹری کے قریب اپنے مکان میں رہتے تھے۔ اُن کی بیوی دِیپ موہنی اور بٹیا پال (جو بنگال کیڈر کا آئی، اے، ایس افسر تھا اور اب ریٹائر ہو گیا ہے) کہانیاں لکھتے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ موہن کاہلوں بھائی نے بڑے خلوص اور محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو رات گذارنے کے لئے اور جشن یاراں منانے کے لئے ویرکہ چلنے کی دعوت دی۔ دونوں دوست موہن کاہلوں کے خلوص سے انتہائی متاثر ہوئے اور اُن کے ساتھ ویرکہ چلے گئے۔ پہلے چائے پی گئی۔ چائے کے بعد موہن کاہلوں کے شہرہ آفاق ناولوں 'بیڑی تے برتیا''، ''مچھلی اِک دریا دی'' اور گوری ندی دا گیت'' پر بات چیت ہوتی رہی۔ موہن کاہلوں اور ساگر نے دو دو پیگ پیئے۔ پھر بھابی دیپ موہنی نے کھانا پروسا۔ کھانا کھانے کے بعد کاہلوں نے اپنے نئے ناول کا ایک باب پڑھ کر سنایا۔ پھر بھابی دیپ موہنی نے اپنی نئی کہانی سنائی۔ پال بیٹے کو نیند سے جگا کر اُسے اپنی انگریزی نظم سنانے کے لئے کہا گیا۔ پھر موہن کاہلوں نئے ناول کا دوسرا باپ پڑھنے لگا۔ خالد حسین اور ساگر حدِ ادب کے مارے بے بسی اور بے کسی کی مورت بنے رہے۔ آخر ہر بھجن سنگھ ساگر نے خالد حسین سے کشمیری میں کہا کہ اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک چکا ہے۔ نیند نے اُس پر یلغار کر دی ہے لہٰذا خالد حسین ہُوں ہُوں کرتا رہے تا کہ وہ سو سکے۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ خالد حسین ہُوں ہُوں کرتے کرتے خود بھی ہُوں نُما خراٹے لینے لگا۔ صبح جب خالد

اور ساگر بیدار ہوئے تو موہن کاہلوں کو بتائے بغیر وہاں سے کھسک آئے۔ ویر کہ سے امرتسر کی بس پکڑی اور ڈاکٹر کلبیر سنگھ کانگ کے گھر پہنچے جو پنجابی میں بڑے خوبصورت انشائیے لکھتے تھے۔ اُن دونوں کی حالت دیکھ کر کانگ صاحب بولے ''لگتا ہے رات موہن کاہلوں کے ہاں گذاری ہے۔ تم دونوں کی آنکھیں سرُخ ہیں اور سُوجن صاف دِکھائی دے رہی ہے۔''

خالد حسین نے کہا کہ ''بالکل ایسا ہی ہے۔ رات کاہلوں صاحب اپنے گھر لے گئے تھے اور ہم نے جو رات وہاں گذاری ہے وہ ہم پر بہت بھاری ہے۔''

ڈاکٹر کلبیر سنگھ کانگ نے پھر پوچھا، ''موہن کاہلوں نے اپنا نیا ناول سنایا ہوگا؟ دیپ موہنی نے کہانیاں سنائی ہوں گی اور پال پُتر نے انگریزی نظمیں سنائیں ہوں گی۔'' کانگ صاحب نے اپنی بیگم کو آواز دی اور دونوں کی شکلیں دِکھاتے ہوئے کہا کہ اِن کے لئے ناشتہ بناؤ۔ بیچارے صبح سے بُھوکے ہیں۔ موہن کاہلوں نے ان کی حالت خراب کر دی ہے۔ کانگ صاحب کی دھرم پتنی نے خالد اور ساگر کو ناشتہ کھلایا اور پھر وہ سو گئے۔ یہ یادگاری واردات خالد حسین یاروں کی محفل میں مزے لے لے کر سنایا کرتا تھا۔

ایک اور اہم حادثے کا ذکر کرنا ضروری ہے تا کہ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو ہوشیار کیا جا سکے۔ پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام بلونت سنگھ ہے اور بیبا بلونت میرا قلمی نام ہے۔ میں ایک آرٹسٹ اور شاعر ہوں۔ خالد حسین اور میں ''ناگ منی'' فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''ناگ منی'' میگزین میں میری۔ نظمیں چھپتی تھیں اور خالد حسین کی کہانیاں۔ آج ہماری دوستی کو 48 سال کا عرصہ ہوا ہے۔ اب جس حادثے کا میں ذِکر کرنے لگا ہوں، وہ چنڈی گڑھ سے شروع ہوا جہاں خالد حسین، ڈاکٹر سوشیل شرما، ہربھجن سنگھ ساگر اور میں عالمی پنجابی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے گئے تھے۔ کانفرنس پنجاب یونیورسٹی کے

آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ ہم سب کی رہائش کا انتظام یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ کانفرنس میں پاکستان سے تقریباً 80 ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے شمولیت کی تھی۔ تین روزہ کانفرنس میں پاکستانی پنجابی ادیبوں کے ساتھ خوب موج مستی رہی۔ کانفرنس کے آخری روز ہمارا ایک شاعر دوست ''کھوجی کافر'' بڑا جذباتی ہو گیا اور ہم چاروں کو اپنے گھر رات گذارنے کی دعوت دینے لگا۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ اچھے بھلے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہیں۔ کل یہاں سے ہی جموں کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن کھوجی کافر بضد تھا ہمیں اپنے گھر روپڑ لے جانے کے لئے۔ کیونکہ اُس نے نیا مکان بنایا تھا جو وہ ہمیں دِکھانا چاہتا تھا۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ ہم چندی گڈھ میں ہی رُکیں لیکن وہ نہ مانا۔ اُس پر مہمان نوازی کا بھوت سوار تھا۔ آخر ہم نے اُس کی دعوت قبول کر لی اور اُس کے ساتھ روپڑ والے مکان میں آ گئے۔ گیٹ پر سنگ مرمر کی پلیٹ پر لکھا تھا ''نرک نواس''۔ مکان کے دوسرے گیٹ پر لِکھا تھا ''یم راج کی کچہری'' اور دیوار کے آخری کونے پر لِکھا تھا ''زندہ لوگوں کا قبرستان''۔ اِن عنوانات کو پڑھ کر کھوجی کافر خالد حسین کو ''جادوگرسیاں'' نظر آنے لگا۔ جب مکان کے اندر ہم نے قدم رکھے تو معلوم ہوا کہ یہ مکان یقیناً ''نرک نواس'' ہے۔ کتابیں کمروں میں بکھری ہوئیں۔ گرد و غبار سے کمرے اَٹے ہوئے۔ دیواروں پر جالے لگے ہوئے۔ چھپکلیاں ایک دیوار سے دوسری دیوار پر دوڑ رہی تھیں۔ ہر کمرے میں شراب کی خالی بوتلیں اُلٹی سیدھی پڑی تھیں۔ رسوئی گھر میں جوٹھے برتنوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ کمروں میں بچھے بستروں پر دُھول جمی ہوئی تھی اور ایک شخص شراب میں مدہوش خراٹے لے رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ مذکورہ شخص ''نرک نواس'' کا مینجر بھی ہے۔ رسویا بھی اور نوکر بھی۔ کھوجی کافر نے لات مار کر اُسے جگایا اور کچھ رقم دے کر بازار بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تازہ سبزی، دال، انڈے، نمکین اور کھارے سوڈے کی چھ بوتلیں

لے کر آ گیا۔ ہم دارُو پیتے رہے اور کھوجی کافر اپنے قصّے، کہانیاں اور بے وزن شاعری سُناتا رہا۔ رسویا رسوئی میں گیس جلا کر اور سبزی چُولہے پر رکھ کر نیز انڈے اُبال کر دارو والے کمرے میں آ گیا۔ ایک پلیٹ میں نمکین اور دوسری پلیٹ میں انڈے میز پر رکھتے ہوئے اُس نے اپنا گلاس بھی میز پر رکھ دیا اور اُس میں شراب ڈالنے لگا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تین چار پیگ اندر کئے۔ تین چار انڈے کھائے اور پھر رسوئی میں چلا گیا۔ وہ کھانا بھی پکا رہا تھا اور گلاس خالی ہونے پر کمرے میں آ کر پھر پیگ بنا کر چلا جاتا۔ شراب کی دو بوتلیں تھیں۔ کھوجی کافر اور منیجر رسوّیا خیر سے ڈیڑھ بوتل پی گئے۔ باقی کی آدمی بوتل ساگر، سوشیل اور میرے حصے میں آئی۔ خالد حسین اور اُس کا ڈرائیور باہر لان میں بیٹھ کر نرک نواس کے حدودِ اربعہ کے بارے میں غیر دانش مندانہ باتیں کرتے رہے اور پیپسی کے گھونٹ حلق میں اُتارتے رہے۔ رات دس بجے کھانے کا بگل بجا اور کھانا پروسا گیا۔ ڈرائیور اجے کمار نے اپنی اور خالد حسین کی پلیٹ کو ایک بار پھر دھویا کہ کہیں کوئی شرابی جراثیم آج کے کورونا کی طرح خاموشی سے اثر انداز نہ ہو جائے۔ کھانے کے بعد جب ہم سونے کے لئے پلنگوں پر بچھے بستروں میں گئے تو ہائے توبہ اور کراہنے کی ہلکی ہلکی آوازیں ہر کمرے سے آنے لگیں۔ بستروں میں کیڑیوں نے مورچے سنبھالے ہوئے تھے اور مچھر ڈراؤن حملے کر رہے تھے۔ بچاؤ کا کوئی سامان نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی باہر جائے پناہ۔ کھوجی کافر اور رسوئیے کے سُور خراٹے مشین گن سے چلنے والی گولیوں کا بھیانک منظر پیش کر رہے تھے۔ سب سے پہلے خالد حسین کا ڈرائیور اپنے صاحب کے پاس آیا اور فریاد کی کہ یہاں سے چلا جائے۔ سونا محال ہے۔ کیڑیوں کا جنجال ہے۔ مچھروں نے کیا بُرا حال ہے۔ پورا جسم لال ولال ہے۔ پھر ہر بھجن ساگر اور سوشیل بھی اُٹھ کر خالد حسین کے کمرے میں آ گئے۔ ہم سب نے جلدی میں دلیرانہ فیصلہ لیا۔ کپڑے پہنے نرک نواس کا گیٹ کھولا۔ کار کو

دھکا دے کر گیٹ سے باہر نکالا۔ سامان ڈِکی میں ڈالا، گیٹ بند کیا اور رات کے ایک بجے شیر شاہ سوری مارگ پر کار کو فراٹے بھرنے کیلئے کہا۔ راستے میں دو جگہ رُک کر چائے پی گئی تاکہ ڈرائیور اجے کمار پر نیند غالب نہ ہو جائے۔ وہ بیچارہ کار چلاتا رہا اور خالد حسین اُسے باتوں میں لگاتا رہا۔ ٹھیک 6 بجے صبح کار پٹھانکوٹ بس اڈے میں داخل ہوئی۔ مجھے اتارا گیا اور گورداسپور جانے والی بس میں بیٹھایا گیا اور 8 بجے تک سبھی نرک نواسی اپنے اپنے سورگ نواس میں پہنچ گئے۔ نرک نواس کا قِصہ بھی خالد حسین چٹخارے لے لے کر سُنایا کرتا۔ وہ یادوں کے دُکھ بانٹنے والا انسان تھا۔ واہیگورو سے میری ارداس ہے کہ سچے بادشاہ خالد کو ''سورگ نواس'' عطا کرے۔

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
(فراق گورکھپوری)

بیگانے بنگلے میں خالد دیوانہ

اللہ رے چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اِک کو گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
(اصغر گونڈوی)

ڈاکٹر دیویندر سنگھ کے ساتھ میری جان پہچان اُن دِنوں سے تھی جب وہ گورونانک دیو یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کر رہا تھا۔ پی، ایچ، ڈی، ڈاکٹر بننے کے بعد وہ جموں یونیورسٹی کے پنجابی شعبۂ میں بطور لیکچرار منتخب ہوگیا۔ اُس وقت پنجابی شعبہ کے صدر ڈاکٹر کرتار سنگھ سُوری، ریڈر ڈاکٹر دھرم پال سنگھل اور ڈاکٹر دلجیت سنگھ لیکچرار تھے۔ جموں اور کشمیر کے پنجابی ادیبوں نے ڈاکٹر دیویندر سنگھ کا بھرپور سواگت کیا۔ وہ شروع میں ڈاکٹر دلجیت سنگھ کے ساتھ بی، سی روڈ پر بنے سرکاری فلیٹ میں رہنے لگا لیکن جلد ہی وہ کرائے کے مکان میں منتقل ہوگیا۔ دیویندر سنگھ پنجابی ادب سے شغف بھی رکھتا تھا اور خود بھی انشائیے لکھتا تھا اور کبھی کبھی تنقید پر بھی ہاتھ صاف کرلیا کرتا۔ وہ اکثر جموں کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتا۔ تخلیقات پر اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتا، اور مقامی ادیبوں اور دانشوروں سے میل ملاپ رکھتا۔ ڈاکٹر کرتار سنگھ سُوری کے جانے کے بعد ڈاکٹر دھر پال سنگھل پنجابی ڈیپارٹمنٹ کا صدر بن گیا اور دلجیت سنگھ ریڈر، پھر ان کے ساتھ بلدیوراج گپتا پٹیالے سے اور شرن کور جموں سے جڑ گئے۔ بلدیوراج ریڈر تھا اور شرن کور لیکچرار۔ بعدازاں پنجابی افسانہ نگار بھوپندر سنگھ سُودن بھی شعبہ میں آ گیا۔ بلدیوراج گپتا یوں تو لسانیات کا پروفیسر تھا لیکن

لسانیات کے بارے میں اُس کی جانکاری پرائمری سکول ٹیچر سے زیادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر دھرم پال سنگھل اور دیویندر سنگھ کی وجہ سے پنجابی ڈیپارٹمنٹ میں ادبی سرگرمیاں ہونے لگیں۔ پنجابی زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر سمینار کرائے جاتے۔ خالد حسین اور دیویندر سنگھ کی شامیں اکثر اکٹھی گذرتیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے راز دار اور دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے۔
ایک دِن ڈاکٹر دیویندر سنگھ اپنے ایک ریسرچ اسکالر راجوندر سنگھ (جو آجکل جرمنی میں رہتا ہے) کے ساتھ خالد حسین کے گھر اُستاد محلے میں آیا۔ اُن کے ساتھ ایک جوان لڑکی اور لڑکا تھے۔ لڑکے کا نام سکھدیو سنگھ تھا اور لڑکی کا راج کور۔ وہ دیویندر سنگھ کی طالبہ تھی جو پنجابی ایم، اے کے فائنل ائر میں تھی۔ وہ دونوں گول گجرال کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر دیویندر سنگھ نے بتایا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن دونوں کے ماں باپ اس رشتے کے لئے راضی نہیں ہیں۔ اسی لئے دونوں گھر سے بھاگ آئے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ایک دو راتوں کے لئے یہ تمہارے پاس رہیں گے۔ ذرا خیال رکھنا۔ دیویندر سنگھ نے کہا کہ اُسے خالد حسین کا گھر ہی سب سے زیادہ محفوظ لگا۔ اس لئے ان کو یہاں لے آیا۔ برسات کے دِن تھے اور خالد حسین کے بیوی بچے اپنے گاؤں دھونہ لاٹی گئے ہوئے تھے۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا خالد حسین نے اُس عاشق معشوق جوڑے کو اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ اُن دِنوں خالد کی مالی حالت انتہائی خستہ تھی۔ اُس نے اپنے دوست ناصر قریشی سے پانچ سو روپئے اُدھار لئے اور بازار گیا۔ دلہن کا تیار شدہ جوڑا، نئی سینڈل، نقلی زیور، رنگدار چوڑیاں اور سندور خرید کر لایا۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ وہ دلہن والا لال جوڑا پہن لے اور بالوں میں سندور لگا لے۔ اگر کوئی اُسے پوچھے تو کہے کہ وہ جالندھر سے ہنی مون منانے کے لئے کشمیر جا رہے تھے، لیکن ناشری میں پسیاں گرنے کی وجہ سے سری نگر کا راستہ بند ہے، اس لئے یہاں آ گئے کیونکہ سُکھ دیو کے

بڑے بھائی مشہور کہانی کار جسونت سنگھ وِردی خالد صاحب کے دوست ہیں اور وِیر جی نے کہا تھا کہ اگر کوئی مشکل آ گئی تو خالد حسین سے بات کر لینا۔ اس لئے ہم یہاں آ گئے۔

دوسرے دِن ڈاکٹر دیویندر سنگھ اور راجوندر سنگھ گھبرائے ہوئے خالد حسین کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ان دونوں کو اپنے گھر سے نکال دو کیونکہ لڑکی کے بھائی اور رشتے دار تلواریں لیکر انھیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔ تمہارے لئے مصیبت بن جائے گی۔ اُن کی آنکھوں میں لُہو اُترا ہوا ہے۔ ہم نے بڑی مشکل سے جان بچائی ہے کیونکہ وہ ہم پر شک کر رہے ہیں۔ جواب میں خالد حسین نے کہا کہ اب یہ ''طوطا مینا'' اُس کی حفاظت میں ہیں۔ وہ چلے جائیں۔ دوسرے دِن فجر کی اذان کے وقت خالد حسین اُن کو لیکر امرتسر جانے والی بس میں چڑھ گیا۔ امرتسر پہنچ کر وہ پنجابی ماہنامہ ''لو'' کے دفتر میں گیا جہاں میرا اور خالد کا دوست مرحوم پرمندر جیت میگزین اڈیٹ کرنے کے ساتھ رہائش بھی رکھتا تھا، لیکن پرمندر جیت کا دفتر بند تھا۔ پھر وہ اُن دونوں کو لیکر میرے پاس پریت نگر آ گیا۔ میرا نام مختار رگل ہے۔ میں نے اور خالد حسین نے اپنا ادبی سفر لگ بھگ ساتھ ساتھ شروع کیا تھا۔ پریت نگر میں میرا مکان ادبی آوارہ گردوں کا مسکن تھا۔ خالد حسین کے علاوہ پورے پنجاب سے دوست احباب پریت نگر میں میرے مہمان اور کبھی کبھی وبالِ جان ہوتے۔ خوب خرمستیاں ہوتیں۔ ڈاکٹر کرنیل سنگھ شیر گل، فوٹو گرافر ہربھجن باجوہ، پرمندر جیت، جوگندر کیروں، گل چوہاں اور دلبیر چیتن کیلئے میرا گھر منورنجن سنٹر تھا۔ ادیب اور شاعر راتیں گذارتے، دارو پیتے، اپنی شاعری اور کہانیاں سناتے، دھمال مچاتے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ میں نے سکھدیو کو ''چوگانواں'' سے پریت نگر مٹاڈور چلانے کی نوکری دلوا دی اور اُس لڑکی کو مقامی پرائمری سکول میں ٹیچر لگوا دیا۔ پھر میں نے گوردوارے کے گرنتھی صاحب سے کہا کہ وہ ان دونوں کی شادی کرا دیں۔ لیکن وہ لڑکی

کہنے لگی کہ اُس کی خواہش ہے کہ یہ کارج دربار صاحب ہرمندر صاحب میں ہو۔ میں امرتسر آیا تو پرمندر جیت سے بات کی۔ اُس نے ماہنامہ 'لو'' کے مالک امریک سنگھ امنؔ سے بات کی جو فرینڈس سائیکل کمپنی کا مالک تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ وہ دل کا شہنشاہ تھا اور ادیب دوستوں کی خدمت کرنا باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ جب اُسے بتایا گیا کہ خالد حسین اِیک عاشق جوڑے کو چھوڑ کر گیا ہے تو اُس نے اُن کو امرتسر بُلالیا۔ سکھدیو کو اپنی فیکٹری میں سٹور کیپر بنادیا اور اُس لڑکی کو سیلز گرل۔ اُس نے لڑکی سے راکھی بندھوائی اور اُسے اپنی بہن بنایا۔ اُن کے رہنے کے لئے کرائے کا مکان لیکر دیا اور اُس میں ہر وہ چیز مہیا کی جو ایک گھر گھرہستی چلانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ دو مہینے کے بعد بعد خالد حسین جب امرتسر گیا تو دیکھا کہ سکھدیو اور اُس لڑکی کی تو کایا پلٹی ہوئی تھی۔ وہ خوش ہوگیا کہ اُس کے دوستوں نے اُن دونوں کو سنبھال لیا۔ پرمندر جیت اور امریک امن خالد حسین سے شکایت کرنے لگے کہ جب بھی وہ اُن کی شادی کی بات کرتے ہیں اور ''لانواں پھیرے'' لینے کے لئے کہتے ہیں تو وہ لڑکی معاملے کو ٹال دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تھوڑا وقت انتظار کریں، وہ اپنے ماں باپ کو منالے گی۔ لیکن اُنھیں دال میں کچھ کالا دِکھتا ہے۔ خالد حسین نے اُس لڑکی کو سمجھایا کہ اس طرح اکٹھے رہنا پاپ ہے۔ اس لئے جلدی شادی کرلیں۔

دو تین مہینے کے بعد جب خالد حسین دوبارہ امرتسر آیا تو ہم سب اُس پر ٹوٹ پڑے۔ اور مسلے بھائی کو ڈھیر ساری شدھ پنجابی گالیوں کا گلقند کھلایا۔ خفگی سے نہیں بلکہ پیار کی شکر گھول کر کیونکہ اُس معصوم کو طوطا مینا کی اصل کہانی کا پتہ نہیں تھا اور وہ بے قصور تھا۔ ہم بھی اُسی کی طرح نرمل اور نرچھل (صاف) دِل کے مالک تھے۔ لہٰذا جذبات میں آکر سماج سے بغاوت کرنے والے اس جوڑے پر قربان ہوگئے۔ صدقے اور واری جانے لگے۔ ہم اُن کی شادی کروا کر اِس قصے کو حتمی انجام تک پہنچانا چاہتے تھے لیکن وہاں معاملہ ہی کچھ

اور تھا۔ امرتسر کی ایک لڑکی جموں میں بیاہی گئی تھی۔ وہ اُس لڑکی کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ امرتسر میں اُس کا مائیکہ اُسی مکان کے قریب تھا۔ جہاں سُکھدیو اور وہ لڑکی رہتے تھے۔ ایک بار دونوں کی ملاقات ہوگئی تو امرتسر والی لڑکی نے اُس کی ماں کو سکھدیو اور اُس کا اتا پتہ بتادیا۔ ماں بیٹی کا رابطہ ہوا اور ماں نے بیٹی کو سختی سے منع کیا کہ وہ ''لانواں پھیرے'' ہرگز نہ لے۔ ایک دِن لڑکی کی ماں امرتسر پہنچ گئی اور موقع دیکھ کر اپنی بیٹی کو لیکر جموں چلی آئی۔ جموں آتے ہی ماں باپ نے اپنی بیٹی راج کور کی شادی چندی گڈھ کے قریب ایک گاؤں کے لڑکے کے ساتھ کرادی۔ میرے اور پرمندر جیت کے کُریدنے پر سکھدیو حرامی نے بتایا کہ وہ لڑکی یعنی راج کور اُس کی سگی موسی تھی۔ ہم نے سکھدیو کی خوب چھترول کی۔ واہیگورو کا شکر ہے کہ ہم سے یہ گناہ ''سرزد نہیں ہوا اور نہ ساری عمر ہم شرمندگی کی آگ میں جلتے رہتے۔ اس سب کے باوجود خالد حسین ہمارا پیارا دوست تھا اور مرتے دم تک وہ ہماری آنکھوں کا تارا بنا رہا۔ ہم اُس کی کہانیاں اور مضامین بڑے شوق سے پڑھتے۔ پرمندر جیت کی ادارت میں شائع ہونے والے جرائد ''لئو'' اور ''اکھر'' میں اُس کی کہانیاں لگاتار چھپتی تھیں۔ محفلوں میں بیٹھ کر اُس کے لطیفے ہمیں خوابوں کی دُنیا میں لے جاتے۔ بے شک وہ اُدھمپور میں پیدا ہوا تھا اور جموں میں پلا بڑھا تھا لیکن اُس کی رُوح ہمیشہ پنجاب میں بھٹکتی رہتی تھی۔ اُس آوارہ رُوح کو ہم سب کی پیار بھری شردھانجلی (عقیدت)۔

مسلم ہوں پر خود پہ قابو رہتا ہے
میرے اندر بھی ایک ہندو رہتا ہے
(لیاقت جعفری)

اندر باہر مٹی کا گھر

مذہب کو کوئی لے لے بدلے میں مجھے دے دے
تہذیب سلیقے کی انسان قرینے کا
(نامعلوم)

مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکومت میں جموں اور کشمیر کے سکولوں میں بچوں کو مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ پانچویں جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے بچوں کو اُن کے دھرم کے مطابق سرکاری سکولوں میں پنڈت اور مولوی ٹیچر دینی تعلیم دیتے تھے۔ خالد حسین کو یاد تھا کہ جب وہ گورنمنٹ سنٹرل سکول پرانی منڈی جموں میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا تو اُس کو مولوی محمد اکبر دینی تعلیم پڑھاتے تھے۔ جس کے لئے ایک پیریڈ مخصوص ہوتا تھا۔ اس عمل سے بچوں کو مذہب کی بنیادی باتوں کے علاوہ اخلاقی درس دیا جاتا تھا۔ زمانہ قدیم اور اُس کے بعد مغلوں کے دورِ حکومت میں بھی دینی مکتب، مدرسے اور پاٹھ شالائیں ہوتی تھیں۔ جن کا انتظام مندروں کے پجاریوں اور مسجدوں کے امام صاحبان کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ ہمارے برصغیر کے سنت اور صوفی درویش اِنہی پاٹھ شالاؤں اور مدرسوں سے پڑھ کر نکلے تھے اور پھر انہوں نے پیار، محبت، اخوت، انسان دوستی، امن اور شانتی کے دیپ سارے برصغیر میں جلائے تھے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد ہندوستان نے عوام کی حاکمیت اور سیکولرازم کا راستہ اپنایا۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر چلنے اور اُس کا پرچار کرنے کی آزادی دی، لیکن اس میں چیک اینڈ بیلنس (Check and

(balance کا کوئی شفاف طریقہ وضع نہیں کیا گیا۔ اکثر لوگوں نے دھرم کے نام پر امن، شانتی کے بدلے بدامنی اور نفرت پھیلائی۔ چھل فریب کے ایسے ایسے تماشے دکھائے جانے لگے کہ انسانیت شرم سار ہونے لگی۔ ویسے تو ہمارا ملک مذہبی رواداری اور برابری کی پالیسی پر چلنے کا دعوے دار ہے لیکن دیش کی آزادی کے بعد جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں، اُن میں اس بات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ مسلمان، دلّت، براہمن، راجپوت، جٹ، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب اور ذاتوں کے لوگوں کی اکثریت جن علاقوں میں ہو، وہاں اُسی قوم، دھرم یا ذات سے تعلق رکھنے والے امیدوار کو کھڑا کیا جائے تاکہ وہ اُسی آدھار پر الیکشن جیت سکے، اور یہ کام بھارت کی سبھی سیاسی پارٹیاں کرتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سیکولرازم اور مذہبی غیر جانبداری اور رواداری کے باوجود ہم نے اپنے اندر، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ اور ہریجن کو زندہ رکھا ہے اور انسانیت کا گلا گھونٹا ہے۔ نسلی اور فرقہ واریت کے اژدھے کو ہم نے مرنے نہیں دیا۔ دلتوں اور درجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لئے تعلیمی میدان میں اور نوکریوں میں خصوصی کوٹے اِس لئے مقرر کئے گئے تھے تاکہ اِن پسماندہ اور پچھڑے طبقوں کو سماج میں اُن کا حق دیا جائے اور ذات پات کی خلیج کو پُر کرنے کی کوشش کی جائے لیکن انتخابات کی سیاست نے اسے اپنا ووٹ بنک بنا ڈالا۔ آئین ہند میں یہ سہولت ایک خاص مدت کے لئے دی گئی تھی لیکن حکمران اپنے سیاسی مفادات کے لئے اس کی مدت بڑھاتے گئے اور خصوصی کوٹے میں مزید اضافہ کرتے رہے۔ حد تو یہ ہے کہ 55-50 فیصد سرکاری نوکریاں تو یہ خصوصی کوٹے (Reserve category والے ہی لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان مخصوص کوٹے والوں کے لئے پرموشن میں بھی کوٹہ رکھا گیا ہے۔ اِن اقدامات نے بھارتی سماج میں اقتصادی اور معاشی بے چینی پیدا کر دی ہے اور غیر جانبداری اور برابری کے ترازو کا تول ہی بگاڑ دیا ہے۔ جس

کی وجہ سے بھارت میں مذہب، ذات، قبیلہ اور نسل کے آدھار پر فرقہ دارانہ فسادات، عام بات ہوگئی ہے۔ مزید برآں مذہبی جنون میں جب سیاست کا تڑکا لگتا ہے، تو سکھ، ہندو، عیسائی اور مسلمان ...... دہلی، کانپور، ممبئی اور گجرات جیسے کئی شہروں میں موت کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ برصغیر کے بٹوارے کے بعد لاکھوں انسان مذہب، ذات اور عقیدے کی وجہ سے مذہبی فسادات کی سولی چڑھ چکے ہیں، لیکن ہمارے نام نہاد مولانا، سنت سوامی، گرنتھی، پجاری اور پادری سب آگ بجھانے کی جگہ آگ بھڑکانے کا کام کرتے ہیں۔ فسادات کا تانڈو اور اُس سے ہونے والے جانی اور مالی نقصانات کا میں چشم دید گواہ ہُوں۔ میرا نام کیول کرشن کپور ہے اور میں پونچھ کا رہنے والا ہوں۔ میں ٹیچر بھرتی ہوا تھا اور چیف ایجوکیشن افسر کے طور پر سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوا۔ میں خالد حسین کو بہت نزدیک سے جانتا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی تھی جب وہ پہلی بار ضلع پونچھ کے پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی، اے بن کر آئے تھے۔ پھر وہ دوبارہ 1990ء میں پونچھ کا اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ تعینات ہوا۔ اور تیسری بار 1999ء میں ڈپٹی کمشنر پونچھ لگایا گیا۔ اپنی پونچھ تعیناتی کے دوران خالد حسین نے کئی ادبی اور کلچر پروگرام کروائے۔ میں اُن کی ادبی اور تمدنی سرگرمیوں میں ہمیشہ شامل رہا۔ بطور ضلع ترقیاتی کمشنر وہ جب بھی مختلف علاقوں کے دورے پر جاتا تو میں اور جہانگیر میر (سابقہ ڈپٹی چیئرمین لجسلیٹو کونسل) اُس کے ساتھ ہوتے جہاں وہ عوامی بہبود کے لئے کئے جانے والے ترقیاتی کاموں کا معائینہ کرتا۔ اُن دِنوں اُگرواد سے پورا ضلع متاثر تھا لیکن خالد حسین لوگوں کی دِل جوئی کرتا۔ فوتگی والے گھروں میں تعزیت کے لئے جاتا۔ خالد حسین صاف گو اور بے باک طبیعت کا مالک تھا مُنہ پر آئی بات برملا کہنے کا عادی۔ وہ اس بات کے لئے دکھی رہتا کہ پون صدی گزرنے کے باوجود بھی ہمارا ملک صحیح معنوں میں سیکولر نہیں

بن سکا بلکہ مذہبی جنون نے تو لوگوں، خاص کر دلِت اور اقلیتی طبقہ کی زندگی اجیرن بنادی ہے۔ کبھی بیف کے نام پر لوگوں کو پیٹ پیٹ کر ہلاک کیا جاتا ہے اور کبھی غداری کے الزام میں لیکن قانون بے بس ہو چکا ہے، اُس کو لاگو کرنے والے آنکھیں اور کان بند کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیف کا کاروبار کرنے والے اور گوشت کو ڈبوں میں بند کر کے فروخت کرنے والے سبھی سلاٹر ہاؤس مالکان ہندو ہیں لیکن شامت بیچارے غریب مسلمان کی آجاتی ہے، جس نے ایک آدھ کلو گوشت اپنے کھانے کے لئے خریدا ہو اور وہ بھی بھینسے کا۔ سرکار گئو ہتیا روکنے کے لئے قانون کیوں نہیں بناتی جبکہ سب سے زیادہ شور حکمران جماعت والے ہی کرتے آئے ہیں لیکن گئو ماتا کے جیالے قانون بنانے کے لئے کوئی سنجیدگی نہیں دکھاتے۔ کیونکہ اٹھارہ ہزار کروڑ کا بیف بھارت دُنیا کے مختلف دیشوں کو سپلائی کرتا ہے اور برازیل سے بھی آگے نکل چکا ہے۔ یہ دوغلا پن اقلیتی فرقہ پر قہر بنکر ٹوٹتا ہے۔ لو جہاد دوسرا فتنہ کھڑا کیا گیا ہے۔ آئین میں دی گئیں ضمانتیں سب خاک میں مل چکی ہیں اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا قانون چل رہا ہے۔ اور یہ سب فرقہ وارانہ سوچ کا کرشمہ ہے۔ لیکن حیرت اِس بات پر ہوتی ہے کہ بڑے بڑے ہندو لیڈروں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی بیٹیاں اور بہنیں مسلمانوں سے بیاہی گئی ہیں اور مسلمان لیڈروں کی بیٹیاں ہندو لڑکوں کی بیویاں ہیں۔ وہاں تو لوّ جہاد کا فساد کھڑا نہیں کیا جاتا لیکن اگر کوئی غریب مسکین عاشق جوڑا شادی کرتا ہے تو دین اور دھرم خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ایسے ایسے فتنے ایجاد کئے جارہے ہیں جنہیں مہذب دُنیا ہرگز قبول کرنے کو تیار نہیں ہے اور اس کی وجہ سے ملک کا عکس انتہائی خراب ہو رہا ہے۔ گو کہ تعلیمی معیار، ہنرمندی اور ٹیکنالوجی میں ہمارے دیش نے دُنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے لیکن اس کے باوجود لوگ مندروں، مسجدوں، گوردواروں اور کلیساؤں کی اندھی کوٹھریوں میں قید ہیں۔ دھرم کے نام پر کسی کے ساتھ بھی زیادتی کی جاسکتی ہے۔ کسی

کو بھی exploit کیا جاسکتا ہے۔ اُنھیں قتل کیا جاسکتا ہے۔ گھر جلائے جاسکتے ہیں۔
مندروں، مسجدوں اور دیگر مذہبی عبادت گاہوں میں بم پھینکے جاسکتے ہیں۔ خودکش حملے
کرائے جاسکتے ہیں اور یہ کام کرانے والے خاصے پڑھے لکھے مذہبی اور سیاسی چالباز
ہوتے ہیں۔ کم سن بچوں کو ورغلایا جاتا ہے۔ اُن کے دماغوں میں مذہبی اور طبقاتی نفرت
کے کیڑے بھرے جاتے ہیں۔ خالد حسین اِس بات سے بھی نالاں تھا کہ مسلمانوں میں کم
علمی اور جہالت کی وجہ سے لوگ الگ الگ مسلکوں میں تقسیم ہوکر ایک دوسرے پر کفر کے
فتوے صادر کرتے رہتے ہیں جبکہ قرآن میں کسی فرقے یا مسلک کا ذکر تک نہیں ہے۔
شیعہ، سنی کا معاملہ بھی ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوا یعنی آنحضرتؐ کی وفات کے
بعد۔ اسی طرح 1906ء سے پہلے کوئی اہلحدیث نہیں تھا۔ 1896ء سے پہلے کوئی بریلوی
نہیں تھا۔ 1867ء سے کوئی دیوبندی نہیں تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ برصغیر ہند میں
اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں یہ مسلک پیدا ہوئے۔ اسی طرح احمدیہ 1889ء میں۔
250 ہجری سے کوئی حنبلی نہیں تھا۔ 200 ہجری سے پہلے مالکی اور شافعی نہیں تھا اور 150 ہجر
ی سے پہلے کوئی حنفی اور جعفری نہیں تھا۔ یہ سب مدارس کے جید عالم اساتذہ اور اماموں کی
طرف سے قرآن پاک کی الگ الگ تفسیروں اور احادیثِ نبویؐ کے مطالب بیان کرنے کی
وجہ سے ہوا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے تو خود کو نبی تک کہہ دیا۔ اِن تفرقات کی وجہ سے مسلم
اُمّہ تقسیم اور کمزور ہوئی۔ نیز انتہا پسندی نے جہاد کے معنی ہی بدل دیئے۔ خودکش بمبار اور
مجاہدوں کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے لیکن خود اُن کے اپنے بچے کبھی بھی
ایسے جہاد کا حصہ نہیں بنے کیونکہ اُن کے والدین اُن کو مجاہدوں والی جنت میں بھیجنا نہیں
چاہتے۔ خالد حسین کم علم مولویوں اور اُن کی طرف سے بنائے گئے مدرسوں سے مایوس تھا۔
وہ چاہتا تھا کہ امام مسجد کے لئے لازم ہے کہ وہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم یافتہ بھی

ہو یعنی اُس کے پاس سائنسی اور دیگر علوم کی بھی سند ہو۔ کم از کم بی۔اے، پاس ہو اور دیگر مذاہب کی بھی جانکاری رکھتا ہو تاکہ منبر پر چڑھ کر جب وہ واعظ دے تو اُس کی گفتگو میں عقل مندی اور دانشوری جھلکے۔ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے فرائض بتانے کے علاوہ جدید علوم کی بھی بات کرے۔ دُنیائے سیاست پر بھی قوم کی صحیح رہنمائی کرے اور مسلمان کس طرح اپنا مستقبل روشن بنا سکتے ہیں اور ٹیکنالوجی میں کس طرح دوسری قوموں کے ہم پلہ بن سکتے ہیں، اُس کے بارے میں بھی رہبری کرے۔ مسلمانوں کو درس دے کہ زیادہ بچے وبال جان ہوتے ہیں۔ زیادہ اولاد پیدا کرنے سے گھر میں کبھی خوشحالی نہیں آسکتی۔ اس لئے دو یا تین بچے پیدا کریں تاکہ اُن کی پرورش اس طریقے سے کرسکیں کہ وہ خوشحال زندگی گزار سکیں۔ خالد حسین نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ اوقاف اسلامیہ جموں کا ایڈمنسٹریٹر تھا تو وہ مساجد میں امام لگانے کے لئے اُمیدواروں کا تحریری امتحان لیتا تھا۔ عربی کے ساتھ ساتھ ہندی، اُردو اور انگریزی کے چند جملے بھی لکھواتا تھا لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ کوئی بھی اُمیدوار اس امتحان میں پورا نہیں اُترتا تھا۔

جب خالد حسین پونچھ میں ڈپٹی کمشنر تھا تو اُس نے دیکھا کہ ہر قصبے اور دیہات میں مدرسے چل رہے ہیں جن میں بچوں کو صرف عربی پڑھائی اور رٹائی جارہی ہے۔ لورن، منڈی، سورن کوٹ، مینڈھر اور پونچھ وغیرہ علاقوں میں چل رہے مدارس میں سرکاری تعلیمی نصاب بالکل بھی نہیں پڑھایا جاتا۔ پونچھ میں مولانا غلام قادر صاحب نے ایک وسیع وعریض عمارت میں مدرسہ کھولا تھا جس میں تقریباً چھ سو بچے دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دوسری جگہوں پر بھی صرف حافظِ قرآن بنانے کا معاملہ تھا۔ ایک بار خالد حسین کو عبداللہ پُل کے پار والے مدرسہ میں سالانہ تقریب کی صدارت کے لئے دعوت دی گئی جہاں قرآن حفظ کرنے والے حافظوں کی دستار بندی کی جانی تھی۔ کاروائی شروع ہوئی تو سب سے

پہلے ایک بچے کو قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے لئے بلایا گیا۔ اُس بچے نے قرأت میں قرآن پاک کا ایک سپارا زبانی پڑھا۔ جب وہ جانے لگا تو خالد حسین نے اُسے روک کر کہا کہ جو قرآنی آیات پڑھی گئی ہیں اُس کا اُردو، ہندی یا اپنی مادری زبان میں ترجمہ بھی سناؤ تاکہ پڑھی گئی آیات کا مطلب سمجھ سکوں۔ اُس بچے نے جواب دیا کہ اُسے صرف قرآن زبانی یاد کرایا گیا ہے۔ وہ انکا ترجمہ نہیں جانتا۔ خالد حسین نے اپنے صدارتی خطبے میں منتظمین کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی بھرپور کلاس لی اور حکم دیا کہ بچوں کو ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھایا جائے تاکہ اُن کو قرآنی تعلیم کی سمجھ بھی ہو، اور وہ دینی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے انسانی بھلائی کے لئے ایک مثالی رول ادا کر سکیں۔ خالد حسین نے مدرسے کے مہتمم سے کہا کہ وہ اپنے مدرسے میں دینی تعلیم کے علاوہ سرکاری تعلیمی نصاب دو مہینے کے اندر اندر پڑھانے کا بندوبست کرے۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، حساب اور ہندی پڑھانے کے لئے اساتذہ بھرتی کرے۔ وہ دو مہینے کے بعد تمام مدرسوں کا معائینہ کرے گا اور اگر اُس کے احکامات پر عمل نہ ہوا تو مدرسے بند کر دے گا۔ اُس نے اس مقصد کے لئے ایک سرکلر (گشتی چٹھی) بھی جاری کیا۔ جس میں سرکاری نصاب پڑھانا لازمی قرار دیا گیا۔ اس حکم نامہ پر سب سے پہلے مولانا غلام قادر صاحب نے عمل کیا۔ اُنہوں نے اچھے اُستاد بھرتی کئے۔ سرکاری نصاب لاگو کیا اور کمپیوٹر بھی لگوائے۔ خالد حسین نے کئی بار میرے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ بھارت میں دلت، آدی واسی اور مسلمان تعلیمی، سماجی اور معاشی طور پر بچھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے سرکار کو دسویں جماعت تک ان کے لئے تعلیم مفت کر دینی چاہئے مسلمانوں کی پسماندگی اور غربت کو دور کرنے کے لئے جہاں منتخب سرکاروں نے کبھی سنجیدگی نہیں دکھائی وہاں مسلم ممبران پارلیمنٹ اور اسمبلی برابر کے قصوروار ہیں۔ مسلمانوں کے نام نہاد نمائندوں نے مسلم سماج کی

پسماندگی اور بدحالی دور کرنے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی۔ سرکاروں نے بھی اس بدحال طبقے کو ہندوستانی سماج میں برابری کی سطح پر لانے کے لئے کوئی مثبت قدم نہیں اُٹھایا۔ مسلمان صرف ووٹ بنک بن کر رہ گیا۔ مسلم لیڈر ہمیشہ سے مسلم ووٹوں کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتے آرہے ہیں۔ اور غیر مسلم ان کا استحصال کرتے آرہے ہیں۔ ایسے ماحول کا بنیاد پرست عناصر فائدہ اُٹھاتے ہیں اور دہشت گردی کا ایک کارن یہ بھی ہے۔

خالد حسین نے پونچھ کے حالات اور مدرسوں میں دی جارہی تعلیم کے بارے میں اس وقت کے ریاستی سرکار کے کمشنر امور داخلہ ڈاکٹر سُدھیر سنگھ بلوریہ جی سے بات کی۔ اُن کی ہدایت کے مطابق خالد نے ایک تفصیلی رپورٹ اپنی سفارشات کے ساتھ بلوریہ صاحب کو بھیج دی۔ رپورٹ میں خالد حسین نے لکھا تھا کہ مدرسوں میں زیادہ تر یتیم اور غربت کی سطح سے نیچے رہنے والے طبقے کے بچے صرف دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کے منتظمین بچوں کے لئے رہائش، کپڑا اور خوراک کا مفت بندوبست کرتے ہیں جس کے لئے مخیر حضرات سے چندہ بھی لیا جاتا ہے۔ یہ ایک قابل تعریف قدم ہے لیکن مدرسوں میں سرکاری نصاب یا نئے دور کی فنی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس لئے ان مدرسوں میں سرکاری تعلیمی نظام لاگو کیا جائے۔ اِن اداروں کو سرکار باقاعدہ رجسٹر کرے۔ بچوں کے امتحانات سرکاری سکولوں کے نصاب کے مطابق ہر سال لئے جائیں۔ مساجد میں مولوی تعینات کرنے کے لئے کم سے کم تعلیمی قابلیت بی۔اے پاس قرار دی جائے۔ ملک کے نامور اسلامی اداروں کو ضابطے کے مطابق یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ مولوی عالم، مولوی فاضل اور بی۔اے پاس طلبا کو دوسرے مذاہب سے متعلق معلوماتی کتابیں اور دیگر مضامین بھی پڑھائے جائیں، لیکن ایم۔اے کی پڑھائی یا پی ایچ۔ڈی کرنے کے لئے مسلم طلباء کو اسلامیات کے مضامین پڑھنے کی اجازت ہو۔ خالد حسین نے یہ سفارش بھی

لکھی کہ بھارت کے غریب اور مفلس مسلم بچوں کے لئے دسویں جماعت تک تعلیم مفت کردی جائے جو ماں باپ اپنے بچوں کوسکول داخل نہ کرائیں اُن کے لئے جرمانے کی سزا مقرر کی جائے۔ پھر چاہے مسلمانوں کو ریزرویشن نہ بھی ملے تو کوئی پرواہ نہیں۔ مسلم بچوں کے لئے پروفیشنل کالجوں میں داخلے کے امتحانات کے لئے مفت کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔ جس ملک کی دوسری بڑی آبادی ناخواندہ اور معاشی بدحالی میں زندگی گزار رہی ہو وہ ملک کیسے ترقی یافتہ بن سکتا ہے۔ مسلمانوں کی حالتِ زار جاننے کے لئے سرکار نے جتنے بھی کمیشن بنائے۔ اُن کی رپورٹوں کے مطابق مسلمان ہندوستان میں سب سے زیادہ پسماندگی اور ناخواندگی کا شکار ہیں، لہٰذا سرکاروں کو راج دھرم نبھاتے ہوئے اُن کی مفلسی اور بدحالی دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جناب سدھیر سنگھ بلوریہ نے خالد حسین کی رپورٹ بھارت سرکار کی ہوم منسٹری کو بھیج دی۔ کچھ مہینوں کے بعد دہلی سے آئی۔ بی کے ایک جوائنٹ ڈائریکٹر اپنے ساتھی کے ساتھ چار سیٹ والے چھوٹے جہاز میں پونچھ آئے اور خالد حسین کی پیش کردہ رپورٹ اور سفارشات کے حوالے سے تفصیلی بات چیت کی۔ کچھ سالوں بعد متذکرہ بات چیت کا نتیجہ شاید یہ نکلا کی سچر کمیٹی بنائی گئی۔ اُس کی سفارشات کو بھارت سرکار نے مان لیا اور مسلم بچوں کے لئے اعلیٰ تعلیمی اور تکنیکی اداروں میں داخلہ لینے کے لئے مفت کوچنگ کا بندوبست کیا گیا لیکن سچر کمیشن کی بہت سی سفارشات ابھی بھی ٹھنڈے بستے میں پڑی ہیں اور موجودہ حکومت شاید ان کو لاگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ مرکزی سرکار کو کچھ انقلابی قدم دوسرے مذہبی اداروں کے بارے میں بھی اُٹھانے چاہئے تاکہ ملک کا ماحول بدلے۔ نفرت اور بے اعتمادی دور ہو۔ اُس کا کہنا تھا کہ حکومت سکولوں اور کالجوں کے تعلیمی نصاب میں سنتوں اور صوفیوں کا کلام ضروری مضمون کے طور پر پڑھائے تاکہ بنیاد پرستی اور کٹر واد پر لگام لگ سکے۔ خالد حسین

کی یہ بھی خواہش تھی کہ سرکار ریزرویشن پالیسی پر بھی نظرثانی کرے جو کہ اس وقت فقط دلت، بچھڑی ذاتوں اور درجہ فہرست قبیلوں تک محدود ہے۔ جس کی وجہ سے غریب سورن ہندوؤں میں غُصہ پنپ رہا ہے کیونکہ کہیں کہیں تو اُن کی حالت ہریجنوں اور مسلمانوں سے بھی بدتر ہے۔ جن کے کارن سماجی ڈھانچہ تفرقے کا شکار ہے۔ اس لئے ریزرویشن کی کوئی آخری حد، کوئی حتمی مدت مقرر کرنا لازمی ہے۔ ورنہ دیش میں ریزرویشن کے خلاف لوگ سڑکوں پر بھی آسکتے ہیں۔ خالد حسین کے وچاروں کے ساتھ میں بھی اتفاق کرتا ہوں کیونکہ بے انصافی کسی بھی طبقے کے ساتھ ہو، اُس کے منفی نتیجے ضرور نکلتے ہیں۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
(غالبؔ)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

تم تکلّف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
(احمد فراز)

میرا نام کمل دیپ سنگھ ہے۔ میں نے جموں یونیورسٹی سے پنجابی ادب میں پی۔ ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور میرے مقالے کا عنوان تھا ''پنجابی کہانی کے بیانیے کا مطالعہ''۔ میں کالج لیکچرار ہوں اور پنجابی ادب پڑھاتا ہوں۔ میں نے قبلہ خالد حسین کو پڑھا ہے۔ اُن کی کئی کہانیوں کا ترجمہ دیگر زبانوں میں کیا ہے۔ میں نے ان کی محاورے دار زبان اور ضرب المثل جملے اور شاعرانہ بیانیے کا لطف اُٹھایا ہے۔ میری رائے میں وہ پنجابی کے ایک ایسے افسانہ نگار تھے، جن کی دو سطریں پڑھ کر ہی قاری جان لیتا ہے کہ یہ خالد حسین کی تحریر ہے۔ چاہے اُن کا نام نہ بھی دیا گیا ہو۔ بابا خالد کی خودنوشت کو قارئین تک پہنچانے کے لئے میرا بھی یوگ دان ہے۔ اس خودنوشت کو جب میں ترتیب دے رہا تھا تو قبلہ خالد حسین کی بڑی بیٹی ڈاکٹر سمعیہ تبسم نے مجھے اُن کے کچھ غیر مطبوعہ خاکے اور انشائیے دیئے جو اُن کی الماریوں میں پڑے تھے جو خالد صاحب نے اپنے اُن دوستوں اور خیر خواہوں کے بارے میں لکھے تھے جو اُن کی زندگی میں اہمیت رکھتے تھے۔ یہ مختصر انشائیے بھی قبلہ خالد حسین کی آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کچھ انشائیے قارئین کی جانکاری کے لئے پیش خدمت ہیں:

شیخ غلام رسول:

شیخ غلام رسول صاحب آئی۔اے۔ایس، ریٹائرڈ چیف سیکرٹری وممبر قانون ساز کونسل سے میری پہلی ملاقات تب ہوئی جب وہ ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے کمشنر تھے۔ اور 1971ء میں ایک کہانی ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' لکھنے پر انہوں نے مجھے معطل کردیا تھا۔اُس کہانی میں محکمہ قانون کے اُس وقت کے سیکریٹری غلام شاہ کی جنسی خرمستیوں کا ذکر تھا۔مجھ پر الزام تھا کہ میں نے بغیر اجازت ایک فحش آرٹیکل لکھا ہے۔جبکہ میرا کہنا تھا کہ یہ افسانہ ہے آرٹیکل نہیں۔ ریاستی سرکار نے ایک کمیشن بنایا۔نومہینوں کے بعد کمیشن کی رپورٹ میں مجھے بری قرار دیا گیا اور مجھے بحال کردیا گیا۔ ایک دِن شیخ غلام رسول صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ ''دریا میں رہنا ہوتو مگر مچھ سے بیر نہیں رکھتے۔تم اچھا لکھتے ہو۔تمہاری قلم میں دم ہے۔ اس لئے اپنی قلم کو اچھائی کے لئے استعمال کرو۔دوسروں کی نجی زندگی میں جھانکنا چھوڑ دو۔دوسروں کے عیبوں پر نظر رکھنے کی بجائے اپنی خامیوں کو تلاشو اور مثبت رویہ اپناؤ۔آج کے سماجی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں لکھو۔دِل کو چھو لینے والے موضوعات پر قلم اُٹھاؤ۔اور اپنے لئے کوئی اچھی سی پوسٹ دیکھو جہاں تمہیں تعینات کردیا جائے۔'' میں اُس وقت ''ماہنامہ دیہات سُدھار'' کا نائب مدیر تھا اور مشہور اُردو افسانہ نگار نور شاہ اُس ماہنامہ کا مدیر۔ایک دِن شیخ غلام رسول صاحب نے مجھے پھر اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ محکمہ منصوبہ بندی میں ایک مُترجم کی آسامی خالی ہوئی ہے۔اُس کے لئے درخواست دو۔میں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عرضی دے دی۔انٹرویو کمیٹی کے چیئرمین خود شیخ صاحب تھے اور انہوں نے مجھے چُن لیا۔جب مرزا محمد افضل بیگ صاحب 1975 میں وزیر بنے تو اُنھیں ایک ایسے پرسنل اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو انگریزی اور اُردو کے علاوہ جموں اور کشمیر کی مقامی زبانیں بھی

جانتا ہو۔ چنانچہ سیکریٹری کلچرل اکادمی محمد یوسف ٹینگ کی نشاندہی پر شیخ غلام رسول صاحب نے مجھے بیگ صاحب کا پی۔اے بنادیا۔ 1978ء میں شیخ صاحب نے ہی مجھے ترقی دے کر ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کا مُدیر اور نور شاہ صاحب کو ڈپٹی ڈائریکٹر پنچایت بنایا۔ شیخ غلام رسول صاحب کے ہاتھوں سے ہی میرا بلاک ڈیولپمنٹ افسر بننے کا آرڈر جاری ہوا کیونکہ کمشنر محمود الرحمن صاحب اُسی روز کسی دوسرے محکمہ میں تبدیل کردیئے گئے تھے۔ شیخ غلام رسول صاحب کے ہاتھوں سے ہی میری بحیثیت اے۔سی۔ ڈی ڈوڈہ تعیناتی کا آرڈر جاری ہوا۔ انہوں نے ہی بحیثیت چیف سیکرٹری میری اِنڈکشن کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس میں کی اور مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر اسسٹنٹ جموں تعینات کیا۔ اُنھیں میرے ساتھ دِلی لگاؤ تھا۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اُنھیں اس بات کا بڑا احساس تھا کہ میرا اسارا خاندان 1947ء میں شہید کردیا گیا تھا اور یتیمی اور مسکینی کے باوجود میں نے بی۔اے (آرنز) کیا تھا، اور صحافت میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا تھا۔ کئی بار وہ مجھے بُلا کر افسر شاہی کے گُر سکھاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ شیخ غلام رسول صاحب میرے گاڈ فادر ہیں اور مجھے فرش سے عرش پر پہنچانے والے ایک فرشتہ صفت انسان۔ شیخ صاحب مذہبی رسوم کے پابند ایک نیک رُوح شخصیت ہیں۔ غریب پرور، رشتوں کو عزت دینے والے۔ دوران سروس اُنھوں نے ہندو اور مسلمان میں کبھی تفریق نہیں کی۔ جموں یا کشمیر کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ جو بھی آیا، اُس کی مدد کی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریاست کے ہر طبقے میں مقبول تھے۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، ان کی نوازش اور محبت کا صدقہ ہوں۔ ایسی نیک روحیں دُنیا میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لئے قابل احترام ہوتی ہیں۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد قانون ساز کونسل کے ممبر بھی رہے اور آج کل فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ اُنھیں صحت وتندرستی بخشے اور اولاد کا سکھ نصیب کرے۔

تالاب تو برسات میں ہوجاتے ہیں کم ظرف
باہر کبھی آپے سے سمندر نہیں جاتا
(اعجاز رحمانی)

مولانا محمد سعید مسعودی:

مسعودی صاحب شیخ محمد عبداللہ کے دیرینہ ساتھی تھے اور شخصی راج کے خاتمے اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں میں ایک ایسے مجاہد تھے جنہوں نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک چلانے کے لئے شیخ محمد عبداللہ کا بھرپور ساتھ دیا حالانکہ وہ پرنس آف ویلز کالج جموں میں عربی کے لیکچرار تھے۔ شخصی حکومت کے خلاف 13 جولائی 1931ء سے جو تحریک شروع ہوئی تو شیخ صاحب کے قریبی ساتھیوں اور عام لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ مولانا محمد سعید مسعودی اور مرزا محمد افضل بیگ شیخ صاحب کے دو بازو اور سیاسی دماغ ہیں اور یہ بات سچ بھی تھی۔ اسی لئے لوگ اُنہیں مفکرّ کشمیر اور فخر کشمیر کہتے تھے مولانا مسعودی غیر کشمیری تھے اور کرناہ کے رہنے والے تھے اور پہاڑی (پوٹھواری) بولنے والے لوگوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی مستقل سکونت گاندربل میں اختیار کرلی تھی۔ جن غیر کشمیری لیڈروں نے شخصی راج کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا، اُن میں مولانا مسعودی ایک بلند پایہ لیڈر تھے۔ جب شیخ محمد عبداللہ نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے مشورے پر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تو مولانا مسعودی کو نیشنل کانفرنس تنظیم کا جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ نیشنل کانفرنس کا ترانہ بھی مولانا مسعودی نے ہی لکھا تھا، جس کے بول ہیں:

لہرا اے کشمیر کے جھنڈے
طفل و جوان و پیر کے جھنڈے

ہر سُو لہرا ہر دم لہرا
لہرا اے کشمیر کے جھنڈے

جب 1953 میں وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو ملک سے غداری کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو اُن کے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ اور کئی دیگر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ مولانا مسعودی کو بھی قید میں رکھا گیا۔ وہ بھی لگاتار دس سال تک یعنی 1964 تک جیل میں بند رہے۔ جب 1964ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے شیخ محمد عبداللہ کو پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ساتھ کشمیر مسئلہ پر حتمی بات چیت کرنے کے لئے راولپنڈی بھیجا تو اُس وفد میں مولانا محمد مسعودی بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ یہاں یہ بات لکھنے میں شاید کوئی قباحت نہیں ہے کہ کشمیری مسلم لیڈر شپ جموں کے مسلم لیڈروں کو برابری کا درجہ نہیں دیتی تھی جس کی وجہ سے کئی بار وہ آپس میں ہی اُلجھ پڑتے۔ غیر کشمیری، خاص کر جموں کے لیڈران کا جھُکاؤ مسلم کانفرنس کی طرف تھا جو پاکستان سے الحاق کے حق میں تھی۔ جبکہ کشمیری لیڈر شپ شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس کے ساتھ مکمل طور پر جڑی ہوئی تھی۔ مولانا محمد سعید مسعودی حالانکہ نیشنل کانفرنس کے ایک مضبوط ستون تھے لیکن غلام محمد شاہ (گل شاہ) اور مرزا محمد افضل بیگ اُن کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پارٹی کی اندرونی مخالفت کی وجہ سے مولانا مسعودی نے سیاست سے ہی کنارہ کشی کرلی اور گاندربل میں اپنے گھر خاموشی سے زندگی گزارنے لگے لیکن جب بھی شیخ صاحب یا نیشنل کانفرنس کسی مشکل حالات سے گزرتی تو مسعودی صاحب سے صلاح مشورہ ضرور کیا جاتا۔

1977ء میں مولانا مسعودی نے اپنی سیاسی زندگی کا بدترین فیصلہ لیا اور اس محاورے کو سچ کر دکھایا کہ "سیانا کوّا ڈھیر پر جا بیٹھتا ہے" وہ مرکزی وزراء بابو جگجیون رام اور چوہدری چرن سنگھ کے بہکاوے میں آکر دوبارہ سیاست میں آگئے اور جموں کشمیر جنتا پارٹی کے

سرپرست بن گئے۔ مرکزی سرکار نے مولانا محمد سعید مسعودی کو شیخ محمد عبداللہ کے مدمقابل ایک چیلنج بنا کر کھڑا کیا تا کہ انتخابات میں مولانا کا نام اور شخصیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔ مولانا مسعودی نے خود تو چناؤ نہیں لڑا لیکن جنتا پارٹی کے اُمیدواروں کے لئے مولوی فاروق کے ساتھ مل کر انتخابی جلسوں میں حصہ لیا جو جنتا پارٹی کے مقامی صدر تھے۔ جنتا پارٹی کے سارے اُمیدوار چناؤ میں ہار گئے ماسوائے عبدالرشید کابلی کے، اور شیخ محمد عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس دو تہائی اکثریت سے پھر اقتدار میں آ گئی اور شیخ صاحب تیسری بار برسر اقتدار آ گئے۔ اس آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کی وجہ سے مسعودی صاحب کو شرمندگی اُٹھانا پڑی اور وہ اپنے گھر گاندربل میں قید ہو کر رہ گئے کیونکہ نیشنل کانفرنس جماعت اُن کے خلاف ہوگئی تھی۔ 1977ء کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور مولانا مسعودی کے ذاتی تعلقات بھی ختم ہو گئے۔ لیکن جب پردھان منتری اندرا گاندھی نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار گورنر جگموہن کے ذریعے برخاست کروادی تو مادرِ مہربان بیگم اکبر جہاں اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو لیکر مسعودی صاحب کو ملنے گاندربل گئیں۔ دونوں ماں بیٹے بھارت سرکار کی غیر جمہوری کاروائی اور خاص کر شریمتی اندرا گاندھی کے وطیرے کی وجہ سے دل برداشتہ، مایوس اور اُداس تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا کہنا تھا کہ کانگریس سرکار نے کبھی بھی کشمیریوں کے جمہوری حقوق کو تسلیم نہیں کیا۔ مادرِ مہربان بیگم عبداللہ نے مولانا مسعودی سے مرحوم شیخ محمد عبداللہ اور پارٹی کے رویے کے لئے افسوس کا اظہار کیا اور پُرانی باتیں بھُول جانے کی استدعا کرتے ہوئے مولانا سے گزارش کی وہ فاروق عبداللہ کو نصیحت کریں کہ وہ کس طرح کٹھن سیاسی اُلجھن کو سلجھائے۔ براہِ مہربانی اِس کی مشکل کشائی کریں۔ مولانا مسعودی نے ڈاکٹر فاروق صاحب سے یہ الفاظ کہے تھے:

''جب 1953ء میں محترم شیخ محمد عبداللہ کی سرکار مرکز نے برخاست کردی تھی اور

اُنھیں گرفتار کرلیا تھا تو اُس وقت لوک سبھا میں شیخ صاحب کے حق میں صرف دو ممبران پارلیمنٹ نے احتجاج کیا تھا، ایک میں تھا اور دوسرا اشوک مہتہ، لیکن آج صورتِ حال یکسر تبدیل ہے۔تمہارے حق میں 147 ممبرانِ پارلیمنٹ نے مرکزی سرکار کے فیصلے کے خلاف زوردار آواز اُٹھائی ہے۔اس لئے میری تمہیں یہی نصیحت ہے کہ اِس ٹیمپو (لہر) کو برقرار رکھو۔'' یہ بات مجھے مولانا مسعودی صاحب نے خود سنائی تھی جب میں 1985ء میں اُن کو ملنے گاندربل گیا تھا۔ایک گھاس کی چٹائی (بگُو) پر بیٹھا درویش جیسا شخص اون کا لمبا چوغہ پہنے (کشمیری فِرن) مجھے شیخ صاحب، بیگ صاحب، بخشی صاحب، غلام محمد صادق، شیام لعل صراف اور دُرگا پرشاد دھر کی سیاسی عیاری، مکاری اور ہوشیاری کی کہانیاں سنا رہا تھا۔مولانا کشمیر کی آزادی کے لئے کی جانے والی جدوجہد کا جیتا جاگتا کردار تھے لیکن اُنہوں نے کشمیر مسئلے یا اپنے رفقا کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جبکہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔اللہ اُنھیں غریق رحمت کرے ۔

ہاں! میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے
(ساغر صدیقی)

چوہدری تاج محی الدین:

تاج میرے بچپن کا جگری دوست ہے۔اُس کے والدِ محترم چوہدری خُدا بخش ڈوگرہ حکومت میں جموں وکشمیر سٹیٹ آرمی کے سالار تھے۔اُن کے اجداد پاکستانی پنجاب کی تحصیل شکر گڈھ کے رہنے والے تھے اور وہاں سینکڑوں ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ بریگیڈئر خدا بخش کے دادا نے کٹھوعہ میں ایک پورا چک خریدا اور وہاں آ کر رہنے لگے۔اس

چک کا نام ''چک سونا نوپا'' تھا۔ کالی بڑی، ڈپٹی کمشنر کٹھوعہ، ڈگری کالج کٹھوعہ، پولیس کا ہیڈکوارٹر اور کئی دیگر دفاتر اور کرن نگر کالونی، اسی چک والی زمین پر بنے ہیں جو 1947ء کے بعد خاتمہ چک داری قانون کے تحت اس خاندان سے چھین لی گئی تھی۔ چوہدری خدا بخش ریاستی فوج میں لفٹین بھرتی ہوئے تھے جب وہ کرنل بنے تو اُن کو دوسری عالمی جنگ میں حصہ لینے کے لئے بھیجا گیا جہاں اُنہوں نے مصر اور عراق کے محاذ پر انگریز بٹالن کی کمانڈ کی تھی اور اُس ڈویژن کا جرنیل لارڈ منٹگمری تھا۔ اُن کو ''آرڈر آف برٹش ایمپائر'' ملا۔ خان بہادر کا خطاب اور ملتان میں جاگیر بھی ملی۔ وہ ریاستی فوج کے سالار بن کر ریٹائر ہوئے ان کی پہلی شادی اپنے ننھیال شکر گڈھ میں ہوئی تھی اُس شادی سے اُن کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور بیٹی۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد قبلہ خدا بخش صاحب نے دوسری شادی ایک کشمیری خاتون سے کی جس کا تعلق کشمیر کے ایک معزز ''میر'' خاندان سے تھا۔ اُس کے تین بھائی ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے۔ جن میں میر ظفر اللہ ریاست کے چیف سیکرٹری اور بعد ازاں مرکزی سرکار میں سیکرٹری اگریکلچر رہے۔ دوسری بیوی سے قبلہ خدا بخش صاحب کے بارہ بچے تھے۔ ماشاء اللہ سارے کے سارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے عہدوں پر براجمان رہے۔ تاج محی الدین اُن کی چھٹی اولاد تھی۔ بریگیڈئر صاحب کی کشمیر میں بہت بڑی جائیداد تھی۔ باغات اور دھان کی زمین وغیرہ، جس کی وجہ سے تاج کا بچپن اور جوانی خوشحالی میں گزری۔ ہمارا گھر بٹہ مالو باراں پتھر میں تھا اور ہم تاج محی الدین کے ہمسایہ تھے۔ چوہدری خدا بخش کے مکان اور جرنیلی سڑک کے پار کمیٹی باغ ہوا کرتا تھا۔ جہاں میں اور تاج دیگر دوستوں کے ساتھ ہاکی کھیلتے۔ ہم دونوں بہت شرارتی تھے اور اکثر اپنے دوستوں کو تنگ کیا کرتے۔ بچپن میں تاج کو جیب خرچ کے لئے ایک معقول رقم ملتی تھی جبکہ مجھے موری والا تانبے کا ایک پیسہ۔ وہ اپنے جیب خرچ سے دوستوں کو چنے،

موٹھ، ٹافیاں وغیرہ کھلاتا، اور جوانی میں ہم دوستوں کو ''کافی ہاؤس'' لے کر جاتا جو ریزیڈنسی روڈ کی شناخت تھا۔ وہاں کافی کی چسکیوں پر دوستوں کی محفلیں جمتیں۔ خوب گپ بازی ہوتی اور یہ روز کا معمول تھا۔ تاج محی الدین شاہ خرچ تھا اور سخاوت اُس کی فطرت میں تھی۔ وہ اکثر ہم دوستوں کو ''احدو'' ہوٹل میں واز وان کھلانے لے جاتا۔ کباب، کانتی، مکھن ٹوسٹ اور چائے کی سیوا ہفتے میں تقریباً دو تین بار ضرور ہوتی۔ گو تاج محی الدین امیری ٹھاٹھ میں رہتا تھا اور اپنا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن اُس کا دِل درویشی کی خُو سے لبریز تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی کسی کو کمتر نہیں سمجھا۔ نہ وہ کسی کی چُغلی کرتا یا کسی کی بدخوئی سنتا اور نہ ہی خود کسی کی غیبت کرتا۔ اُس نے مجھ جیسے غریب دوست کو ساری عمر اپنے سینے سے لگائے رکھا اور کبھی مذاق میں بھی اس بات کا احساس نہیں کرایا کہ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا ہے یا میں اُس کی برابری کیسے کر سکتا ہوں، بلکہ ہمیشہ میرے دُکھ سکھ کا ساتھی رہا۔ ہماری دوستی اللہ کے فضل سے مثالی رہی۔ تاج اُن دِنوں فرنیچر بنانے والی فیکٹری ''شال ٹینگ'' میں چلا رہا تھا جس کا نام تھا ہندوستان جوائنیری مِل۔'' آمدنی اچھی تھی، باغوں کی کمائی اور دُکانوں کا کرایہ الگ۔ اس لئے بے فکری اور مستی کا دور تھا۔ ایک دِن تاج مجھ سے کہنے لگا کہ وہ سیاست میں کودنا چاہتا ہے اور اُس کی بات آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سے چل رہی ہے اور وہ اُسے جموں و کشمیر اکائی کا صدر بنانے کے لئے تیار ہے۔ پھر ایک دِن وہ کافی ہاؤس میں اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' کی کاپی لیکر آیا اور دوستوں کے سامنے رکھ دی۔ جس میں لکھا تھا کہ تاج محی الدین نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ہے لیکن جلد ہی تاج کو سمجھ آ گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا کریلا کشمیر کی سیاسی دیگچی میں پک نہیں سکتا۔ اس لئے اُس نے کانگریس پارٹی جائن کر لی، اور آہستہ آہستہ کانگرس کی ٹونڈی (ناف) میں جا گھسا۔ اُس نے گوجر برادری کا سہارا لیا اور مرکز میں امور داخلہ کے وزیر راجیش پائلٹ کے ساتھ یاری کا جھولا

?ھُولنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب ملی ٹینسی کے نیولے ارضِ کشمیر کے بِلّوں یا سوراخوں سے باہر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوا کا رُخ تبدیل ہو رہا تھا۔ آزادی کے نعرے لگنے لگے تھے۔ کشمیری پنڈت اور ہند نواز مسلمان کشمیر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن ان پُر آشوب دِنوں میں تاج نے کشمیر نہیں چھوڑا۔ اکیلے کانگریس جماعت کو چلاتا رہا اور بھارت کا جھنڈا ہر جلسے، جلوس میں لہراتا رہا۔ بلکہ اُس نے کانگریس کے مرکزی لیڈران اور وزراء کو کشمیر میں لاکر اُن کے بڑے بڑے جلسے کروائے اور پارٹی کو زندہ رکھا۔ جنگجوؤں نے اُس پر گولیاں چلائیں۔ اُس کے گھر پر گرنیڈ پھینکے لیکن ''جا کو رکھے سائیاں، مار سکے نہ کوئے۔'' تاج ہر حملے میں بچ جاتا اُس کا عزم اور پختہ ہوتا۔ وہ دور دراز علاقوں میں جا کر جلسے کرتا۔ لوگوں سے ملتا اور اُنہیں سمجھاتا کہ دہشت گردی تباہی مچاتی ہے۔ اس لئے ملی ٹینٹوں کا ساتھ نہ دیں اور اپنے گھروں کو اُجڑنے سے بچائیں۔ زندگی کو موت کے حوالے نہ کریں۔ وہ لوگوں کو دلیل سے سمجھاتا کہ اُن کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ جڑا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر ہی جموں کشمیر ہر میدان میں ترقی کر سکتا ہے۔ اس لئے بنیاد پرستوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ اُس کی وجہ سے راجیش پائلٹ اور دوسرے مرکزی رہنما اُوڑی، کرناہ، کپواڑہ، اننت ناگ کے کانگریسی جلسوں میں بھاشن دے سکے۔ تاج محی الدین نے کشمیر میں مردہ کانگریس کو پھر زندہ کیا جبکہ بھارت ماتا کے بڑے بڑے سپوت کپُوت ثابت ہوئے۔ تاج محی الدین نے کانگریس کی ٹکٹ پر اننت ناگ سے لوک سبھا کا چناؤ بھی لڑا، لیکن اکھوانی بندوق برداروں کی دہشت نے کانگریس ورکروں کو ووٹ ڈالنے نہیں دیا اور اُس وقت کی مرکزی سرکار کی ایما پر جنتا پارٹی کے اُمیدوار مقبول ڈار کو جتایا گیا، جسے بعد میں مرکزی سرکار میں نائب وزیر داخلہ بنایا گیا۔ 1996ء میں تاج نے کانگریس کی ٹکٹ پر اُوڑی سے چناؤ لڑا لیکن نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار جناب محمد شفیع اُوڑی سے ہار گیا۔ جو مقامی امیدوار تھا اور

چار بار الیکشن جیت چکا تھا۔ اس ہار کے بعد تاج محی الدین نے فیصلہ کیا کہ وہ مستقل طور پر اُوڑی میں رہے گا اور لوگوں کی خدمت کرے گا اُس نے وہاں اپنا مکان بنایا۔ کانگریس کی بنیاد مضبوط کی۔ لوگوں کے مسائل اور مشکلات دور کرنے کے لئے فوجی اور سول انتظامیہ کی خاک چھانی اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھویا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 2002ء کے انتخابات میں کانگریس کی ٹکٹ پر وہ اُوڑی سے چناؤ جیت گیا۔ الیکشن کے بعد کانگریس اور پیپلز ڈیموکریٹ پارٹی (PDP) کی ملی جلی سرکار میں تاج محی الدین کو محکمہ خوراک اور امورِ صارفین کا وزیر بنایا گیا۔ وزیر بنتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے اپنے محکمے میں سپیشل سیکرٹری تعینات کروایا اور ریٹائرمنٹ کے بعد جموں وکشمیر سٹیٹ کنزیومر کمیشن کا پانچ سال کے لئے ممبر بنایا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ اہل ظرف لجپال لوگ ہوتے ہیں اور خالد حسین کے لئے تاج اُس کا لجپال تھا۔ 2008ء میں تاج دوبارہ اُوڑی انتخابی حلقے سے کامیاب ہوا اور نیشنل کانفرنس، کانگریس کی ملی جلی سرکار میں پھر وزیر بنایا گیا۔ اور اُسے محکمہ آبپاشی کا قلمدان سونپا گیا۔ لیکن اُس کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ ہمیشہ کی طرح زمین سے جڑا رہا۔ یاروں کے ساتھ دوستی نبھاتا رہا۔ کئی غریب دوستوں کی مالی کفالت بھی کرتا رہا اور وہ بھی اِس طرح کہ "دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کا پتہ نہ چلے" غصہ، گھمنڈ یا اہنکار کبھی تاج کے پاس سے بھی نہیں گزرا۔ تاج میرے اچھے اور بُرے وقتوں کا دوست ہے۔ دوستوں میں شاید میں واحد ایسا دوست ہوں کہ جس پر تاج نے مکمل اور کامل بھروسہ کیا، بھرپور اعتماد کیا اور خدا کے فضل سے میں بھی اُس کے اعتماد پر ہمیشہ پورا اُترا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہمراز تھے اور زندگی کے اہم فیصلے باہمی مشاورت سے کرتے۔ ایسے دلنواز اور سچے دوست اللہ سائیں کسی کسی کو بخشش میں دیتا ہے۔ یہاں مجھے پروین کمار اشک کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

کِسی کِسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی
خدا ہر ایک کو اپنا پتہ نہیں دیتا

خداوند کریم تاج کو صحت بخشے۔ عزت اور شہرت میں برکت کرے۔ کیونکہ تاج جہاں دل کا امیر ہے وہاں من کا فقیر ہے۔ وہ سخی حاتم ہے کئی یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی مالی مدد کرتا ہے۔ تاج محی الدین کو ادب اور تاریخ سے خاص دلچسپی ہے۔ وہ ایک زیرک انسان ہے۔ اُس نے ادب، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور سائنسی علوم پر بے شمار کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بات کر سکتا ہے۔ وہ ایک دانشور ہے اُس کا دماغ کمپیوٹر ہے اور سوچ ترقی پسند۔ پانی، سینچائی اور سیلابوں پر قابو پانے والے محکمہ جات کا وزیر بنتے ہی اس نے دریائے توی کے پانی کو روک کر ایک مصنوعی جھیل بنانے کا منصوبہ از خود بنایا۔ یہ جھیل گوجر نگر اور گورکھا نگر سے لیکر توی دریا کے چوتھے پل تک بننی تھی اور اس کی لمبائی تقریباً 2 کلومیٹر ہونی تھی۔ چوتھے پُل سے تھوڑا پہلے پندرہ فٹ اُونچا باندھ بنایا جانا تھا اور بڑی اور چھوٹی توی کے درمیان جو زمین کا ٹاپو ہے اُس میں پارک اور ریسٹورینٹ بننا تھا۔ اور جھیل کے دونوں اطراف خوبصورت باغ بنانے کی تجویز تھی۔ یہ سارا پروجیکٹ ریاستی سرکار نے منظور کر لیا تھا اور اس پر تیزی سے کام شروع بھی ہو چکا تھا یہاں تک کہ بیراج کے ستون بھی کھڑے کئے جا چکے تھے کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے ملی جلی سرکار کی مدت ختم ہوگئی اور نئے الیکشن کروائے گئے۔ 2014ء کے انتخابات میں صوبہ جموں کی 25 نشستوں پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے اُمیدوار کامیاب ہو گئے اور کشمیر میں پی۔ ڈی۔ پی 28 اسمبلی حلقوں پر جیت گئی اور دونوں جماعتوں نے مل کر حکومت بنائی اور ریاست کے ترقیاتی ایجنڈے کو چھوڑ کر مذہب اور نفرت کی سیاست کا آغاز ہوا۔ نارتھ اور ساؤتھ پول آپس میں مل نہیں سکے اور پہلے گورنر راج اور اب مرکزی راج چل رہا ہے۔ جھیل کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا

کیونکہ جوڑ، توڑ کی سیاست میں اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ تاج محی الدین نے دوسرا فیصلہ یہ لیا کہ پنجاب کی سرکار کو مجبور کیا کہ وہ جموں وکشمیر اور پنجاب کی سرکاروں کے درمیان ہوئے سمجھوتے کے مطابق رنجیت ساگر ڈیم (تھین ڈیم) سے 20 فیصد بجلی ریاست کو مہیا کرے۔ پنجاب سرکار یہ معاملہ مرکزی سرکار کے پاس لے گئی۔ جس نے جموں کشمیر کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس فیصلے کے مطابق پنجاب سرکار نے 20 فیصد بجلی دینے کے علاوہ شاہ پور کنڈی نہر بنانی تھی اور اُس میں سے ریاست جموں وکشمیر کو آبپاشی کے لئے اُس کے حصے کا پانی دینا تھا۔ پنجاب سرکار نے شاہ پور کنڈی نہر نہیں بنائی۔ چنانچہ تاج محی الدین نے ریاستی کیبنٹ سے یہ قرارداد منظور کرائی کہ دریائے راوی سے ریاستی محکمہ آبپاشی اپنی الگ سے نہر نکالے گا تا کہ اُس کے کنڈی علاقے سیراب ہوسکیں۔ یہ تاریخ ساز فیصلے اس سے پہلے کسی ریاستی سرکار نے نہیں لئے تھے۔ ایک اور قابل تعریف کام تاج نے یہ کیا کہ نیشنل ہائڈرو پاور کمیشن (NHPC) سے مطالبہ کیا کہ وہ ریاستی دریاؤں کا پانی استعمال کرنے کے عوض ریاستی سرکار کو آبیانہ یا واٹر ٹیکس ادا کرے۔ اِس سلسلہ میں تاج محی الدین نے ایک ایکٹ بنوایا۔ اور اُسے قانون ساز اسمبلی سے پاس کروایا اور اُسے لاگو کرنے کے لئے تمام انتظامات کئے۔ NHPC والے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں گئے لیکن عدالتِ عالیہ نے ریاستی سرکار کا فیصلہ برقرار رکھا۔ آج NHPC والے ریاستی حکومت کو متواتر آبیانہ دے رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقدامات سے تاج محی الدین کی دُوراندیشی اور بے خوفی کا پتہ چلتا ہے۔ اُس نے تو اُوڑی (اول) اور سلال بجلی پروجیکٹ ریاست کو واپس کرنے کے سلسلے میں بھی مرکزی سرکار کو خط لکھنے شروع کردیئے تھے کیونکہ سمجھوتے کی رُو سے ریاستی سرکار ایسا کر سکتی تھی۔ ولر بیراج پر بھی 60 فیصد کام ہو چکا تھا لیکن عمر عبداللہ سرکار ختم ہونے کے بعد پچھلے سات سالوں میں کسی نے ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اللہ

میرے یار کو صحت مند زندگی عطا کرے اور وہ عوام کی خدمت کرتا رہے۔ آمین

میں نے اپنے دشمنوں میں خوبیاں کی ہیں تلاش
اِس طرح سے مجھ میں اپنی خامیاں کم ہوگئیں
(نامعلوم)

دھریندر برہمچاری:

دھریندر برہمچاری سے میری پہلی ملاقات 1981ء میں موضع دُھونہ لاٹی میں ہوئی جہاں وہ میری خوش دامن صاحبہ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ وہ مان تلائی آشرم میں ایک ہسپتال بنانا چاہتا تھا۔ جس کی اجازت ریاستی سرکار سے حاصل کرنا ضروری تھی۔ ریاستی سرکار ایک غیر ریاستی باشندے کو ہسپتال بنانے کی منظوری نہیں دے رہی تھی۔ میری خوش دامن صاحبہ ممبر قانون ساز کونسل تھیں اور دھریندر برہمچاری چاہتا تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ سے ان کی سفارش کریں اور ہسپتال بنانے کی منظوری دلادیں۔ میں اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ اپنے سسرال گیا تھا تاکہ اپنی سالی اور سالے کی شادی میں شرکت کی جاسکے۔ وہاں دھریندر برہمچاری سے میری تفصیلی بات چیت ہوئی۔ جس میں مان تلائی آشرم کی تعمیر یوگ سنٹر اور یوگ سیکھنے کے لئے غیر ملکی افراد کا آنا، اعلیٰ اقسام کے پھل دار درخت اور خصوصاً سیب کے باغات نیز اعلیٰ نسل کی جرسی گائیں اور گھوڑے پالنے سے متعلق جانکاری حاصل ہوئی۔ وہ اپنی جیپ میں آیا تھا۔ اس نے چند گھنٹے ہمارے ساتھ گزارے اور پھر واپس مان تلائی آشرم چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد دھریندر برہمچاری، میری خوش دامن صاحبہ اور میں سرینگر گئے اور قبلہ شیخ صاحب سے ملے۔ وہاں دھریندر برہمچاری نے کہا کہ وہ ایک سو بستروں کا ہسپتال بنانا چاہتا ہے جس کے لئے سارے سرجیکل آلات اور متعلقہ مشینیں جرمنی، انگلینڈ اور دیگر بیرونی ممالک سے

منگوائی جائیں گی۔ ہسپتال مکمل ہونے کے بعد وہ اُسے ریاستی سرکار کو سونپنے کے لئے تیار ہے
تا کہ مقامی لوگوں کا مفت علاج ہو سکے۔ میری خوش دامن صاحبہ نے شیخ صاحب سے گزارش
کی کہ ہسپتال بنانے کی اجازت دے دیں۔ دھریندر برہمچاری عمارت کو کہاں لے جائے گا۔
آخر یہ ہسپتال مقامی باشندوں کے ہی کام آئے گا۔ وزیراعلیٰ نے بالآخر اجازت نامہ جاری
کروا دیا۔ اور ہسپتال کا کام دھریندر برہمچاری نے زور وشور کے ساتھ شروع کر دیا۔ دھریندر
برہمچاری 12 فروری 1924ء کو بہار میں پیدا ہوا اور 9 جون 1994ء کو مان تلائی میں ہی ہوائی
حادثے میں ہلاک ہوا۔ اُس کا اصل نام دھریندر چوہدری تھا اور وہ موضع چانپورہ مدھوبنی میں
پیدا ہوا تھا۔ وہ کنڈلنی یوگا سکھاتا تھا۔ وہ پردھان منتری اندرا گاندھی کا یوگ گورو تھا۔ اُس کے
مزید دو آشرم کٹڑہ (ریاسی) اور بھونڈسی، گوڑ گاؤں میں بھی تھے۔ 13 سال کی عمر میں اُس نے
گھر چھوڑ دیا اور وارانسی آ گیا۔ اُس کا گورو مہارشی کارتکیا تھا جس کا آشرم لکھنؤ سے 18 میل
دور گوپال کھیرا میں تھا جہاں دھریندر برہمچاری نے 1960ء تک یوگا کی تعلیم حاصل کی۔
پنڈت جواہر لعل نہرو نے اُسے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو یوگا سکھانے کے لئے بلایا تھا۔ تا کہ اس
کی صحت بہتر ہو سکے 1975ء میں جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگائی اور سارے ملک میں
اس کے خلاف مظاہرے ہونے لگے تو وہ اس مشکل وقت میں اندرا گاندھی کے ساتھ کھڑا رہا۔
اور تب تک اُس کے ساتھ جُڑا رہا جب تک کہ وہ پھر سے اقتدار میں نہیں آ گئی۔ اس طرح وہ
ایک اہم سیاسی شخصیت بن گیا۔ اندرا گاندھی کی پشت پناہی سے وہ 1970ء سے دوردرشن پر
یوگ ابھیاس کا پروگرام بھی دے رہا تھا۔ اُس کی کوشش سے دہلی کے سکولوں میں یوگا ایک
مضمون کے طور پر پڑھایا جانے لگا تھا۔ اس نے دہلی میں وشوایاتن یوگ آشرم بنایا، جسے آجکل
''مرارجی ڈیسائی نیشنل انسٹیچیوٹ آف یوگا'' کہا جاتا ہے۔ اُس نے جموں، کٹڑہ اور مان تلائی
میں مقامی لوگوں کے نام پر آشرم بنانے کے لئے زمین خریدی، اور آشرم بنائے۔ اس کے علاوہ

اُس نے جموں میں ایک گن فیکٹری بھی لگائی جس کا لائسنس اندرا گاندھی کے کہنے پر بھارت سرکار نے دیا۔ اُس پر الزام تھا کہ اس نے شِوا گن فیکٹری کے لئے سپین سے 500 بندوقیں چوری سے لائیں جس پر اُس کے خلاف اندرا گاندھی کی وفات کے بعد مقدمہ بھی درج کیا گیا۔ وہ سیاسی طور پر اتنا طاقتور بن گیا تھا کہ مختلف ریاستوں کے وزراءاعلیٰ اور وزرا محترمہ اندرا گاندی سے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے اُس کی مدد لیتے تھے۔ جس کے لئے وہ اُسے بھاری رقوم دیتے تھے۔ بیرون ملک دفائی ساز وسامان کے سودے کرانے میں بھی اُسے لاکھوں ڈالر کے نذرانے ملتے۔ یہ رقومات اُس نے اپنے آشرموں کو جدید سے جدید تر بنانے پر صرف کیں۔ اُس نے سدھ مہادیو سے مان تلائی تک 7 کلومیٹر کی سڑک خود بنائی۔ اپنے ہوائی جہاز کے لئے رن وے تعمیر کی۔ بڑے بڑے ٹرک، بلڈوزر اور کاریں خریدیں۔ یوگ سیکھنے کے لئے بیرونی ملکوں سے آنے والے لوگوں کے لئے شاندار ہوسٹل تعمیر کیا اور پانچ منزلہ ہسپتال کی عمارت کھڑی کردی۔ اور اُس کے لئے سارا سامان بیرون ملک سے منگوایا۔ جنگلی جانور پالے۔ اپنے ذاتی استعمال کے لئے الگ سے ایک یوگ سنٹر (کٹیا) بنایا۔ جس میں بیٹھ کر وہ کئی منٹوں تک سانس روک کر بیٹھ جاتا تھا۔ یہ منظر میں نے خود کئی بار اُس کی کٹیا میں دیکھا ہے جہاں کسی عام شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دسمبر اور جنوری کی سخت سردی اور برف باری میں بھی وہ اپنے جسم پر صرف ململ کی ایک دھوتی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤ پہن کر پورے آشرم کا چکر لگاتا رہتا۔ میں جب بھی اپنے سسرال جاتا تو اُس کو ضرور ملتا ایک بار میرے ساتھ پنجاب سے میرے دو دوست کہانی کار مختار گل اور فوٹو گرافر ہر بھجن باجوہ بھی تھے۔ اُس نے ہمیں دو دن ہوسٹل میں رکھا۔ گئوشالہ میں جرسی گائیں دکھائیں۔ عربی گھوڑے دکھائے۔ اپنے باغوں کے پھل کھلائے۔ مختار گل نے اُس کا تفصیلی انٹرویو کیا جو بعد ازاں پنجاب کے کئی پنجابی اخبارات میں شائع ہوا۔ جس دن ہوائی حادثے میں اُس کی موت ہوئی،

اُس دن میں لاٹی سے سُدھ مہادیو کی طرف آ رہا تھا اور میں نے مان تلائی سے دو کلومیٹر دور ایک موڑ سے جہاز کو درخت کے ساتھ ٹکراتے ہوئے دیکھا۔ جہاز درخت سے ٹکرا کر گر گیا تھا۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو آشرم چلنے کے لئے کہا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت آشرم کے ملازم دھریندر برہمچاری اور اُس کے پائلٹ کی لاش اُٹھا کر لا رہے تھے۔ دو مہینے پہلے جب میں آخری بار اُس سے ملا تھا تو اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سیوج دھار پر ایک رسدگاہ بنانا چاہتا ہے۔ جہاں سائنس دان سیوج میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں پر تحقیق کریں گے۔ پھر وہ مجھے درختوں کے بیچ ایک جگہ لے گیا جہاں اُس نے کنکریٹ کی ایک چھوٹی سے غار بنائی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ وہ جگہ ہے، جہاں اُس نے سمادھی لینی ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور قدرت نے اس کے لئے کچھ اور سوچا ہوتا ہے۔ اُس کی موت کے بعد مان تلائی آشرم کھنڈرات میں بدل گیا۔ سب ملازم چلے گئے۔ قیمتی سامان لوگ لوٹ کر لے گئے۔ عمارتیں سوگوار کھڑی ہیں۔ باغات تباہ ہو چکے۔ جانور اور گھوڑے لوگ لے گئے۔ ٹرک اور کاروں کا کباڑ بن گیا۔ دھریندر برہمچاری کی جائیداد کو حاصل کرنے کے لئے کئی وارث جاگ پڑے۔ مقدمے بازی شروع ہوگئی۔ آخر ریاستی سرکار نے مان تلائی آشرم کو ماتا ویشنو دیوی ٹرسٹ کی سپرداری میں دے دیا۔ میری خواہش ہے کہ سرکار اس خوبصورت صحت افزا مقام کو سیاحوں کے لئے دوبارہ آباد کرے۔ Infrastructure موجود ہے۔ صرف سرکار کے فیصلے کی دیر ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پتنی ٹاپ کے بعد مان تلائی جموں کا ایک اور بہترین صحت افزا مقام بن جائے گا۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پَل کی خبر نہیں
(حیرت آلہ آبادی)

اوتار سنگھ چندن :

چندن سیدھا، سادھا، صاف، ستھرا اور محبتوں کے ساگر سے پیار کے مٹکے بھر کر یار بیلیوں کو میٹھا پانی پلانے والا شخص تھا۔ میری اُس کی گہری دوستی تھی۔ وہ ایک سفید پوش انسان تھا اور اپنے خلوص کی وجہ سے سب کا پیارا تھا۔ میری اُس کے ساتھ پہلی ملاقات 1971ء میں پنجابی ساہت سبھا سرینگر کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں اُس نے ترنم میں اپنا ایک پنجابی گیت سنایا، جس میں پوٹھواری الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال کیا گیا تھا۔ گیت کے بول مجھے آج بھی یاد ہیں ؎

میرے ماہیا، ڈھول سپاہیا

جُل جُلیئے نی بارہ مُلے

اوتار سنگھ چندن ہر اتوار کو پنجابی ساہت سبھا کی ادبی نشست میں شامل ہوتا۔ اپنی نظمیں سناتا اور سبھا کے کام کاج میں بھرپور حصہ لیتا۔ سبھا کے نام نہاد دانشور اور گیانی اُسے ان پڑھ اور گنوار سمجھتے لیکن میری سوچ کے مطابق وہ ہم سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اُس نے بلھے شاہ کے ''الف'' کا سبق پیدا ہوتے ہی پڑھ لیا تھا۔ جبھی تو شاعری اُس کے اندر سے نکلتی تھی۔ گو اُس کی شاعری میں کہیں کہیں وزن بحر کی خامی تھی لیکن اُس کا تخئیل امیر تھا۔ اشعار میں روانی تھی اُسے ہر مشاعرے میں مدعو کیا جاتا۔ شاید اس کی شہرت سبھا کے ٹھیکیداروں کو ہضم نہیں ہوتی تھی۔ اوپر سے اس کا خوبصورت ترنم ___ چندن ایک یتیم بچہ تھا جس کے ماں باپ بہن بھائی اور باقی رشتے دار مظفر آباد میں 1947ء کے قبائلی حملے میں شہید ہو گئے تھے۔ حملہ آوروں سے بچتا بچاتا وہ اپنی دادی کے ساتھ مظفر آباد سے سری نگر آ گیا اور امیرا کدل کے نزدیک بندوق کی چھاؤنی'' کے ریفوجی کیمپ میں رہنے لگا۔ ڈوگرہ شاہی کے دور میں یہ جگہ ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ شخصی راج ختم ہونے کے بعد عوامی سرکار نے

یہاں مظفر آباد سے آنے والے ریفوجی سکھوں کو بسایا۔ چندن کی دادی نے اُسے بڑی مصیبتوں سے پالا۔ دراصل دادی کی سانسوں کی ڈور چندن کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اوتار سنگھ کے والد کا پیشہ زرگری تھا۔ اس لئے دادی نے اُسے رشتے کے ایک چاچا کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیجا اور چند سالوں میں ہی وہ عمدہ کاریگر بن گیا اور چاچے کی دکان پر ہی کام کرنے لگا جو زینہ کدل میں تھی۔ لڑکپن سے ہی شاعری کی بیماری کی وجہ سے وہ اکثر دُکان سے غیر حاضر رہتا۔ جہاں کہیں بھی مشاعرہ ہوتا، وہ وہاں پہنچ جاتا۔ شادیوں میں سہرے پڑھتا۔ مذہبی مجلسوں میں نظمیں پڑھتا۔ ادبی اداروں میں اپنی روایتی شاعری سے سب کا دِل موہ لیتا۔ وہ اُردو، کشمیری اور پوٹھواری میں بھی اپنا کلام پڑھتا۔ دادی نے اُس کی شادی اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی سے کروائی۔ اُس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اُس کی بیوی نے اپنی بہن کا بیٹا گود لے لیا۔ اوتار سنگھ چندن نے اُس بچے کو پڑھایا اور روزگار کے قابل بنایا۔ فلم ایکٹر، دانشور اور ادیب بلراج ساہنی سے سرینگر میں میری پہلی ملاقات چندن نے ہی کرائی تھی۔ بلراج ساہنی چندن کی پوٹھواری رنگ میں رنگی پنجابی شاعری اور اُس کی سادگی کا گرویدہ تھا۔ مشاعروں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ اکثر دکان سے غائب رہتا۔ گاہک کا کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو وہ اپنے اندر کے شاعر کی دلجوئی سے باز نہیں آتا اور سب کچھ چھوڑ کر مشاعرہ پڑھنے چلے جاتا۔ چندن کی اس عادت سے اُس کا چاچا بے حد دُکھی تھا۔ تنگ آ کر ایک دِن اس نے چندن کو کھری کھری سُنا دیں۔ چندن دُکان سے اُتر کر سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ جب پانچ سات دن وہ مجھے اور ہر بجن سنگھ ساگر کو نہیں ملا تو ہم اُس کی خیریت پوچھنے اُس کے گھر گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ رونے لگا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اُسے کسی کام پر مزدوری کے لئے رکھوا دے کیونکہ اُس نے چاچے کی دکان چھوڑ دی ہے اور وہ اب وہاں کام نہیں کرے گا۔ چندن جیسے کومل شاعر کو روتے دیکھ میرے دل کو ٹھیس پہنچی اور میں اُس کے لئے

دکان ڈھونڈنے لگا۔ آخر ایک دوست کی وساطت سے بازار بٹہ مالو میں ایک خالی دکان مل گئی لیکن وہ اُس کی پگڑی مانگنے لگا۔ پگڑی دینے کے لئے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اگر اُسکے بیٹے کو سرکاری نوکری دلائی جائے تو وہ دُکان بغیر بگڑی کرائے پر دینے کو تیار ہے۔ میں اُن دِنوں نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ اس لئے نوکری دلوانے کا وعدہ کر کے دکان کی چابی چندن کے حوالے کردی۔ دوسرے دن میں ہربھجن سنگھ ساگر اور چندن بٹہ مالو گئے۔ دکان کھولی۔ اُس کی صفائی کی۔ اس کے پاس زرگری کے کچھ اوزار تھے اور باقی میں نے خرید کر لائے اور اپنی بیوی کا سارا زیور اُسے دیا تا کہ وہ اُسے ڈھال کر اپنا کام شروع کرے۔ ساگر نے بھی اُسے اپنی بیوی کے گہنے دیئے اور یہ طے ہوا کہ جب ہمیں ضرورت ہوگی تو وہ ہماری پسند کا زیور ہمیں بنا کر دے گا۔ کام کرتے دیکھ کر اس کے پاس گاہک آنے لگے۔ جب زینہ کدل میں لوگوں کو پتہ چلا کہ اصلی کاریگر چندن چاچے کی دکان چھوڑ کر اپنی دکان بٹہ مالو میں چلا رہا ہے تو وہ اپنے گہنے بنوانے کے لئے چندن کے پاس آنے لگے۔ صرافہ بازار کے ساہوکار بھی اُسے کام دینے لگے۔ اب یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ چندن کو دکان پر ٹِک کر کیسے بٹھایا جائے۔ کہیں یہاں بھی وہ چاچے کی دُکان والی حرکتیں شروع نہ کر دے اور دکان بند کر کے مشاعرے پڑھنے نہ چلا جائے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ دفتر سے چھٹی کے بعد ہم دو میں سے ایک ہر روز اُس کی دُکان پر بیٹھے گا تاوقتیکہ دکان بند کرنے کا وقت نہ ہو جائے۔ میں نے اپنے گھر سے دو کرسیاں اور ایک میز لا کر دکان پر رکھا تا کہ گاہک بیٹھ سکیں۔ وہ سونا دُکان پر نہیں رکھتا تھا بلکہ گھر لے جاتا تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگا کہ اُسے ایک سائیکل کی ضرورت ہے۔ میں نے اُسے اپنا سائیکل دے دیا۔ چندن اچھی خاصی کمائی کرنے لگا۔ بٹہ مالو اور آس پاس کی بستیوں کا وہ ہر من پیارا سنیارا بن گیا بلکہ اُن کے گھریلو مسائل بھی حل کرنے لگا۔ وقت بڑا اچھا گزرنے لگا۔ پھر 90-1989 کا سال

آیا۔ کشمیر میں بے چینی پھیلی۔ آزادی کے نعرے چاروں طرف گونجنے لگے۔ جنگجو اپنی کاروائیاں کرنے لگے۔ فوج دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کرنے لگی۔ معصوم لوگ بھی مرنے لگے۔ ہڑتالوں اور کرفیو کی وجہ سے دکانیں بند رہنے لگیں۔ دُکاندار فاقہ کشی کا شکار ہونے لگے۔ چندن نے دو تین سال دم رکھا لیکن آخر جموں آ گیا۔ یہاں آ کر اُس نے ایک چھوٹا سا مکان خریدا، جس کی رجسٹری کے لئے رقم میں نے دی۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا۔ اُس کی حالت خراب تھی۔ بے بسی اور بے کسی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ کہنے لگا کہ جس گود لئے بیٹے کے لئے اُس نے ساری زندگی محنت کی، اس کی نوکری لگوائی، اس کو مکان بنا کر دیا، آج اُس نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لئے اب وہ مرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اُسے لیکر اُس کے گھر گیا۔ اس کے بیٹے کو سمجھایا۔ ڈانٹا اور اُس سے معافی منگوائی اور چندن کو اُس کے گھر چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ پھر ایک دِن مجھے ہر بھجن سنگھ ساگر کا فون آیا اس نے بتایا کہ اوتار سنگھ چندن یہ ظالم دُنیا چھوڑ گیا ہے۔ بھلا ایک حساس دل والا شخص اپنی اولاد کے ہاتھوں کب تک ذلیل ہوتا۔ وہ فوت ہو گیا اور اُس کے ساتھ میرے رشتے بھی فوت ہو گئے۔ دُعا گو ہوں کہ اللہ سائیں اُسے سورگ میں سکون عطا کرے۔ اُس کی بے چین روح کو شانتی ملے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا
(ندا فاضلی)

خالہ رضیہ:

اپنی شادی کے بعد میں اکثر اپنی خوش دامن صاحبہ سے سنتا تھا کہ 1947ء کی شورش

کے دوران ان کے کئی قریبی رشتے دار پاکستان چلے گئے تھے۔ میرے سسر کی سگی بہن وزیر بیگم اُستاد محلے کے نصیر الدین سلاریا کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ اُن کے چھ بچے تھے۔ چار بیٹے۔ نعیم، قمر، تصوّر اور عاشق۔ دو بیٹیاں پروین اور نگہت۔ یہ سارا کنبہ 1947ء میں سیالکوٹ ہجرت کر گیا اور پھر میر پور میں مستقل آباد ہو گیا۔ میری ساس کی پھوپھی اور پھوپھا حبیب اللہ جو 1947ء میں نارووال میں سرکاری نوکری کرتا تھا، وہ وہاں ہی رہا اور اپنے آبائی شہر جموں میں نہیں آیا۔ حبیب اللہ گلی کمہاراں، پرانی منڈی جموں کا رہنے والا تھا۔ اُس کے دو بیٹے عبدالرحمن اور عبدالسلام تھے اور چار بیٹیاں خالہ غلام فاطمہ (جو 1947ء سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھی) خالہ رضیہ، خالہ ثریا اور خالہ زبیدہ (دونوں وفات پا چکی ہیں) خالہ رضیہ کی شادی لاہور کے مسعود قریشی صاحب سے ہوئی تھی جو کہ ملازم تھے۔ لیکن اُنہیں فلمیں بنانے کا شوق تھا۔ اُنہوں نے اپنے ایک بیٹے طارق قریشی کے نام پر لاہور میں فلم کمپنی بنائی اور فلمیں بنانے لگے۔ انہوں نے کل تیرہ (13) فلمیں بنائیں۔ جن میں "چوڑیاں"، "سلاخیں" اور "دہلیز" نے سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی منائی۔ ان فلموں نے خوب بزنس کیا۔ اتنا پیسہ کمایا کہ مسعود قریشی صاحب نے پاش کالونی گلبرگ، سیکٹر ایل میں دو کنال کی ایک کوٹھی خریدی۔ ان کے تین بیٹے شاہد، طارق اور زاہد ہیں۔ چار بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ 1985ء میں میری ساس، سُسر اور بیٹی سمعیہ تبسم ایک مہینے کے ویزے پر لاہور گئے اور خالہ رضیہ کے ہاں ٹھہرے اُن کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ لاہور اور سیالکوٹ کی سیر کرائی گئی۔ جب وہ واپس آئے تو خالہ رضیہ کی مہمان نوازی کے قصیدے پڑھتے رہے۔ خالہ رضیہ نے اپنی دونوں بہنوں ثریا خالہ اور زبیدہ خالہ کی پرورش کی۔ اُن کی شادیاں کرائیں خالہ زبیدہ کی بیٹی شیریں بہن کی شادی سیالکوٹ میں کرائی اور خالہ ثریا کی بیٹی گوگی بہن کی شادی اپنے بیٹے زاہد قریشی سے کرائی۔ وہ دونوں بہنوں کی

کفالت بھی کرتی رہی۔ اُس کی زندگی میں ہی دونوں بہنیں اللہ کو پیاری ہوگئیں اوران کے جنازے گلبرگ سے ہی نکلے۔ 2004ء میں عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے جب میں لاہور جارہا تھا تو میری ساس نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کی بہن خالہ رضیہ کے گھر ضرور جاؤں۔ اُنہوں نے مجھے اُنکا فون نمبر بھی دیا۔ لاہور میں ہمیں ''شاہ تاج'' ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ میرے ساتھ گورداسپور سے پرنسپل اوتار سنگھ سدھو اور بیبا بلونت بھی تھے۔ کانفرنس کے تیسرے اور آخری دن میں نے خالہ رضیہ کو فون کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اور لاہور آنے کا اپنا مقصد بتایا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر زاہد بھائی اور اُن کے کزن جاوید بھٹ صاحب مجھے لینے ہوٹل پہنچ گئے۔ میں اُن کے ساتھ خالہ کو ملنے گلبرگ گیا۔ میرے ساتھ پرنسپل اوتار سدھو اور بیبا بلونت بھی تھے۔ وہاں خالہ رضیہ کی بہنوں خالہ ثُریا اور خالہ زبیدہ سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے علاوہ خالہ کے بیٹے طارق بھائی اُن کے بیوی بچوں اور زاہد بھائی کے عیال سے ملے۔ زاہد بھائی کے بیٹے حسن، مدثر اور عمیر نے پیار اور خلوص سے ہماری خدمت کی۔ شام کو ہم واپس ہوٹل آ گئے۔ اگلے دِن عیدِ قربان تھی۔ خالہ رضیہ نے بریانی اور سالن کے دو بڑے بڑے پتیلے ہوٹل بھجوا دیئے اور ہم سب بھارتی ڈلی گیٹوں نے بریانی کھائی اور عید منائی۔ دوسری بار میں خالہ رضیہ اوران کے اہل خانہ سے 2005ء میں ملا جب میں ہندوستان اور پاکستان کی سرکاروں کے باہمی سمجھوتے کے مطابق پرمٹ سسٹم کے ذریعہ ''کاروانِ امن'' بس میں سری نگر سے مظفر آباد گیا تھا۔ میرے ساتھ میری بیگم نسیم فردوس بھی تھی۔ مظفر آباد سے راولپنڈی چکلالہ ڈاکٹر کرنل عنایت حسین اور بہن ڈاکٹر پروین کے ہاں ٹھہرے جو میری اہلیہ کی پھوپھی زاد بہن ہے۔ وہاں سے میر پور گئے اور پھر میر پور سے لاہور آ گئے، جہاں میں عالمی پنجابی کانفرنس میں ایک ڈلیگیٹ کے طور پر شامل ہوا اور جہاں میری کتاب ''ہلدی برف دا سیک'' کی رسم اِجرا ہوئی۔ پھر ہم خالہ رضیہ کے ہاں

آ گئے۔ جہاں ہم نے چار دِن قیام کیا اور جموں سے ہجرت کر کے آئے اور لاہور میں آباد کئی لوگوں کو ملے۔ بھائی جاوید بٹ، بھائی عامر اور بہن غزالہ کے ہاں کھانا کھایا۔ بھائی خالد بٹ کے ہاں گئے۔ عامر اور خالد بٹ خالہ رضیہ کے داماد ہیں۔ اُن کے بچوں سے ملے۔ خالد کی محبت اور شفقت اور مہمان نوازی کا لطف اُٹھایا۔ زاہد بھائی کے بڑے فرزند حسن کو ساتھ لیکر سارا لاہور شہر دیکھا۔ خالہ رضیہ ایک جہاں دیدہ خاتون تھیں، ایک قابل احترام شخصیت۔ اُنہوں نے زندگی میں کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ اچھے، بُرے دِن دیکھے لیکن اپنی حکمت عملی اور دانش مندی سے پورے کنبے کو جوڑے رکھا۔ مجھ پر اُن کی شفقت اتنی زیادہ تھی کہ ہر پل بہن گوگی سے کہتی کہ خالد حسین نے ناشتہ کیا؟ کھانا کھایا؟ اُسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ زاہد بھائی کو بار بار کہتی کہ خالد کا خیال رکھے۔ پھر میں تقریباً اُن کو ہر سال ملتا رہا، اور اُن کا پیار اور خلوص حاصل کرتا رہا۔ 2011ء میں، میں خصوصی طور پر زائد بھائی کے بیٹے حسن کی شادی میں شمولیت کے لئے گیا تھا۔ میرے ساتھ میری بیگم اور بڑی بیٹی سمعیہ بھی تھی۔ شادی کی گہما گہمی کے باوجود خالہ رضیہ ہمارے بارے میں فکر مند رہتی کہ کہیں مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ 2014ء میں، میں پھر لاہور گیا اور خالہ رضیہ کے ہاں ٹھہرا۔ میرے ساتھ میرا بڑا داماد انجینئر محمد ایوب وانی، میری چھوٹی بیٹی ڈاکٹر ہما تبسم، میری بڑی بہو مرحومہ فرحت بانو اور اُس کی دو بیٹیاں اور میری پوتیاں زارا اور رمشا تھیں۔ ہم سب زارا کو چھوڑنے گئے تھے جو سارک کانفرنس کے سمجھوتے کے تحت ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کورس کے لئے منتخب ہوئی تھی۔ 2018ء میں عالمی پنجابی کانفرنس کے وقت وہ کافی علیل تھیں پھر بھی میرے لئے فکر مند رہیں۔ 2019ء میں جب میں لاہور گیا تو وہ بہت زیادہ بیمار تھیں۔ زبان لگ بھگ بند ہو چکی تھی اور عمر بھی 90 سال تھی لیکن پھر بھی اشاروں سے مجھے اپنے پاس بٹھانا اور اپنے سامنے ناشتہ اور کھانا کھلانا۔ اُن کی بہو بہن گوگی اور حسن کی بیوی

اور ہماری بیٹی مریم نے خالہ رضیہ کی جی جان سے خدمت کی۔ جب میں واپس جموں آیا تو کچھ عرصہ کے بعد زاہد بھائی نے اُن کی وفات کی خبر سنائی۔ اللہ میری خالہ کو غریقِ رحمت کرے۔ جب میں فروری 2020 میں لاہور گیا تو زاہد بھائی کے ساتھ خالہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ گلاب کی پتیاں اُن کی قبر پر نچھاور کیں۔ آج گلبرگ والا مکان بک چکا ہے اور بھائیوں نے الگ الگ کوٹھیاں بنالی ہیں۔ میری دُعا ہے کہ سبھی بھائی بہنوں میں پیار بنا رہے۔ محبت اور خلوص قائم رہے تا کہ میری خالہ کی رُوح پُرسکون رہے۔ جنت مکانی خالہ رضیہ کی محبت اور شفقت کی یادیں ہمیشہ میرے اندر زندہ رہیں گی۔

مجھ کو خوشی ملی تو زمانے میں بانٹ دی
اور غم ملا تو اپنے ہی گھر لے کے آ گیا
(نامعلوم)

فخر زماں:

فخر زماں صاحب کو میں نے سب سے پہلے لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ "پنج دریا" میں پڑھا۔ "پنج دریا" کے ایک خصوصی شمارے میں فخر زمان کی دو غزلیں چھپی تھیں جن کے دو اشعار آج بھی مجھے زبانی یاد ہیں کیونکہ یہ دونوں اشعار ہندوستان اور پاکستان کے گرد آلود تعلقات کی نشاندہی کرتے تھے۔

"یا تاں بدل رج کے وسّے یا مُڑ سورج لشکے
مٹی گھٹے دا ایہہ موسم کِنوں چنگا لگ دا"

ترجمہ: یا تو بادل خوب برسے یا پھر سورج چمکے
گرد وغبار والا موسم کس کو اچھا لگتا ہے

''سانوں ڈاڈھا لوڑی دا اے اج اِک دُلا بھٹّی ہور

بھنے کینگرے دِلّی دے تے بھاجڑ پاوے تخت لاہور''

ترجمہ: ہمیں آج شدّت سے ضرورت ہے ایک اور دُلّا بھٹی کی

جو دِلّی کے منارے توڑ دے اور تخت لاہور کو لرزا دے

پھر یہ شاید 82-1981 کی بات ہے کہ پاکستانی پنجاب سے جو پنجابی ادیب جالندھر میں عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے آئے تھے، ان میں پروفیسر شہباز ملک (پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پنجابی شعبہ کے صدر) شاعر اور نقاد انور بیگ اعوان اور ''پنج دریا'' کے مدیر امجد بھٹی بھی تھے جنھوں نے ''فخر زمان نمبر چھپا تھا اور جس میں فخر زمان کے دو شعری مجموعوں ''کنسو ویلے دی'' اور ''ونگار'' سے نظمیں بھی لی گئی تھیں، اور اُن کی نجی اور ادبی زندگی کے بارے میں مضامین بھی تھے۔ اُن کی نظموں میں غریب، نادار اور غلام قوموں کی ترجمانی کی گئی تھی۔ شاعری کے ذریعے علامتوں اور استعاروں میں فوجی حکومت کے جبر، دہشت اور سیاست کے المیے کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر فخر زماں صاحب کا پہلا ناول ''ست گواچے لوک'' پڑھنے کو ملا۔ یہ ناول پنجابی ناول نگاری میں ایک Trend Settler تھا۔ اسی شیلی میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''پکھیرو'' بھی شائع ہوا تھا۔ یہ دونوں ناول مشرقی پنجاب میں گورمکھی رسم الخط میں شائع کئے گئے اور پنجاب اور دہلی کی یونیورسٹی کے نصاب کا حصہ بنے۔ ''ست گواچے لوک'' کی شہرت کا ثبوت یہ تھا کہ ہر ادبی محفل میں اس ناول کا ذکر ہوتا اور اُس پر تبصرہ کیا جاتا۔ پھر فخر زماں کا دوسرا ناول 'اک مرے بندے دی کہانی'' شائع ہوا۔ ''ست گواچے لوک'' پنجاب کی سرزمین، ثقافت اور تاریخ کی کہانی ہے، جس میں ''سات گم شدہ لوگ'' اپنی اپنی کہانی سُناتے ہیں اور سماج کی خامیوں اور عوام کے دُکھ، درد، استحصال اور ظلم، زیادتی کو بیان کرتے ہیں۔ جب کہ 'اِک مرے بندے دی

کہانی'' انسانوں کے دوغلے پن کی کہانی ہے۔فخر زمان پیپلز پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے اور وہ رُکن اسمبلی بھی رہے۔ جب اُن کی سرکار کا تختہ پلٹ کر جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی تو ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھیوں کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ جن میں فخر زمان بھی شامل تھے۔ اُنہوں نے جیل میں اپنا تیسرا ناول ''بندی وان'' یعنی ''قیدی'' لکھا۔ یہ ناول جیل سے سمگل ہوکر مشرق پنجاب میں 1981ء میں گورمکھی رسم الخط میں چھپا جبکہ شاہ مکھی یا اُردو رسم الخط میں یہ ناول لاہور سے 1984ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول جنرل ضیاء الحق کے فوجی راج، وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور لوگوں کے ردِ عمل کی کہانی ہے۔فوجی راج کی دہشت کی داستان ہے اس ناول کا مرکزی کردار ''زیڈ'' شہید بھٹو کا عکس ہے میں نے اس ناول کو پڑھنے اور اس سے متاثر ہوکر ایک کہانی ''کلاوڈ برسٹ'' لکھی تھی اور استعاروں اور علامتوں کے ذریعے وہی بات کہی تھی جو فخر زمان نے اپنے ناول میں تفصیل کے ساتھ بیان کی تھی۔اس کے بعد فخر زمان صاحب نے کئی اور ناول لکھے۔ ''ہے وطنا''، ''کم ذات''، ''تو کہ میں'' جیسے ناولوں کو پنجابی دُنیا نے گلے لگایا۔ پڑھنے کے بعد بے شمار تنقیدی مضامین لکھے۔فخر زمان کے ناولوں میں پنجاب، پنجابی اور پنچایت کی جڑیں اپنی زمین میں گہرائی تک پیوستہ ہیں۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر پنجابیوں کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کا شیدائی ہے۔اُسے اپنے ماضی پر فخر ہے۔وہ ہڑپہ، ٹیکشلا اور گندھارا، تہذیب کو پنجابیوں کا عروج سمجھتا ہے۔ اُس نے کبھی ہندو اور مسلمان کی عینک سے تاریخ کو نہیں دیکھا۔اُس کا ہیرو، راجہ پورس ہے۔دُلا بھٹی ہے احمد خان کھرل اور بھگت سنگھ ہے۔ وہ غوری اور غزنوی کو حملہ آور کہتا ہے۔نادر شاہ اور احمد شاہ دُرانی کو ظالم کہتا ہے۔جنہوں نے پنجابیوں کے سینے چھلنی کئے، اور اُن کی لاشوں پر گزر کر دلّی پر قابض ہوئے۔ اُس کے ناولوں میں پنجاب کا اتہاس ملتا ہے۔ چاہے وہ دراوڑوں یا آریاؤں کے زمانے کا ہو یا چاہے ہندوستان کی تقسیم کے بعد کا ہو۔ وہ

بھارت پاکستان کی بداعتمادی، بے یقینی اور دشمنی اور سرحدوں پر کانٹے دار تار کو علامت کے طور پر اپنے ناولوں میں استعمال کرتا ہے۔ ''تُوں کہ میں'' ایک علامتی اور تمثیلی ناول ہے۔ جس میں پنجاب کی تقسیم کا المیہ ہے۔ فخر زمان پنجاب کے ضلع گجرات کا جٹ ہے اور اس جٹ نے اس ناول میں صوفیوں کے کلام کے ذریعے کہانی کو منطقی انجام تک پہنچایا ہے۔ بابا فریدؒ، بابا نانک، شاہ حسین، وارث شاہ، سلطان باہو، بُلھے شاہ اور میاں محمد بخش جیسے کامل صوفی درویشوں کے کلام کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کے منظر نامے میں پنجاب کی عشقیہ داستانیں، پانچ دریاؤں کے پانیوں کا جلترنگ اور لوک ورثہ کے حوالے نے ناول کو ایک دستاویز بنا دیا ہے۔

فخر زمان ترقی پسند خیالات اور کھلے پن کا حامی ہے۔ اور سماجی بندشوں کے خلاف۔ وہ انسان دوستی، امن، سچائی اور جیتی جاگتی اور ہنستی کھیلتی زندگی کا ادیب ہے۔ وہ بیگم نصرت بھٹو کا پولیٹیکل ایڈوائزر رہا۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد (Accademy of Letters کا چیئرمین رہا۔ سینٹر رہا۔ وفاقی وزیر رہا اور نیشنل کمیشن آف ہسٹری اینڈ کلچر کا چیئرمین بھی رہا اور آجکل وہ عالمی پنجابی کانگریس کا چیئرمین ہے۔

میری اُس سے روبرو ملاقات 2004ء میں واہگہ بارڈر پر ہوئی جب بھارتی پنجابی ادیبوں اور فنکاروں کے استقبال کے لئے وہ وہاں آیا تھا۔ اُس نے میرا نام سنتے ہی مجھے گلے سے لگایا۔ پھولوں کا ہار پہنایا۔ باقی ادیبوں سے بھی وہ فرداً فرداً ملا اور اُن کا سواگت کیا۔ عالمی پنجابی کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے اُس کے ساتھیوں نے انتھک محنت کی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ پاکستانی پنجاب میں چھپنے والے رسائل میں اُس نے میری کہانیاں پڑھی ہیں اور مشورہ دیا کہ میں شاہ مکھی رسم الخط میں اپنی کہانیوں کا ایک انتخاب شائع کروں تاکہ میری کہانیاں ادب نواز لوگ پڑھ سکیں میں نے اُس سے گزارش کی کہ اگر وہ شاہ مکھی رسم الخط والی کتاب کا پیش لفظ لکھ دے تو وہ جلد کتاب چھاپ دے گا۔ اُس نے

حامی بھرلی اور میں نے جموں آکر کہانیوں کا مسودہ ڈاک کے ذریعے فخر زماں کو بھیج دیا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اُس نے پیش لفظ لکھا اور بھیج دیا۔ کتاب چھپی اور اُس کا عنوان ''بلدی برف داسیک'' ہے۔ اس کتاب کی رسم اجرا 2005ء میں لاہور کے الحمرہ ایڈیٹوریم میں ہوئی۔ بعدازاں یہی کتاب گورمکھی میں لدھیانہ سے چیتنا پرکاشن والوں نے چھاپی۔ اس کتاب کی کہانیاں دِلی، جموں اور پنجاب کی تقریباً سبھی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کی گئیں۔ اُسی سال موسم سرما میں چندی گڑھ میں عالمی پنجابی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں پاکستانی وفد کی سربراہی فخر زمان نے کی لیکن وہ دوسرے دن ہی واپس لاہور چلا گیا جہاں اُس کی بیگم اور مشہور شاعرہ شائستہ حبیب کینسر کی وجہ سے اپنی آخری سانس لے رہی تھی کیونکہ ڈاکٹروں نے اُسے جواب دے دیا تھا۔ چند دنوں بعد اُس کی شریکِ حیات وفات پا گئی۔ 2007ء میں جب فخر زمان پٹیالہ میں پنجابی یونیورسٹی کی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے آیا تو میں نے اُسے جموں آنے کی دعوت دی جو اُس نے قبول کرلی اور پھر ایک دن دلّی سے اُس کا فون آیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جموں آرہا ہے شائستہ حبیب کی وفات کے بعد اُس نے دلی یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کی پروفیسر سے نکاح کرلیا تھا۔ جموں میں وہ میاں بیوی میرے غریب خانے بٹھنڈی میں ٹھہرے۔ اُس کے اعزاز میں جموں یونیورسٹی نے ایک پروگرام منعقد کیا جس کی صدارت وائس چانسلر امیتابھ مٹو نے کی اور جس میں یونیورسٹی اساتذہ کے علاوہ جموں کے ادیب، شاعر، دانشور اور صحافیوں نے شرکت کی۔ فخر زماں نے پاکستان میں لکھے جا رہے انگریزی اور مقامی زبانوں کے ادب کے بارے میں گفتگو کی۔ پاکستان اور ہندوستان کے رشتوں کے بارے میں تفصیل سے اپنا نقطہ نظر رکھا اور حاضرین کے پوچھے گئے سوالوں کے جوابات بھی دیئے۔ شام کو پنجابی ادبی سنگت کی طرف سے جموں پریس کلب میں ایک ادبی نشست

سجائی گئی جس میں باہمی بات چیت کے علاوہ شعروشاعری کا دلچسپ دور چلا۔ جب 2011ء میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو فخر زماں نے مجھے ٹھہرانے پر بُلایا۔ جہاں پُرانی یادیں تازہ کی گئیں اور جشن فیض سے متعلق اُس نے مجھے مفید مشورے دیئے اور اُستاد حامد علی خان کو جموں بُلانے کی بات کہی۔

فخر زماں ایک ادارے کا نام ہے۔ ایک نامور پنجابی ناول نگار ایک شاعر، جس کو ادبی خدمات کے صلے میں پاکستان کی سرکار نے 1994ء میں ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔ کئی غیر ملکی انعامات ملے۔ 2001ء میں پنجابی ناول نگاری کے حوالے سے میلینئیم ایوارڈ ملا۔ وہ پنجابی زبان وادب اور پنجابیت کا سفیر ہے اور مجھے فخر ہے کہ مجھے بھی فخر زمان جیسی مقناطیسی شخصیت کا قُرب حاصل ہے۔ اللہ اُسے صحت کامل عطا کرے۔

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو تم، فسانہ ہیں ہم لوگ
(منتظر لکھنوی)

ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری گجراتی:

ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری سے میری پہلی ملاقات 2004ء میں لاہور کے ''الحمرہ'' کلچرل سنٹر میں ہوئی۔ میں بھی بھارتی پنجابی ادیبوں کے اُس ڈیلی گیشن میں شامل تھا جو عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے لاہور گیا تھا۔ کانفرنس کی پہلی شام گیت سنگیت کا پروگرام سننے کے لئے ''الحمرہ'' ایڈیٹوریم میں بھارتی وفد کے ساتھ میں بھی بیٹھا تھا۔ وہاں ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری نے سٹیج پر دو پنجابی گیت گائے۔ جن میں سے ایک عظیم پنجابی شاعر موہن سنگھ ماہرؔ کا لکھا ہوا تھا۔ اس دلچسپ پروگرام میں پاکستان کے نامی گرامی

گلوکاروں نے بہترین نغمے پیش کئے۔ اُستاد حامد علی خان، اقبال باہو، شوکت علی، شفقت علی خان، حامد علی بیلا کے فرزند اور فیویژن گروپ نے اپنا اپنا کمال دکھایا۔ مشرقی پنجاب سے پمی بھائی اور اُس کے گروپ نے پنجابی لوک ناچوں کے مختلف اقسام کی جھلک پیش کی۔ دوسرے دن کانفرنس ہال میں منتظمین نے میرا تعارف ڈاکٹر اظہر محمود سے کرایا اور کچھ پلوں میں ہی اس کے خلوص، ملن سار طبیعت اور ہنس مکھ چہرے نے مجھے اُس کا گرویدہ بنا دیا۔ میں نے اُسے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ دیا۔ اُس نے میری کچھ کہانیاں پاکستانی میگزینوں میں پڑھی تھیں۔ وہ پنجابی ادب کا ایک سنجیدہ قاری تھا۔ اُس نے صوفیوں کے کلام کے علاوہ موہن سنگھ ماہر، امرتا پریتم، شوکمار بٹالوی، سُرجیت پاتر اور کئی دوسرے شاعروں اور ادیبوں کو پڑھا تھا۔ اُسے شاعروں کا کافی کلام زبانی یاد تھا۔ ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کھلے ذہن ودل کا مالک ہے اور زمین کے ساتھ جڑا ہوا ایک زندہ دِل انسان۔ وہ پیشے سے ڈاکٹر ہے اور Skin Specialist یعنی امراض جلد کا ماہر اور گجرات کے ضلع ہسپتال کا سپرنٹنڈنٹ۔ گجرات میں بھمبر روڈ پر اُس کا ایک بڑا کلینک ہے۔ کلینک کے بیس منٹ میں اُس نے گلوکاروں، ادیبوں اور شاعروں کے لئے خصوصی جگہ بنائی ہے۔ وہ بعد دوپہر چار بجے سے رات آٹھ بجے تک مریضوں کو دیکھتا ہے اور پھر آٹھ بجے سے رات گیارہ بجے تک روح کی خوراک حاصل کرنے کے لئے بیس منٹ میں آجاتا ہے جہاں ادیب، شاعر اور فنکار اُس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور علم وفن کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ سنگیت کار اور گائک سُر اور تال کی باریکیاں سمجھاتے ہیں دو سال بعد ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے پٹیالہ آیا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ دو دِن ہم ایک ساتھ رہے اور خوب گپ شپ ہوئی۔ دوستی کے مشروب پیئے گئے۔ ''وارث بھون'' پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ ادیبوں

اور فنکاروں کے لئے ایک تیرتھ ستھان ہے جہاں ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے آرٹسٹ آپس میں ملتے ہیں اور دُنیائے ادب کے معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ تیسرے دِن ظہرانے پر میں نے سُرجیت پاتر کو ڈاکٹر اظہر محمود سے ملایا۔ سُرجیت پاتر نے اپنا گیت ''کچ دا گلاس'' ترنم میں سنایا۔ ڈاکٹر اظہر محمود نے اُسے لکھ لیا۔ کانفرنس ختم ہونے پر میں پاکستانی مہمانوں کے ساتھ ہی امرتسر تک گیا اور پھر وہاں سے جموں چلا آیا لیکن ڈاکٹر چوہدری سے ٹیلیفوں اور چٹھیوں کے ذریعے میرا رابطہ بنا رہا۔ ایک دِن مجھے ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کا دلّی سے ٹیلیفون آیا۔ وہ وہاں سارک ہیلتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کل شام دِلّی سے امرتسر پہنچ رہا ہے اور وہاں گورونانک دیو یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے گا لہٰذا اُس نے مجھے بھی امرتسر بلایا تھا تا کہ ملاقات ہو سکے اور رات اکٹھی گزار سکیں۔ دوسرے دِن میں امرتسر یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ گرمجوشی سے ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔ اُس کے ساتھ نامور پاکستانی گائک اور سلطان باہوؔ کے کلام کو امر بنانے والا محمد اقبال بھی تھا جو حبیب بنک میں منیجر تھا لیکن سلطان باہُو کا کلام گانے کی وجہ سے اقبال باہُو کے نام سے مشہور ہوا۔ رات گیارہ بجے کے قریب اظہر محمود مجھے کہنے لگا کہ یونیورسٹی سے باہر چلتے ہیں اور کسی ڈھابے پر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ میں اُن دونوں کو لیکر تپلی گھر کے ایک ٹی سٹال پر لے گیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ ڈاکٹر اظہر محمود نے مجھے بتایا کہ اُس نے سُرجیت پاتر کے گیت ''کچ دا گلاس'' کی دُھن بنائی ہے اور گایا بھی ہے۔ میرے گیتوں کی نئی کیسٹ تیار ہے۔ ایک آدھ مہینے تک مارکٹ میں آجائے گی لیکن میرے لئے وہ اُس کیسٹ کی ڈمی لیکر آیا ہے۔ پھر اُس نے وہ گیت گانا شروع کیا۔ تھالی اُس نے پکڑ لی اور اقبال باہُو نے جگ۔ دونوں تھالی اور جگ بجانے لگے اور سُرجیت پاتر کا گیت اُبھرنے لگا۔

اج میرے کولوں کچ دا گلاس ٹٹیا

تے میری امنبٹری نے

میری امنبٹری نے دِتیاں نیں لکھّ جھِڑ کاں

تے میرے نیناں وچوں چھم چھم نیر پھٹیا

تے میرے نیناں وچوں

میری امنبٹر یئے، مینوں اک گل دس دے

لوکی دِل توڑ دیندے نیں تے کِداں ہس دے"

گیت کی دُھن غضب کی تھی اور اُس نے گایا بھی خوب تھا۔ ٹی سٹال پر لوگ اکٹھا ہونے شروع ہو گئے۔ پھر اُس نے پنجاب کا لوک گیت ''جگا'' گایا۔ میری فرمائش پر اقبال باہُو نے سلطان باہو کے کلام کا ایک ٹکڑا گایا پھر وارث شاہ کی ہیر کا ایک بند گا کر سنایا۔ بھیڑ بہت زیادہ ہو گئی تھی اور لوگ فرمائشیں کرتے جا رہے تھے۔ لیکن رات کے دو بج چکے تھے لہٰذا ہم واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے اور ساری رات باتیں کرنے میں گزاری۔ صبح نہا دھو کر ناشتہ کیا اور پھر میں اُن دونوں کو اپنی کار میں واہگہ بارڈر چھوڑ کر جموں چلا آیا۔ اقبال باہُو کوئی پیشہ ور گائک نہیں تھا اور نہ ہی ڈاکٹر اظہر محمود دونوں شوقیہ گاتے تھے۔ اقبال باہو نے حضرت سلطان باہُو کے علاوہ ''سیف الملوک میاں محمد بخش''، ''ہیر وارث شاہ'' شاہ حسین اور بُلھے شاہ کا کلام بھی گایا ہے اور اُردو غزلیں بھی۔ افسوس کہ کچھ مہینے پہلے پاکستان سے خبر آئی کہ اقبال باہُو فوت ہو گئے۔

اکتوبر 2011ء کو جب میں نے ایک رشتے دار کے بیٹے کی شادی میں حصہ لینے اور جشن فیض احمد فیض کے پروگرام کے سلسلے میں پاکستانی مہمانوں کو دعوت نامے دینے گیا تھا تو میں نے ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری کو گجرات فون کیا اور اپنی آمد کی اطلاع دی

اور اُسے بتایا کہ عید کے دوسرے دن وہ واپس جموں جارہا ہے۔تو اُسی روز شام چھ بجے وہ خالہ رضیہ کے گھر گلبرگ پہنچ گیا۔اُس نے میری خالہ، بھائی زاہد، اس کی بیگم سے ملاقات کی اور پھر مجھے لیکر لاہور کے مشہور ریسٹورنٹ، ''ولیج'' لے گیا۔اُس کا کزن (ماموں زاد) بھی اُس کے ساتھ تھا۔ وہاں خالص پنجابی پکوان پروسے گئے اور ہم رات بارہ بجے تک باتیں کرتے رہے۔ اُس کا بھائی بڑی رنگین طبیعت کا مالک تھااور لفظوں کا جادوگر۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ چھ سات گھنٹے کیسے بیت گئے اور پھر دیر رات وہ واپس گجرات چلا گیا جہاں عید اُس نے اپنے آبائی گاؤں میں اپنے والد کے ساتھ منائی تھی۔اس سے پہلے جب میں 2005ء میں گجرات اُس کو ملنے گیا تھا تو وہ تاریخی مقامات دکھانے لے گیا تھا جہاں پورس اور سکندر کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور چیلیاں کا وہ میدان بھی جہاں انگریزوں نے سکھ فوج کو شکست فاش دی تھی اور پورے پنجاب پر قبضہ کرلیا تھا۔ گجرات وہ جگہ ہے جہاں ہندو دھرم کے کئی گرنتھ لکھے گئے تھے۔ڈاکٹر اظہر محمود یاروں کا یار ہے۔کاش ہماری سرکاریں ویزا سسٹم میں نرمی کریں اور وہ میرے پاس جموں آئے اور مجھے خدمت کا موقع بخشے۔ یہاں یہ بات بتانی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ گجرات کے چودہ گاؤں جموں کی سرحد کے ساتھ ملتے ہیں اور دریائے چناب کا بیڈ مرالہ (گجرات) اکھنور سے چند کلومیٹر کی دوری پر ہے۔جب میں 2019ء میں بابا نانک امن کانفرنس کے لئے لاہور آیا تو ڈاکٹر اظہر محمود نے مجھے بتایا کہ اُس نے پنجابی ادب میں پی ایچ۔ڈی کی ہے۔مقالے کا عنوان تھا'' پنجابی الفاظ و اصطلاحات نگاری کا تقابلی جائزہ'' Contribution to Punjabi Lexicography with reference to H.A. Rose یہ تحقیقی مقالہ انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر عطش دُرانی کی نگرانی میں مکمل کیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان) سے پی، ایچ،

ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔اس سے پہلے اُس نے پنجابی میں ایم۔اے کیا تھا۔ایک میڈیکل سند یافتہ اور ایم۔ڈی کی ڈگری حاصل کر کے جلد کی بیماریوں کا معالج پنجابی میں پی ایچ۔ڈی کرے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر اظہر محمود چوہدری پنجابی زبان وثقافت کا عاشق ہے۔اللہ میرے دوست کو صحت مند زندگی عطا کرے۔

لکھ ہزار بہار حسن دی خاکو وچ سمانی
لا پریت محمدؔ جس تھیں جگ وچ رہے کہانی
(میاں محمد بخش)

چاہے حسن کی بہار لاکھ گنا ہو پھر بھی مٹی میں سمانی ہے
اس لئے ایسی پریت لگا محمد کہ دُنیا میں تمہاری کہانی زندہ رہے
(ترجمہ)

افضل ساحرؔ:

افضل ساحرؔ ذہن ودِل کا خوبصورت اور محبتیں بانٹنے والا پنجابی شاعر ہے۔اُسے پنجابی الفاظ کی تہذیب اور اُن کو استعمال کرنے کا فن آتا ہے۔اُس کی زبان خالص ''ماجھی'' (پنجابی کی تیسری بڑی ڈائیلٹ۔پہلی لہندی یا ملتانی، دوسری پوٹھواری، چوتھی دوآبی اور پانچویں ملوئی۔اس کے علاوہ ساٹھ Sub dialects ہیں) اور تخیّل بے مثال۔وہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں ایک جیسا مقبول پنجابی شاعر ہے۔اُستاد دامن اور بابا نجمی کی طرح اُس کے چاہنے والے پنجاب کے دونوں اطراف بے شمار ہیں۔دُنیا کے کونے کونے میں بسنے والے پنجابی اُس کے گیت سُن کر جھومتے ہیں۔اُس کے لکھے گیت کوک اسٹڈیو، پاکستان ٹیلی ویژن اور فلموں میں لئے گئے ہیں اُس کے گیت

راحت فتح علی خان، شفقت امانت علی، ساحر علی بگّا اور کئی دوسرے گلوکاروں نے گائے۔ ''شکرونڈاں'' گیت نے تو پورے پنجابی جگت میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ افضل ساحرؔ پنجابی شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ اُس کی نظمیں، گیت اور دوہے زندگی کی سچائی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اُس کی تخلیق کا اصل سرچشمہ اُس کی زندگی کا تجربہ ہے۔ اُس کے گیتوں میں کومل جذبے جہاں من مندر کی آرتی اُتارتے ہیں۔ وہاں گیتوں میں ندی کا نرمل سنگیت بھی بہتا نظر آتا ہے۔ اُس کی شاعری میں ٹھیٹھ پنجابی لفاظی اور دیہاتی بھاشائی لہجہ اُس کی پہچان ہے۔ ملک کی تقسیم کا درد اُس کی نظموں میں جا بجا ملتا ہے۔ میں نے اُس کی شاعری کی کتاب ''نال سجن دے رہیئے'' کو گورمکھی رسم الخط میں لکھ کر اپنے پبلشر چیتنا پرکاش لدھیانہ سے شائع کروایا۔ 2004ء میں ہماری ملاقات نے ہمیں دوستی کے مضبوط رشتے میں باندھ دیا۔ 2005ء میں جب میری پنجابی کہانیوں (شاہ مکھی رسم الخط میں) کی کتاب کی رسم رونمائی ہوئی تو اُس پروگرام کی نظامت افضل ساحرؔ نے ہی کی تھی۔ شام کو افضل ساحرؔ مجھے ایف۔ ایم 103 لاہور کے ریڈیو اسٹیشن لے گیا اور ''فوج میلہ'' پروگرام میں میرا ایک طویل انٹرویو لیا۔ انٹرویو ختم ہوتے ہی چائے منگوائی گئی۔ چائے کا دور ابھی چل ہی رہا تھا کہ ریکارڈنگ انجینئر میرے انٹرویو کی سی۔ ڈی بھی لے کے آ گیا۔ افضل ساحرؔ جہاں سب کا پسندیدہ شاعر ہے وہاں وہ ایک بہترین اینکر بھی ہے۔ مشاعروں میں نظامت کے فرائض بھی نبھاتا ہے اور پنجابی زبان کو سکولوں میں پرائمری سطح سے لاگو کرنے کی جدوجہد میں وہ ہراول دستے کا سالار بھی ہے۔ 2011ء میں اُس نے میرا ریڈیو لاہور کے لئے دوبارہ انٹرویو لیا۔ انٹرویو کے دوران ہی میں نے اپنا افسانہ ''اِک مرے بندے دی کہانی'' پڑھا تو افسانے پر تبصرے ٹیلیفون کے ذریعے آنے لگے۔ سننے والوں نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق افسانے کو سراہا بھی تھا اور منفی

رائے بھی دی تھی۔ میری ادبی زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ افسانہ پڑھتے ہی ریڈیو پر سامعین اپنی رائے سے نوازیں۔ یہ ایک خوش نما تجربہ تھا۔ اس انٹرویو کی سی۔ ڈی بھی میرے پاس ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے باغ جناح لاہور کے کلب میں لے گیا جہاں مشہور افسانہ نگار انتظار حسین کی صدارت میں محفل افسانہ کا انعقاد ہوا تھا۔ وہاں میں نے اُردو افسانہ ''ستی سر کا سورج'' پڑھا۔ اِس سے پہلے بھی مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں نے علی سردار جعفری اور خواجہ احمد عباس کی صدارت میں 1973ء اور 1978ء میں افسانے پڑھے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم دونوں سر گنگا رام چوک میں ''پنچم'' کے دفتر گئے۔ جہاں ماہنامہ ''پنچم'' کے مدیر مسعود ثاقب نے مجھے کئی کتابیں اور پنچم کے شمارے دیئے۔ جمیل احمد پال سے ملے جو'انٹرنیشنل سویر'' کا مدیر ہے دن کا کھانا میں نے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار (وارث، سمندر، جانگلوس وغیرہ) امجد اسلام امجد کے ساتھ کھایا جس میں ایوب خاور اور طاہر سرور میر نے بھی شمولیت فرمائی۔ اُن کو بھی امجدؔ صاحب نے دعوت دے رکھی تھی۔ اگلے دِن افضل ساحرؔ مجھے بین الاقوامی شہرت یافتہ کتھک کلاکار اور مشہور ہالی وڈ اور ٹالی وڈ ایکٹر اور اینکر ضیا محی الدین کی اہلیہ ناہید صدیقی کے گھر لے گیا جہاں ہم رات کے کھانے کی دعوت پر مدعو تھے۔ وہاں کراچی سے ایک ممتاز ستار نواز سے بھی ملے۔ جنہوں نے اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کیا۔ افضل ساحرؔ نے اپنی شاعری سے سب کو محظوظ کیا اور ناہید صدیقی نے ہمیں کتھک ڈانس کی باریکیاں سمجھائیں۔ ناہید صدیقی کا گھر فنون لطیفہ کا ایک چھوٹا موٹا میوزیم لگتا ہے۔ رات کے ایک بجے وہ محفل ختم ہوئی۔ افضل ساحرؔ ہندوستانی پنجاب کے شاعروں، ادیبوں اور کلاکاروں کو تلاش کر کے اپنے اسٹڈیو لاتا ہے اور انکا انٹرویو کرتا ہے۔ یہ اُس کا شوق بھی ہے اور روٹی روزی کا وسیلہ بھی۔ اہل لاہور اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہیں۔

ہندوستان سے آنے والے دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں کی مہمان نوازی کو وہ اپنی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ ایک بار افضل ساحؔر نے محترمہ رانو صاحبہ کو بتایا کہ جموں سے پنجابی ادیب خالد حسین آیا ہے تو اس نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت پر بُلا لیا اور کہا کہ اُس نے میری بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔ رانو صاحبہ کے سسر جموں کے محلے دلپتیاں سے ہجرت کر کے لاہور جا بسے تھے۔ اُن کا نام پروفیسر محمد اسحاق قریشی تھا جو پرنس آف ویل کالج میں پڑھاتے تھے۔ اُن کے بیٹے عثمان کے ساتھ محترمہ رانو صاحبہ کی شادی ہوئی ہے جن کا پورا نام انبساط رانو ہے۔ انبساط رانو کی خوش دامن صاحبہ پاکستانی انتظام والے کشمیر کے صدر کے۔ ایچ خورشید (خورشید حسن خورشید) کی سگی بہن تھیں جو صدر بننے سے پہلے قائداعظم محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے تھے۔ یعنی محمد اسحاق قریشی اُن کے سگے بہنوئی تھے۔ خورشید صاحب بھی کشمیر (آبی گزر، سرینگر) سے ہجرت کر کے 1947ء میں پاکستان چلے گئے تھے بلکہ شیخ صاحب نے ان کو زبردستی پاکستان بھجوا دیا تھا۔ جن دوست احباب کو انہوں نے اس موقع پر دعوت دی تھی اُن میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج جسٹس فواد حسن صاحب، ان کی اہلیہ اور تین بیٹیاں (جسٹس فواد حسن اور عثمان صاحب قریبی رشتے دار ہیں) اردو افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی صاحبزادی محترمہ نزہت صاحبہ اور عابدہ پروین صاحبہ کی شاگرد بھی حاضر تھی جس نے عابدہ پروین کے رنگ میں نغمے گائے۔ نُزہت صاحبہ نے ترنم میں حبیب جالب کی ایک غزل اور مشہور نظم ''ایسے دستور کو، صبح بے نور کو میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا'' سنائی۔ جسٹس فواد صاحب کی بیگم اور بیٹیوں نے وارث شاہ کی ہیر کو ایک نئے کلاسیکی رنگ میں پیش کیا۔ محترمہ رانو صاحبہ نے کشمیری پکوان خود بنائے تھے اور بڑے خلوص کے ساتھ مہمانوں کی خدمت میں پیش کئے۔ میں جب بھی لاہور جاتا ہوں

تو میری شامیں افضل ساحرؔ اور منیر ہوشیار پوریہ کے ساتھ گزرتی ہیں جو پنجابی ادب اور خاص کر صوفیوں اور گورو صاحبان کی بانی کا گیانی ہے اور گوروگرنتھ صاحب کے شلوک اور اُن کا مطلب فیس بک پر ڈالتا رہتا ہے۔ وہ ہندوستان سے آئے مہمانوں کی بہت خدمت کرتا ہے اور اُنھیں اپنی کار میں خوب گھماتا ہے۔ اُن کے ساتھ پورا پورا دن اور بعض اوقات شامیں بھی گزارتا ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ

''لاہور، لاہور ہی ہے۔'' اور ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔''

دل کی تختی پہ بھی آیات لکھی رہتی ہیں
وقت مل جائے تو اُن کی بھی تلاوت کرنا
(لیاقت جعفری)

بڑے آنگن کی ہیر......امرتا پریتم

یہ دنیا کہتی ہے کہ امرتا پریتم مرگئی...... 31/اکتوبر 2005ء کو۔ ہاں! وہی امرت کور جو گوجروانوالہ، (پاکستان) میں 3/اگست 1919ء کو پیدا ہوئی۔ جس نے آٹھ سال کی عمر میں پہلی نظم کہی۔ ہاں! وہی امرت کور، جس نے اپنے والد کرتار سنگھ ہتکاری سے شاعری کا پہلا سبق سیکھا اور ماں راج کور سے پنجابی کی گُڑتی (گُڑ یا شہد جو بچے کو پیدا ہوتے چٹایا جاتا ہے) لیکر پنجابی زبان کے ساتھ دُلار پایا۔ وہی امرت کور، جس نے سید وارث شاہ کو اپنا اُستاد اور بابا بُلھے شاہ کو اپنا مرشد مانا۔ جس نے سلطان باہوؒ، مادھولال حسینؒ، غلام فریدؒ، پیلو، ہاشم، قادر یار اور میاں محمد بخش کو اپنی روح کے ماہیوال بنایا اور جن کے صوفیانہ کلام کی چادر اُوڑھ کر اُس نے ''پنج ند'' میں ڈبکی لگائی۔ وہی امرت کور، جو لاہور میں جوان ہوئی۔ انارکلی بازار کے دُکاندار پریتم سنگھ سے بیاہی گئی اور امرتا پریتم بن گئی۔ پھر دِلّی کے 25/حوض خاص میں شہرت کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آسمان کو جاتی ہوئی آخری سیڑھی بھی چڑھ گئی اور اپنے ازلی گھر چلی گئی۔ اِمروز کو اکیلا چھوڑ کر..........کندلاں اور نوراج کو اپنی ساری پونجی سونپ کر..........اپنے بابل کے گھر..........اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ مرگئی۔ لیکن میں کیسے مانوں کہ امرتا پریتم انتقال کرگئی ہے۔ جس عورت نے ساری زندگی قلمی جہاد کیا ہو۔ عورت کے ساتھ ہورہی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے خلاف قلم اُٹھایا ہو، جو عورت کو سماجی، معاشی، ذہنی اور جذباتی طور پر آزاد دیکھنا چاہتی ہو۔ جس نے اپنی شاعری

سے پنجابیوں کا نام اونچا کیا ہو۔ جس نے سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کو کبھی تسلیم نہ کیا ہو، جس نے مردوں کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف بغاوت کی ہو۔ جس نے مذہبی اور سماجی ٹھیکیداروں کی منفی سوچ کے خلاف ساری عمر لکھا ہو۔ جس نے اپنی کہانیوں، ناولوں، سفرناموں اور سوانح حیات کے ذریعے صرف سچ کی آبیاری کی ہو، وہ بھلا کیسے مر سکتی ہے۔ مرا کوئی اور ہوگا۔ چتا کسی اور کی جلی ہوگی، کسی دوسری عورت کا شریر سڑا ہوگا لیکن امرتا پریتم کا جسم نہیں سڑ سکتا۔ وہ نہیں مر سکتی۔ اُس کے مرشد نے کہا تھا ؎

''بُلھے شاہ اساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہو''

(بلھے شاہ ہم مر نہیں سکتے، قبر میں کوئی دوسرا دفن ہے)

اور امرتا پریتم باغی بلھے شاہ کی باغی جانشین تھی۔ اس لئے وہ کیسے مر سکتی ہے۔ وہ وارث شاہ اور بلھے شاہ کی طرح زندہ ہے اور رہتی دُنیا تک زندہ رہے گی۔ اپنی شاعری میں، اپنے ناولوں اور افسانوں میں، اپنے سفرناموں میں اور اپنی ''رسیدی ٹکٹ'' میں۔

میری ''ٹھنڈی کانگڑی'' میں ادب کی آگ جلانے والی امرتا پریتم ہی تھی۔ جس نے میرا تعارف ادبی دُنیا سے کرایا پھر ''مائے نی میں کینوں آکھاں''، ''بھُکھی مجھ''، ''مہری''، ''گھاہ تے چلنا منع اے''، ''امرُود دا رُکھ''، ''بالن ہڈ بلن'' اور ''کِس توں آپ لُکائی دا'' کہانیاں اپنے ماہوار پنجابی جریدے ''ناگ منی'' میں چھاپ کر امرتا پریتم نے مجھے خالد حسین بنایا۔ اُس زمانے میں ''ناگ منی'' میں چھپنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ وہ ادیب اور شاعر راتوں رات مشہور ہو جاتا تھا جو ''ناگ منی'' میں چھپا ہو۔ ادبی دنیا میں اُسے عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ ''ناگ منی'' نئے لکھنے والوں کے لئے ایک پاٹھ شالا کا کام کرتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میری پہلی کہانی ''ناگ منی'' میں چھپنے کے بعد ایگریکلچر یونیورسٹی پنجاب کے شعبۂ پنجابی کے طلبہ اپنے سربراہ ڈاکٹر سریندر سنگھ دوسانجھ کے

ہمراہ وادی کی سیر کو جب آئے تھے تو اُنہوں نے ایک گوردوارے سے اعلان کروایا کہ وہ پنجابی افسانہ نگار خالد حسین سے ملنا چاہتے ہیں۔ پنجابی ساہت سبھا سرینگر والوں نے خالصہ ہوٹل امیرا کدل میں اس ملاقات کا اہتمام کیا۔ مجھے اُن لوگوں سے مل کر بہت اچھا لگا اور مجھے خوب سے خوب تر لکھنے کی ترغیب ملی۔ پھر وہ دِن بھی آیا جب میں نئی دہلی گیا اور 25/ حوض خاص کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ سیڑھیوں سے اُتر کر ایک شخص نے دروازہ کھولا اور پوچھا:

''آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کس سے ملنا ہے؟''

میں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں کشمیر سے امرتا پریتم جی سے ملنے آیا ہوں۔ اُس شخص نے مجھے اندر آنے کے لئے کہا اور ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل میں آگئے۔ اُس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا:

''آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ امرتا بلغاریہ سے آئے کچھ ادیبوں کے ساتھ گفتگو کررہی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا...... اور میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ہر تصویر فیضؔ احمد فیضؔ کے کسی شعر کی عکاسی کررہی تھی۔ آرٹسٹ نے شعر کی روح کو تصویر میں اُبھارا تھا۔ خاص کر مجھے اُس پینٹنگ نے بڑا متاثر کیا جس میں فیضؔ کے شعر ''گلوں میں رنگ بھرے بادِنو بہار چلے، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ رنگوں کا خوبصورت استعمال اور اُس میں اُبھرتا ہوا شعر کا مفہوم۔ تصویر سیدھی روح میں اُترتی گئی............ میں ڈرائنگ روم میں نفاست کے ساتھ رکھی دیگر اشیاء کو دیکھ رہا تھا کہ وہی شخص آیا اور مجھے امرتا جی کے کمرے میں لے گیا، بلغاریہ سے آئے ہوئے ادیب دوست باہر نکل رہے تھے ....میں نے امرتا دیدی کو جھک کر سلام کیا۔ اُس نے مجھے گلے سے لگایا اور کہنے لگی:

''سناؤ خالد! مجھے ملنے کی خواہش تمہارے اندر اب جاگی ہے۔تم تو اپنی کہانیوں کی طرح خوبصورت بھی ہو۔'' (یاد رہے کہ اُن دِنوں آتش جواں تھی) وہ شخص مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اور دیدی باتیں کرنے لگے۔ اُس نے مجھ سے میرے خاندان، میری گرہستی اور ادبی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ میں جواب دیتا رہا اور بیچ بیچ میں خود بھی کوئی سوال کرلیتا۔ اُس کی شاعری سے متعلق، نثر کے بارے میں اور خاص کر ''رسیدی ٹکٹ'' کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ جس کا اُن دِنوں بہت چرچا تھا اور کچھ دھرم کے ٹھیکیدار، کچھ ادیب اور کچھ سماج سدھار امرتا پریتم پر گندگی اُچھال رہے تھے، لیکن اِن سماجی اور دھارمک جنونیوں کی منفی سوچ کی کیپسٹن سگریٹ کے دھویں میں اُڑاتے ہوئے امرتا پریتم نے کہا تھا:

''خدا ان لوگوں کو سچ بولنے اور سچ لکھنے کی توفیق عطا کرے۔''

بات چیت چل رہی تھی کہ وہی شخص چائے کے تین کپ اور کچھ بسکٹ ایک ٹرے میں لے کر آیا اور ٹرے میز پر رکھ دی اور خود بھی ایک کرسی کھینچ کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ دیدی نے تعارف کرایا:

''خالد! یہ امروز ہے۔ میرا آئیڈیل''

میں کرسی سے اُٹھا اور امروز بھائی کو گلے لگایا اور معافی مانگتے ہوئے کہا:

''بھائی صاحب! مجھے معاف کرنا، میں نے غلطی سے آپ کو نوکر سمجھ لیا تھا۔''

''جو بھی پہلے پہل یہاں آتا ہے وہ اسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' امروز بھائی نے جواب دیا تھا۔

پھر میں امروز بھائی سے باتیں کرنے لگا۔ اُس کی بنائی ہوئی پینٹنگز کے بارے میں، نئی کتابوں کے لئے بنائے گئے سرورق ''ناگ منی'' جریدہ کے لئے بنائے جانے والے

خاکوں کے بارے میں اور مغربی پنجاب میں احمد سلیم کی طرف سے ''ناگ منی'' کے مواد کو گرمکھی سے شاہ مکھی کر کے ماہنامہ ''کُونج'' میں چھاپنے کے بارے میں۔ (''کونج'' میں میری بھی دو کہانیاں اُردو رسم الخط میں چھپی تھیں)۔ ہم نے چائے پی اور امروز بھائی خالی کپ لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے دیدی سے ''رسیدی ٹکٹ'' کے حوالے سے پوچھا:

''دیدی! اگر امروز تمہارا آئیڈیل ہے تو ساحرؔ لدھیانوی کیا تھا۔'' تو امرتا نے جواب دیا تھا: ''ساحرؔ میرا خواب تھا۔ امروز اُس خواب کی تعبیر ہے۔ میرا پورک (مکمل)'' امرتا پریتم نے سماجی بندھنوں کو کبھی نہیں مانا۔ اُس نے سماجی جبر، جہالت، مذہبی شدت، تعصب اور سامراجیت کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ مذہبی نفرت، طبقاتی نفرت سے کم نہیں ہوتی۔

جیسی دُنیا امرتا کو ملی تھی، ویسی دُنیا اُسے بالکل قبول نہیں تھی۔ اِسی لئے امرتا پریتم نے اپنی دُنیا خود تخلیق کی۔ امرتا پریتم ایک سچی شاعرہ تھی، ایک ادیبہ تھی، وہ سچ لکھنے اور سچ کہنے میں یقین رکھتی تھی۔ اُس نے سچ اور عشق کو کبھی نہیں چھپایا۔ امرتا نے اپنی شخصیت کے سچ اور بے باکی کو ''رسیدی ٹکٹ'' کے ذریعہ بیان کیا۔

امرتا پریتم نے جب آنکھ کھولی تب پنجابی ادبی دنیا کے اُفق پر اُستاد ہمدم، فیروز دین شرف، مولانا بخش کُشتہ، پروفیسر موہن سنگھ ماہر اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ایسے آفتاب چمک رہے تھے۔ امرتا نے اُسی ماحول میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اور ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنانے لگی۔ امرتا پریتم نے شاعری میں عشق و محبت کے جذبات کو اس طرح سے پیش کیا کہ اُس کی شاعری پنجابیوں کی پہچان بن گئی۔ وہ اپنی زمین کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک ندی تھی............نرمل، کومل۔ وہ ایک بہتا دریا تھی، ایک گہرا سمندر، ایک عورت، ایک آواز

............پنجاب کی آواز۔ امرتا کی نظموں میں سچائی اور گہرائی تھی۔ عورت کے جذبات کی عکاسی تھی۔

وے میں ترڑ کے گھڑے دا پانی (وہ گھڑا جس میں دراڑ آئی ہو)

کل تک نہیں رہنا/ اُو میرے ٹھنڈے گھُٹ دِیا ہِترا (گھُٹ: گھونٹ)

کہہ دے جو کچھ کہنا/ دیکھ کے تیری تریہہ ورگی اِس پانی دی مجبوری (تریہہ: پیاس، ورگی: جیسی)

نہ اِس تیری تریہہ سنگ ٹُرنا (ٹُرنا: چلنا)

نہ اِس ایتھے بہنا/ وے میں ترڑ کے گھڑے دا پانی/ کل تک نہیں رہنا۔

تقسیم سے پہلے لاہور ریڈیو نے امرتا کو ادبی شناخت بخشی اور وہ پنجابی ادبی حلقوں میں ایک شاعرہ کے طور پر مشہور ہو گئی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ دہلی میں آ کر بس گئی۔ پریتم سنگھ نے انارکلی بازار والی دُکان کا سودا چاندنی چوک کی دُکان میں بیچنا شروع کر دیا اور امرتا لاہور ریڈیو کو چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسکرپٹ رائٹر اور اناؤنسر بن گئی۔ میاں بیوی کے مزاج ملتے نہ تھے۔ دونوں میں ذہنی ملاپ کبھی بھی نہ ہو سکا۔ پریتم سنگھ کبھی بھی امرتا کے دِل اور روح میں اُتر نہیں سکا۔ دونوں ندی کے دو کناروں کی طرح رہے جو کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ دونوں کی سوچ میں تضاد رہا اور پھر دونوں نے الگ الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر پریتم زندگی بھر اُس کے نام کے ساتھ جُڑا رہا۔ وہاں نہ تو ساحر جُڑ سکا اور نہ ہی اِمروز۔ دہلی میں رہ کر بھی امرتا نے مغربی پنجاب کی نمائندگی کی۔ نظم، افسانہ، ناول غرض نظم و نثر میں ماجھے (ماجھی: پنجابی زبان کی پانچ ڈائیلیکٹس میں سے ایک جو لاہور، امرتسر، سیالکوٹ اور گورداسپور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے) کی لوک بھاشا اور صوفیانہ شیلی کو استعمال کیا۔

برصغیر ہند کی تقسیم نے سب سے زیادہ نقصان پنجاب کا کیا۔ اس تقسیم نے پنجابی کلچر اور ورثہ کی اکائی کو توڑ کر رکھ دیا۔ ہندو اور مسلم سیاست نے پنجاب کو برباد کر دیا۔ پنجاب کی دھرتی انسانی خون سے لال ہوگئی۔

تقسیم کے بعد رفیوجیوں اور شرنارتھیوں نے اپنے اپنے نام مکان، زمینیں اور دُکانیں الاٹ کروائیں۔ لیکن امرتا پریتم نے اپنے نام صرف پنجاب کی تقسیم کا درد الاٹ کروایا .... اور وہ درد اُس کے اندر سے تب پھوٹ کر باہر نکلا جب وہ ریل گاڑی میں دہلی سے دہرہ دون جا رہی تھی۔ ایک نظم کا جنم ہوا۔ ایک لافانی نظم کا، جس کو سب سے پہلے اردو کے مشہور شاعر اور نغمہ نگار سیف الدین سیف نے اپنی کامیاب اور شہرۂ آفاق پاکستانی پنجابی فلم ''کرتار سنگھ'' میں استعمال کیا۔ اس نظم کو خوشونت سنگھ کی مشہور کہانی ''ٹرین ٹو پاکستان'' پر بنائی گئی فلم میں بھی پیش کیا گیا اور امرتا پریتم کے ناول ''پنجر'' پر بنائی گئی فلم میں بھی۔

آدھی صدی گذرنے کے باوجود بھی یہ نظم پنجابیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے ہتھوڑے کا کام دیتی ہے۔ اس نظم نے امرتا پریتم کو شہرت کی بلندیوں پر جا کھڑا کر دیا۔ یہ نظم اُس کی پہچان بن گئی .... تقسیم کی ہولنا کیوں پر ایک اور مشہور نظم بھی لکھی گئی۔ جس کا عنوان تھا ''ترنجن'' (ترنجن: گاؤں کی چوپال یا وہ جگہ جہاں عورتیں بیٹھ کر چرخہ کاتیں اور گپ بازی کریں) ''ترنجن'' احمد راہی کی تخلیق تھی جو اُس نے امرتا پریتم کے نام منسوب کی تھی۔ احمد راہی امرتسر کا رہنے والا تھا اور تقسیم کے بعد لاہور میں آباد ہوگیا اور روزی روٹی کمانے کے لئے فلموں کے گیت اور منظر نامے لکھنے لگا .... اور امرتا لاہور کی رہنے والی تھی جو دہلی میں آباد ہوگئی۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقسیم کا درد سارے پنجابیوں کا مشترکہ درد ہے۔ چاہے وہ مغربی پنجاب میں رہتے ہوں یا مشرقی پنجاب میں۔ آزاد بھارت اور آزاد پاکستان کی سرکاروں نے زمین کی حد بندی کر کے پنجاب کے سینے میں

خاردار تار گھونپ دی اور پنجابیوں کے دلوں کو لہُو لہان کر دیا۔ آج بھی یہ زخم پنجابیوں کے دِلوں میں تازہ ہیں۔

امرتا پریتم نئے لکھنے والوں کے لئے ایک آئیڈیل بن گئی تھی۔ وہ ساری زندگی روایت سے ٹکراتی رہی۔ اُس کی نظموں میں نیا احساس اور نئی Sensibility تھی۔ امرتا پریتم بنیادی طور پر شاعرہ تھی، لیکن وہ اپنے افسانوں، ناولوں، سفرناموں، انٹرویوز اور ''آپ بیتی'' کے حوالے سے بھی یاد کی جاتی رہے گی۔ شاعری کے بارے میں امرتا نے کہا تھا:

> ''شاعری کے لئے ایک خاص موسم ہوتا ہے، جو شاعر کے دِل پہ آتا ہے۔ اگر یہ موسم من کے اندر اُترے تو شعر ہوتا ہے ورنہ شاعری صرف قافیہ، ردیف، اور تک بندی ہوتی ہے۔ شاعری کے لئے کرافٹ کے ساتھ ساتھ خیال اور تخئیل کا ہونا بھی لازمی ہے۔''

امرتا پریتم انسانی آزادی کی زبردست حامی تھی۔ جب روسی افواج چیکوسلوالیہ میں داخل ہوئیں تھیں تو امرتا بہت دُکھی ہوئی تھی۔ اُس وقت پراگ شہر کے لوگوں نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لئے اپنے گھروں کے نمبر مٹا دیئے تھے۔ گلیوں اور سڑکوں کے نام اور نشان ختم کر دیئے تھے۔ اُس وقت امرتا نے ایک نظم لکھی تھی ۔

/ آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مٹا دیا ہے/ گلی کا نام اور سڑک کا نشان بھی ختم کر دیا ہے / اب اگر تم مجھے ڈھونڈنا چاہو/ تو دروازے کھٹکھٹاتے رہو/ ہر گلی، ہر شہر، ہر ملک میں جاؤ/ جہاں کہیں تمہیں کوئی آزاد روح مل جائے/ سمجھنا وہی میرا گھر ہے''

اُس کی نظموں کے ترجمے پڑھ کر ویتنام جنگ کے ہیرو ہُوچی مِین نے امرتا کا ماتھا چوم کر کہا تھا:

''تمہارا قلم میری بندوق جیسا ہے۔''

اور امرتا نے کہا تھا:

''آزادی نہ مانگی جاسکتی ہے، نہ چھینی جاسکتی ہے اور نہ جسم پر اوڑھی جاسکتی ہے۔ آزادی تو وجود کی مٹی سے اُگتی ہے۔''

امرتا پریتم کی زندگی کی ترجمانی رگ وید کا یہ شلوک بھی کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے ''صبح کی روشنی جب سورج کے ساتھ ملے تو اُس کی آنکھوں میں گیان (علم) کا کاجل ہو۔ ہاتھوں میں محبوب کو سوغات دینے کے لئے وید منتر ہوں۔ آزادی اُس کی سیج ہو اور دُنیا کے عالم اُس کے مرشد ہوں۔''

امرتا پریتم کی لگ بھگ 90 کتابیں چھپی ہیں۔ اُس نے پنجابی کے علاوہ ہندی میں بھی شاعری کی، ناول اور افسانے لکھے اور اردو میں کالم بھی لکھے۔ اُس کی تخلیقات کا ترجمہ ملکی اور غیر ملکی کئی زبانوں میں ہوا۔ اُسے بے شمار ملکی اور غیر ملکی انعامات سے نوازا گیا۔ دیش بدیش کی کئی یونیورسٹیوں نے اُسے ڈی لِٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کیں۔ اسے خوب عزت واحترام ملا۔ 1956ء میں شعری مجموعہ ''سنیہڑے'' پر اُسے ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ 1969ء میں اُسے پدم شری ملا۔ 1982ء میں اُسے بھارتی گیان پیٹھ پُرسکار ملا۔ 1986ء میں اُسے راجیہ سبھا کے لئے نامزد کیا گیا۔ کامیابیوں کی ایک لمبی فہرست کے باوجود امرتا میں کوئی غرور، گھمنڈ، ناز نخرا، اَنا، خود پرستی یا خود نمائی نہیں تھی۔ گفتگو میں نرمی اُس کی خوبی تھی۔ پیار اور خلوص تو اس کی ہڈیوں میں رچا تھا۔ وہ سراپا محبت اور شفقت کی مورت تھی۔

میں 1979ء میں دوبارہ نئی دہلی گیا، پاکستان جانے کے لئے ویزا لینے۔ پاکستانی ہائی کمیشن کے سامنے لمبی لائن دیکھ کر میں گھبرا گیا اور سیدھا امرتا دیدی سے ملنے حوض خاص چلا گیا۔ باتوں باتوں میں جب میں نے بتایا کہ میں پاکستان جانے کے لئے ویزا لینے آیا

تھا لیکن لمبی قطار دیکھ کر ڈر گیا اور تمہارے پاس آ گیا تو دیدی نے پاکستان ہائی کمیشن میں کسی منیر احمد شیخ صاحب کو فون کیا اور میرے بارے میں ذکر کیا۔ فون بند کرنے کے بعد دیدی نے مجھے شیخ صاحب سے ملنے کے لئے کہا اور بتایا کہ منیر احمد شیخ پنجابی کا ایک عمدہ شاعر ہے اور ''ناگ منی'' میں اس کی نظمیں چھپ چکی ہیں۔ میں دوبارہ پاکستان ہائی کمیشن گیا اور مین گیٹ پر شیخ صاحب کے نام چٹ بھیجی۔ کچھ ہی دیر میں منیر احمد شیخ صاحب خود گیٹ پر آئے .... مجھے گلے لگایا اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ وہ پاکستانی ایمبیسی میں فسٹ کلچرل سیکریٹری تھے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی اُنہوں نے چائے منگوائی اور اپنی پنجابی اور اردو نظمیں اور غزلیں سنانا شروع کر دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے ویزا افسر کو بلایا اور میرا پاسپورٹ اور ویزا فارم ان کو دیتے ہوئے کہا کہ کارروائی ذرا جلدی کریں۔ واپسی پر میں نے دیدی کو ساری تفصیل بتائی تو وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی:

''وہ شاعر ہی کیا جو اپنی شاعری نہ سنائے۔''

میں اُن دِنوں لداخ میں کچھ دن گذار کر آیا تھا۔ میں دیدی کو لداخ کے بارے میں جانکاری دینے لگا۔ وہاں کے موسم کے بارے میں، ننگے پہاڑوں، رتیلے میدانوں، پھلوں اور فصلوں، بدھ گمپا، یاک، دریائے سندھ اور وہاں کے لوگوں کے رسم و رواج کے بارے میں بتانے لگا۔ دیدی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ پھر اچانک وہ کہنے لگی ''خالد! کیوں نہ تیرا انٹرویو کیا جائے۔ جس میں تم لداخی جیون کے بارے میں بھی بتاؤ گے۔'' .... اور پھر دیدی بستر میں لحاف اوڑھے بیٹھ گئی اور قلم، کاغذ پر چلنا شروع ہو گیا۔ میری ذاتی زندگی کے بارے میں سوال و جواب ہوئے۔ ادبی باتیں ہوئیں۔ میرے افسانوں کا تذکرہ ہوا۔ لداخ اور لداخی زندگی سے متعلق تفصیل سے گفتگو ہوئی، انٹرویو بہت اچھا بن گیا اور اکتوبر 1980ء میں ''سوریہ انڈیا'' کے ہندی ایڈیشن کے علاوہ پنجابی میں ''ناگ منی'' میں چھپا۔

امرتا پریتم ایسی مہمان ہستی میرے ایسے نئے لکھنے والے کا انٹرویو لے یہ میری حوصلہ افزائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اصل میں بڑا ادیب اور شاعر وہ ہے جو احساسِ برتری کا شکار نہ ہو۔ اُس میں کسی قسم کی اَنا نہ ہو اور اس زاویے سے امرتا خوب گُن وان بھی تھی اور دھن وان بھی۔

سماج کا ہاضمہ اُس کی ذاتی زندگی کو لے کر ہمیشہ خراب ہی رہا لیکن اُس نے سماج کی کبھی پرواہ نہیں کی اور زندگی کو اپنے ڈھنگ سے گذارا۔ اپنے دل کی مانی اور اپنی روح کو سکون بخشا۔ اُس نے عشق کئے تو کھل کر اعتراف بھی کیا۔ وہ کہتی ہے:

''عشق ہر انسان کسی نہ کسی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ ایک سچائی ہے۔ اس کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ عشق سے ہی انسان کی تکمیل ہوتی ہے لیکن مرد اپنے عشق کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے جبکہ عورت عشق کو چھپاتی ہے۔ مرد پیار کو چوراہے میں رکھ کر لوگوں کو دِکھا دِکھا کر خوش ہوتا ہے لیکن عورت پیار کو اپنے پلو میں باندھ کر رکھتی ہے اور جب کوئی نہیں ہوتا تو پلو کھول کر اُس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ سچا عشق درد دیتا ہے اور سچی دوستی سکون دیتی ہے۔''

اور سکون امرتا کو امروز کی بانہوں میں ملا۔ اُس کے پیار میں، اُس کی دوستی میں، امرتا پریتم نے بڑی لمبی بیماری دیکھی، بہت تکلیف سہی لیکن امروز بھائی نے جس سچے من سے، جس لگن اور محبت سے اُس کی تیمارداری کی، اُس سے امرتا کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ امروز اس کا ''پُورک'' ہے۔

جو دیکھ بھال، جو خدمت، جو سیوا، جو تیمارداری امروز بھائی نے امرتا کی کی، وہ نہ تو کندلاں کر سکتی تھی اور نہ نوراج، وہ خدمت نہ تو ساحرؔ کر سکتا تھا اور نہ ہی پریتم سنگھ۔ یہ حق صرف امروز ہی ادا کر سکتا تھا اور اُس نے خوب ادا کیا۔ جسے زمانے نے دیکھا اور سراہا۔

میں اپنا یہ مضمون امرتا پریتم کی اُس لافانی اور شہرۂ آفاق نظم کے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں جو اس کی شہرت کی وجہ بنی اور جس نے امرت کور کو امرتا پریتم بنایا۔

اج اکھاں وارث شاہ نُوں رِکتوں قبراں وِچوں بول

تے اج کتابِ عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول

(آج میں وارث شاہ سے کہہ رہی ہوں کہ وہ قبر سے باہر آکر بولے......اور آج کتاب عشق کا اگلا ورقہ کھولے)

اِک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لِکھ لِکھ مارے وین

اج لکھاں دِھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نُوں کیہن

(ایک بیٹی پنجاب کی روئی تھی تو تم نے لِکھ لِکھ کر بین کئے آج لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں اور وارث شاہ تمہیں پکار رہی ہیں)

وے دردمنداں دیا دردّیا، اُٹھ تک اپنا پنجاب

اج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب

(اے دردمندوں کے مسیحا، اُٹھ اور اپنا پنجاب دیکھ۔ آج ہر سُو لاشیں بکھری پڑی ہیں اور چناب دریا خون سے لال ہو گیا ہے)

یہ شاہکار نظم لکھنے والی امرتا پریتم کبھی نہیں مر سکتی۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گی کیونکہ اُس کے مرشد بُلھے شاہ نے کہا تھا:

"بُلھے شاہ اساں مرنا ناہیں / گور پیا کوئی ہور"

(بُلھے شاہ ہم مر نہیں سکتے، قبر میں کوئی دوسرا دفن ہے۔)

☆ ☆ ☆

MAIN ZINDA AADMI HOON

خالد حسین کی آپ بیتی کا پہلا باب ہی ایک سنسنی خیز خبر سے شروع ہوتا ہے کہ مشہور ادیب، افسانہ نگار، پتر کار اور یاروں کا یار خالد حسین، جس نے اپنے افسانوں کے ذریعے برصغیر میں ایک منفرد شناخت بنائی ہے وہ کل شام فوت ہوگیا۔ جس خودنوشت کا آغاز ہی اِس کے Subject یا ہیرو کی وفات سے ہو، وہ اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ بیانیہ انتہائی دلچسپ ہے۔ اس سے مجھے اِس خودنوشت کو پڑھنے کی تحریک ملی۔ یہ آپ بیتی پڑھنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ خودنوشت کے سبھی ابواب خالد حسین نے راویوں کے ذریعے بیان کئے ہیں۔ اس نئے اسلوب اور بیانیے کو پڑھتے ہوئے مجھے رولاں بارتھ (Roland Barthes) کی خودنوشت یاد آگئی جس میں واحد متکلم کی جگہ وہ، اُس یا اُن، جیسے راویوں کے ذریعہ بیانیہ تخلیق کیا گیا تھا، جبکہ خالد حسین نے ''میں'' کے بدلے اپنی بات رشتے داروں، دوستوں، ہم عصر ادیبوں اور ساتھی ملازموں کی زبان سے بیان کی ہے۔ میری یادداشت کے مطابق آپ بیتی کا یہ بیانیہ بالکل نیا ہے۔ اِس خودنوشت میں جموں وکشمیر کی تاریخ، سیاست، مذہب، معاشرت، سیاحت اور ادبی معاملات کے ہر پہلو کو بڑی گہرائی اور باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے اَن کہے اسالیب کے ذریعے narrator نے زندگی کا ایماندارانہ اور متوازن اظہار کیا ہے۔ یہ دلچسپ خودنوشت قاری کو یقیناً متاثر کرے گی۔ مجھے اِس کا یقین ہے۔

منموہن (ڈاکٹر)

دواریکا، نئی دہلی

QASMI KUTUB KHANA

E-92, Abul Fazal Enclave, Okhla New Delhi-110025
Talab Khatikan, Jama Masjid, Jammu Tawi-180001
Ph. +91-9797352280 | +91-1913593736
G-Mail:- qasmikutubkhana0729@gmail.com
Email:- info@qasmitutubkhana.store
website:- qasmitutubkhana.store

₹ 495/-